

ٹائٹل: سلطان سبحانی
شعر کا چہرہ

گھٹے اگر تو بس اِک مشت خاک ہے اِنساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے ـــــــــ (جگرؔ مرادآبادی)

ماہنامہ

ہم زبان

۵

مالیگاؤں

ایڈیٹر :- سلطان سبحانی

جلد ۲ شمارہ ۵ ● مئی، جون، جولائی ۱۹۷۸ء ● تاریخ اشاعت ۶ جولائی ۱۹۷۸ء ● کتابت : اکبر رزا
طباعت : سردار پریس مالیگاؤں ● قیمت دو روپے پچاس پیسے ● زرِ سالانہ بیس روپیے ● پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر سلطان سبحانی
● مینیجر : شاہ نواب ● خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ ہم زبان نشاط بک سینٹر، قدوائی روڈ، مالیگاؤں ۴۲۲۳۰۳

اِمتزاج

اِختلاف

آج کل ہم ایسے افسانوں میں گھرے ہوئے ہیں جو کہانیت سے خالی ہیں ۔ کہانیت افسانہ کی روح ہی نہیں بلکہ اس کے ایمان کا سب سے بڑا حصّہ بھی ہے ۔ اس کے بغیر نہ تو کوئی افسانہ مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی شاہکار قرار پاکر ابدیت حاصل کر سکتا ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ افسانہ وقت اور حالات کے ساتھ خود بھی بدل جاتا ہے لیکن اس کے کچھ فنی تقاضے بھی ہیں جنہیں غیر ضروری قرار دے کر افسانہ کی روایت باقی نہیں رکھی جا سکتی ۔ افسانہ میں کردار نگاری بہت پہلے ماردی گئی ہے ۔ اب تجربہ کا رُخ اس کی کہانیت کی طرف ہے لیکن کہانیت ختم ہونے کے بعد افسانہ میں معنویت، تہ داری اور تاثر کی تلاش بے سود ثابت ہوگی کیوں کہ معنویت، تہ داری اور تاثر افسانویت کے طلسم، اسرار، رمز، بے خودی، دلچسپی اور اُتار چڑھاؤ سے اُبھرتے ہیں ۔

افسانہ تجرید یا علامت کا محتاج نہیں ہے ۔ یہ تو اسلوب، طرزِ ادا اور فکری پرواز کے نشانات ہیں اور یہ کسی بھی طرح، افسانہ کا جسم نہیں سمجھے جا سکتے ۔ تجرید یا علامت غیر ضروری بھی نہیں لیکن تہ داری اور معنویت ان کے بغیر بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور بڑی فنکاری اسی کو کہتے ہیں ۔ پیچیدگی سے معنویت پیدا نہیں بلکہ ختم ہوتی ہے اور اس سے پہلے کہانی کا فطری بہاؤ ختم ہو جاتا ہے ۔ افسانہ کھردرا ہونے کے باوجود حساس اور ریشم کی طرح ملائم ہے ۔ وہ پتھراؤ برداشت نہیں کرتا اور نہ ہی فنکار کے اشاروں پر چلتا ہے (کیوں کہ وہ نثری نظم نہیں ہے) کہانیت کی جگہ اس میں علامت، تجرید، پیچیدگی یا کچھ بھی بھر دیا جائے اس میں وہ روح پیدا نہیں ہوگی جو اس کا فطری حق ہے ۔ غزل سے اگر اس کا لہجہ کاٹ دیا جائے تو وہ نظم کی لونڈی معلوم ہوگی یہی بات کہانیت کی بھی ہے ۔ روایت شکنی کوئی بُرا عمل نہیں ہے ۔ کوئی بڑا اسکا زمانہ بھی نہیں ۔ زندگی کے کیلئے جدید جدید تجربہ اور تازگی ضروری ہے ۔ افسانہ کے کسی بھی پہلو پر ہاتھ مارا جائے، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا اور نہ ہی اس کی خوش مزاجی میں کوئی فرق آئیگا لیکن اس کی وہ روح جو صدیوں سے باقی ہے اسے نہ چھیڑا جائے ورنہ قاری کا سے اس کا ازلی رشتہ ختم ہو جائے گا اور افسانہ کی جگہ صرف علامت اور تجرید باقی رہ جائے گی ۔ ابھی ابھی ہم نے وہ "قلاشی" بھی دیکھی ہے جب بے معنویت بھی زبردست تجربہ کی حد میں داخل ہو گئی تھی اور اسے فنکاری کہا جا رہا تھا ۔ وہ فنکاری کتنے لمحے چلی ؟

یہ بھی صحیح ہے کہ افسانہ نگاری اور فوٹوگرافی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن روائتی اور بیانیہ افسانے فوٹوگرافی تو نہیں ۔
اگر کسی افسانہ میں علامت یا تجرید کا دھندلا سا عکس بھی نہیں تو کیا اسے فوٹوگرافی کہا جائے گا جبکہ اس افسانہ میں معنویت اور تہ داری موجود ہے ۔ دراصل علامت نگاری کا رجحان ہر شے کو بہتر پردوں میں چھپا کر ٹٹولنے اور محسوس کرنے کا عادی ہو چکا ہے ۔ جو چیز سامنے سے نظر آجائے وہ صحیح نہیں ہے ۔ اسے سمجھنے کے لئے بہت دور جا کر رنگ برنگی عینکوں کا سہارا لینا شرط ہے اور عینک میں جو بھی دھبہ اُبھرے وہی اس کی اصل شبیہہ ہے ۔ یہ ہے وہ گہرائی اور گیرائی جو آج کے افسانہ میں در آئی ہے اور اس کی قسمت کا ستارہ بن کر چمک اُٹھی ہے ۔

کہانی کے فطری بہاؤ کے بارے میں بھی گمراہ کن رویّہ کی تبلیغ کی گئی ہے ۔ کہانی اگر مرکزی خیال سے بے نیاز ہو کر چلے تو وہ اس کا ٹیڑھ پن اور لفاظی ہے ۔ ایک ہوشمند فنکار کے نزدیک ہر لفظ نہایت قیمتی ہوتا ہے اور وہ اسے اہم سمجھ کر بقدرِ کفایت استعمال کرتا ہے ۔ جو بات افسانہ کے دائرہ اختیار اور حدود سے باہر ہے وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتا کیوں کہ وہ کہانی کا سرا گم کرنا نہیں چاہتا ۔ اگر سرا گم ہو گیا تو کہانی بھی کھو جائے گی ۔ آج کی کہانی چوں کہ انتشارِ ذات کی تصویر ہے اور کسی تہذیب سے وابستہ نہیں ہے اس لئے اس کا سفر اپنی ڈگر سے ہٹ کر دائیں بائیں رواں رہتا ہے تاکہ زیادہ مناظر سمٹ سکیں لیکن افسانہ نگاری کوئی فوٹوگرافی تو نہیں ۔

ویسے انتشار اور بے ربطی کے اظہار کے لئے ضروری نہیں کہ کہانی کو ہی بھٹکا دیا جائے ۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب ہم کسی سے ملنے جاتے ہیں تو راستے میں ہم صرف اُس شخص کے بارے میں نہیں سوچتے ۔ ہمارے ذہن میں مختلف خیالات ہو یدا رہتے ہیں لیکن ہم غفلت کے عالم میں بھی اسی راستے پر چلتے ہیں جو سیدھا اُس کے گھر کو جاتا ہے ۔ اس سے ملنے کے لئے ہم اس کی مخالف سمت قدم نہیں اُٹھاتے اور نہ ہی ہزار گلیوں میں گھوم کر اس تک پہنچتے ہیں ۔ اگر کہانی چھوڑ کر جیب کے اس کے ذہن کی تلاشی لی جائے تو کوئی سی معرکہ آرائی ہوگی ۔ کہانی واقعات اور کرداروں کو اپنی مٹھی میں رکھتی ہے ۔ تب ہی وہ قائم ہے ورنہ ڈھسل ڈھسل جائے گی ۔

ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ روایتی افسانے لکھے جائیں ۔ روایتی افسانہ کا دور تو ترقی پسند افسانہ نے بہت پہلے ختم کر دیا ۔ اب نئی روایت کی ضرورت ہے جس کے لئے ابھی کوئی راہ نہیں نکلی ۔ کچھ افسانہ نگاروں نے انفرادیت حاصل کرنے اور توجہ کا مرکز بننے کے لئے افسانہ کی بہت ساری ہڈیاں چکنا چور کر دیں اور اس طرح اپنا نام بنا لیا ہے لیکن یہ نئے یا جدید افسانہ کی پرخلوص تعمیر یا دریافت نہیں ہے ۔ نیا افسانہ انہیں تمام افسانہ نگاروں کے بیچ میں کہیں چھپا بیٹھا ہے اور وہ باہر تب ہی آئے گا جب افسانہ نگار سر جوڑ کر بیٹھیں گے ۔ تجربوں کو اولیت اپنے کمال کو روکا کس نے ہے ۔ نئے افسانہ کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ یہاں تک کہ پچھلے دور کو ناقص بھی قرار دیا گیا اور تجرباتی افسانوں کو ہی حاصل سمجھ لیا گیا ۔ مگر کیا اس طرح افسانہ آگے بڑھے گا ۔ افسانہ خواہ تجریدی ہو، علامتی ہو یا نیا ہو ۔ اسے پڑھنے والوں کیلئے لکھا جاتا ہے کیونکہ وہ لکھنے والوں کے درمیان نہیں بلکہ پڑھنے والوں کے درمیان زندہ رہتا ہے ۔

فضا ابن فیضی

مئو ناتھ بھنجن — یو پی

کیا خبر نظر ان کی، جا کے ٹھہر جاتی ہے کسی بلیغ نکتے پر
محفلوں کے دانش ور، چونک چونک اٹھتے ہیں میرے سادہ فقرے پر

ذوقِ مصلحت مبنی ان کی ہر شریعت کا، مطمحِ نظر ٹھہرا
وقت کے یہ پیغمبر، طنز بن گئے آخر، اپنے ہی صحیفے پر

پھر نہ اس اندھیرے میں، راہرو معانی کے، راستے بھٹک جائیں
اے قمر جبیں لفظو! کوئی شمع تو رکھ دو، ذہن کے دریچے پر

سامنے مسائل کے کتنے محشرستاں ہیں، رت ابھی کہاں بدلی
پھول سا بدن لیکر، لوگ اب بھی رہتے ہیں، آگ کے جزیرے پر

تو نے ذہن تو بخشا، کھول دے خدا مجھ پر، سوچنے کی راہیں بھی
کتنا بوجھ ہے یارب! مسلکِ طریقت کا، ناتواں عقیدے پر

بند رہ کے خوابوں میں کب تلک حقائق سے، ہم چرائینگے آنکھیں
آئینہ بتا دے گا، کس قدر خراشیں ہیں، تیرے میرے چہرے پر

ہاتھ میں سیاست کے، تیشہ دیدیا کس نے، کوہکن پشیماں ہیں
یہ کمال تو دیکھو! توڑتے ہیں ہم پتھر، رکھ کے آبگینے پر

موجۂ و تلاطم کے، چکروں میں کیا پڑتے، ہم تو وہ شناور ہیں
جو عبور کرتے ہیں، ریت کے سمندر کو، بیٹھ کر سفینے پر

جو بلند منصب ہیں، شہرت و بصیرت تو، صرف ان کا ورثہ ہے
ہم زمیں پہ رہ کر، پاؤں کس طرح رکھتے، آسماں کے زینے پر

مجھ سے اب کوئی پوچھے، جاں نواز ہے کتنا، لمس ریشمیں ان کا
پھول پھول ہاتھوں نے، رکھ دیا ہے مرہم سا، زخم زخم سینے پر

حرمت الاکرام

رام باغ، مرزاپور (یو۔پی)

نہ فسانہ نہ کبھی مرثیہ جی کا لکھا
فلسفہ وقت کی آشفتہ سری کا لکھا
بادلو! جاؤ کسی اور طرف مڑ جاؤ
ریت پر سارا فسانہ ہے ندی کا لکھا
دل نے تاریخ لکھی تشنہ کامی کی
تذکرہ ہونٹوں نے اک جام تہی کا لکھا
اپنی عظمت کا بھی اقرار کیا مشکل سے
دل کے بندوں نے قصیدہ نہ کسی کا لکھا
آئینہ دیکھا تو اپنے کو نہ پہچان سکا
سامنے آیا مری خودنگری کا لکھا
ایک تصویر لئے بیٹھے ہیں قدموں کے نقوش
اک فسانہ ہے سرِ راہ کسی کا لکھا
نام میرا تھا، پتہ میرا تھا لیکن حرمت
سارا قصہ تھا کسی اور صدی کا لکھا

مدتوں حال اسی انداز سے جی کا لکھا
کبھی کاٹا تو کبھی نام کسی کا لکھا
سالہا نجدِ حوادث میں رہے خاک بسر
قصہ تب فکر کی آشفتہ سری کا لکھا
اُس نے حال اپنا نہ لکھا کہ تسلی ہوتی
ورنہ لکھنے کو تو احوال سبھی کا لکھا
رہ گئی بات فقط خوش لقبی تک محدود
تذکرہ کس نے تری خوش قدمی کا لکھا
مرنے والوں کو بھی روئے تو کیا جشن بپا
مرثیہ زندہ دلوں نے نہ کسی کا لکھا
ہو گیا ہے مری تاریخ نظر میں شامل
ایک افسانہ کسی اور صدی کا لکھا
حرمت اتنا ہی لکھا ہم بھی تھے مقتولِ فرات
پیاس نے مرثیہ کب تشنہ لبی کا لکھا

ایک نئے ادبی ناول

ریاض صدیقی
نلدول کمرشل ایریا، کراچی۔ H 9A/3 (پاکستان)

اُردو ناول کے گھر آنگن میں بہت دنوں سے سناٹا ہے۔ سنّاٹے سے جو خلاء پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی ممکن طوفان کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی صورتحال اُردو کے ایک تازہ ناول "لاوا" کی اشاعت کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے ٹھہرے ہوئے بند پانی میں پتھر پھینک دیا ہو اور اچانک سطحِ آب پر مضطرب لہریں پھیلنے لگی ہوں۔ قدیم جاگیردارانہ عہد کی اخلاقیات کے ہمنوا ممکن ہے یہ اعتراض کریں کہ اس ناول کا ہیرو جنسی اور شہوانی تجربات کے اُلجھاؤ کی کہانی پیش کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ تجربات ہیرو کو ایک ایسی فلسفیانہ تہذیب اور فکر و خیال کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچاتے ہیں جو ناول کو معنوی اور فنّی اعتبار سے ایک باوقار مقام عطا کرتا ہے۔ عشقِ مجازی اور معروضی حسن سے مادی تعلق کی راہ طے کر کے عرفان و ادراک کے مرحلے تک رسائی تو برصغیر کے ہند اسلامی کلچر کی روایت رہی ہے لیکن شہوانی تجربات کے سہارے "مطلق سچائی" اور وجدانِ عالی کے عالم سے روشناس ہونے کی منطق ایک نیا فکری گوشہ ہے۔

"لاوا" بہرحال تازہ ہوا کا جھونکا بن کر دنیائے ادب میں آیا ہے۔ گذشتہ دہائیوں میں ناول نویسی کی رفتار یقیناً بہت سست رہی ہے۔ اضمحلال کی یہ غیر متوقع کیفیت صرف مشرق تک محدود نہیں بلکہ مغرب بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہے۔ امریکہ کے معروف ناول نویس "جان ڈاس پےساس" سنہ ۱۸۹۶ء، سنہ ۱۹۷۰ء نے ایک پبلک مذاکرے میں ناول کے مرجھانے تک کی پیشن گوئی کر دی تھی۔ "لاوا" کا مطالعہ اس تناظر میں کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُردو میں طویل وقفہ کے بعد ایک معیاری اور خوبصورت ادب پارے کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس داستان سرائی کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ "لاوا" کو بڑا ناول اور اکرام بریلوی کو عظیم فن کار ہونے کی سند مہیا کر دی جائے یا "لاوا" کا مقابلہ "آگ کا دریا" "خدا کی بستی" اور "امراؤ جان ادا" سے کیا جائے۔ جن کا شمار اُردو کے بڑے ادبی ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ وہ کونسی فنّی، ٹیکنکی اور معنوی خصوصیات ہیں جو اس ناول کو طبقہ دوم کے ادبی ناولوں میں سرفہرست کا درجہ دیتی ہیں۔ اور یہ خوبصورت تخلیق ادبیاتِ اُردو میں ایک اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

ناول کا شمار تخلیقی ادب میں ہوتا ہے اور تخلیقی ادب کا کام خوابیدہ اور پرسکون محسوسات میں تموج پیدا کرنا ہے۔ "لاوا" میں مخاطب نگار کے لب و لہجے کی تہہ میں ہی نہیں اثر آفرینی کی شدید گہری کیفیت بھی ملتی ہے۔ ایسی کیفیت جو باطنی اور خارجی طرز اظہار کے تناسب و توازن سے عبارت ہے۔

"مہندر کور" فراز کے لیے ہنوز طلسم ہوش ربا بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی شخصیت اور ذات کے تنوع میں اس طرح کھو گیا کہ اسے کھو گیا کہ اسے گرد و پیش کی مطلق خبر نہ رہی۔ وہ مہندر کور کی کوٹھی میں آکر ایسا محسوس کرتا جیسے وہ کسی قدیم معبد میں آگیا ہو۔ کمروں کے سرسراتے ہوئے ریشمی پردے۔ ہلکی نیلی روشنیاں۔ دیواروں کے دلآویز نقش و نگار، مہکا ہوا ماحول اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ عہد عتیق کے کسی حسین صنم خانے میں چلا آیا ہے۔"

ناول کا ذکر ہو تو ہیئت و تکنیک کی گفتگو ناگزیر ہے۔ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی روایت نے ہیئت و تکنیک کو بھی ایک خاص مرحلے تک محدود رکھا تھا لیکن آج کے نئے عہد میں صورت حال مختلف ہے۔ لکھنے والا اگر موضوع اور مواد کو تخلیقی بہاؤ اور الفاظ و آہنگ کے تانے بانے میں تحلیل کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو ہیئت و تکنیک خود بخود صورت پذیر ہوتی ہیں۔ موضوع و مواد، ہیئت اور تکنیک کے درمیان ہم آہنگی قاری اور داستان کے مابین نہ ٹوٹنے والی مفاہمت پر منتج ہوتی ہے۔ "لاوا" ہیئت و تکنیک کی کئی صورتوں کا امتزاج ہے۔ اور یہ گنگا جمنی ناول کی صورت اس کے حسن اور تاثراتی ندرت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ اس امتزاج میں پیوند والی کیفیت نہیں بلکہ تحلیل کا رنگ جھلکتا ہے۔ فراز کا بڑھتا اور پھیلتا ہوا کردار سوانحی صورت کا آئینہ دار ہے لیکن آغاز و انجام شعور کی رو اور اظہاریت سے عبارت ہیں۔ ناول کا لہجہ بیانیہ ہے اور پلاٹ کی شرط بھی پوری کرتا ہے۔ ایک کہانی سے کئی ضمنی کہانیاں بنتی ہیں لیکن اس ساری رنگ آرائی میں وحدت کی بنا پر وہ تسلسل قائم ہو گیا ہے جو قاری اور ناول کے مابین حسی اور جذباتی رشتوں کے ارتقاء (ELEVATION) کے عمل پر زور

بھی اغماض نہیں ہوتا ہے۔ یورپ کے نظریہ سازوں نے زمانی شعور کو بھی فنی اصول کا درجہ دیا ہے۔ فاسٹر کے نزدیک ہر ناول گھڑی کی ٹک ٹک سناتا ہے۔ لارنس ڈرل (۱۹۱۲ء) نے سائنسی نظریہ زمان و مکان کی پیروی کرتے ہوئے اپنے چار ناولوں کو الکزنڈریا کوارٹٹ (ALEXANDRIA QUARTET) کے نام سے یکجا کیا ہے۔ ڈرل کا ذکر یوں بھی ضروری ہے کہ خود اکرام بریلوی، ہرمن ہیس اور ڈرل سے متاثر ہیں۔ انہوں نے واقعات و حوادث کی داستان کو حال کے لمحوں میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو طویل راتوں کے درمیان کئی دہائیوں کے فاصلے سمٹ کر ایک مرکز پر آگئے ہیں۔ ناول کی تنقید جدید وحدت زمان و مکان کو بنیادی اصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتی لیکن اکرام بریلوی کے یہاں ارسطوئی وحدتوں (UNITIES) کے اصول کا اعادہ ہوا ہے۔ ناول کا ہیرو ایک متعین مقام اور وقت کے کوانٹم میں رہتے ہوئے پورے عہد کی داستان سناتا ہے۔ وحدتوں کا یہ تکون ناول کے فنی و معنوی جمال میں مزاحمت کا سبب نہیں بنتا ہے۔ ہیئت و تکنیک میں روایت سے انحراف کے باوجود بعض صورتوں میں روایت کی طرف مراجعت کا میلان دکھائی دیتا ہے۔ ابتداء میں بیانیہ لہجہ اور خود کلامی کے ذریعہ داستان کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش مرزا رسوا کی یاد دلاتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر کی شمن کی مانند فراز اپنی کج روی کے باوجود سیاسی عزائم و رجحانات کا ترجمان نظر آتا ہے۔ تکنیک، ہیئت اور واقعات حوادث کے برتاؤ (TREATMENT) پر مغرب کے واضح اثرات ضرور ہیں لیکن نقطۂ نظر اور مقاصد کی حد تک ناول کا ہیرو بتدریج ان امکانات کی طرف بڑھ رہا ہے جو ہند اسلامی کلچر اور فکری منہاج کی مغرب کے نظام فکر پر فوقیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گویا ناول مقصد و نقطۂ نظر کے اعتبار سے اینٹی ویسٹ ہے ـــــ اور ـــ ٹی ایس ایلیٹ، لارنس ڈرل، اور ڈلن ٹامس جیسے شعلے غرب اسے بجھے ہوئے سے نظر آتے ـ لہٰذا موترساں "بجھے"۔

اور شانتی کی پر ہول تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے حقائق کی تیز روشنی سے گریزاں۔

اور جب وہ خود اس عالم رہبانیت میں ہوں تو دنیا کو کس طرح روشنی دے سکتے ہیں۔ ان کا وجود تو گمنام آباد ہستی میں قندیل رہبانی سے زیادہ نہیں۔ جو تاریکیوں میں روشنیوں کی ہلکی سی کرن پیدا کر کے بھی پر ہول اندھیروں میں ڈوب جائے۔

فنی لوازمات کی فہرست میں ناول کے لیے حسن بیان کو بھی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ فرانس کے بالزاک کو حقیقت پسندی ہی نہیں حسنِ بیان کی بناء پر بھی سراہا گیا۔ مورٹیمر کے نزدیک فن بیان میں بالزاک کی اختراع، قوتِ تاثیر اور اسلوب کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ ہمیں اس طرح مسحور کر لیتا ہے کہ ہم اس کے عقائد و نظریات کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اردو میں یہ کیفیت مرزا رسوا، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اور قرۃ العین حیدر کی میراث ہے۔ اکرام بریلوی نے حسن بیان کی اسی کیفیت کو گرفت کرنے کی کوشش کی ہے۔ "لاوا" علائم و استعارات کی رمزیت، منظر آفرینی، انسانی جذبات کی مصوری اور اسلوب کی ندرت کی مظہر ہے۔ ناول کا ابتدائی انداز ہی قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔

"فراز نے بڑی طوفانی زندگی گزاری تھی — اور اب زندگی اس کی نظروں میں پروا کے جھونکے، دیپ کی لَو، اور ساگر کے جھاگ سے زیادہ نہ تھی۔ وہ کوئٹہ میں ایک چھوٹی سی کوٹھی میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اب وہ ان مقاماتِ بلند کی سیر کر رہا تھا جہاں خرقۂ فقر خلافِ حرم نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جدید معاشرے کا کوئی انسان اسے کوئی نیا ہم سفر اور ہم نوا نہ مل سکا۔"

حسن بیان کی یہ کیفیت لفظوں کی جمالیاتی صورت، صوتی آہنگ اور علائم و استعارات میں مستقر گہری معنویت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ نظری زاویے بھی پیش کرتی ہے۔ فراز اپنی داستانِ حیات کا راوی

اس داستان میں زمانے بدلتے ہیں، رُت بدلتی ہے، موسم اور فضائیں بدلتی ہیں۔ کرداروں کے چہرے بدلتے ہیں۔ فراز کی آبلہ پائی شوق کی محرک روپا تھی۔ روپا نے اس کی سوئی ہوئی زندگی کو چند الجھنیں دیں۔ سرلا نے ان الجھنوں کو اس کے کردار کی خصوصیت میں بدل دیا۔ اور پھر "نگار"، "کامنی"، "راحیل جیراڈ"، "مہندر کور"، اور "سیتا" کا مقتہ یکے بعد دیگرے اس کی زندگی میں ہوا کے جھونکوں کی طرح داخل ہوئیں۔ فراز کا سفر ہمیں احمد نگر، سانبھر، بنگلور، جے پور، گنگاپور، دہلی، سوئٹزرلینڈ، اسپین، مشرقِ وسطیٰ اور لاہور کے ارضی و تہذیبی مناظر کی تصویریں دکھاتا ہے۔ لینڈ اسکیپ کے اس پھیلاؤ میں مشرق و مغرب کے درمیان کوئی دیوار نظر نہیں آتی۔ آپ نقطۂ نظر کی عمومیت کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیں تو یہ ناول تکوینی (COSMIC) نہ ہوتے ہوئے بھی تکوینی امکانات کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔

ناول کا مقصد انسان کی شخصیت کے اندر رونما ہونے والے کیتھارسس کے عمل کو واضح کرنا ہے۔ چنانچہ تصوف اور وجدان کی فلسفیانہ بحث اسی عمل کا حاصل ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اکرام بریلوی نے طبقہ دانش (INTELLECTUAL CLASS) کی محدود فضا سے تعلق قائم کیا ہے اور حیات و کائنات کی تعبیرات فلسفیانہ نہج پر کی ہے۔ اس ساری بحث کی عملی صداقت اپنی جگہ صحیح ہے لیکن "لاوا" جس ترقی پذیر معاشرے کے ادب کا حصہ ہے وہ فلسفیانہ تعبیرات و تشریحات کا نہیں عمل و حرکت کا متقاضی ہے۔ ایک ایسی تحریک جو حیات و کائنات کو واقعی بدل دینے کی سکت رکھتی ہو۔ تصوف اور وجدان کا موضوع اگرچہ ہندایرانی روایات سے کٹا ہوا نہیں ہے لیکن جدید عصری حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جنس کے ذریعے حقیقت تک رسائی کا تصور اہلِ مشرق کے لیے نیا ضرور ہے لیکن مغرب کی اکثر ناولوں میں اس میلان کی دھوپ چھاؤں بہت پہلے سے ملتی ہے۔ اور بہت کچھ سائنسی نظریہ تصوف سے استفادہ

پر مبنی ہے۔ علمائے مشرق کا یہ خیال کہ انیسویں صدی کی تجربی میکانکیت اور مادیت کے خلاف ہیجان نے مغرب کو مشرق کی طرف مائل کیا ہے۔ بیسویں صدی میں کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مغرب میں آئین اسٹائین کے ریاضیاتی انکشافات کی تعبیر و تشریح سے جس عقلی تصوف کو راہ ملی ہے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس نے پچھلی صدیوں کے مادی و میکانکی نظریات پر شدید ضرب لگائی ہے۔ اس سائنسی میلان کا احاطہ مادیت و حقیقت کے سابقہ نظریات اور سائنسی عینیت پسندی کے درمیان ہونے والے مکالموں (DIALOUGES) کے پس منظر میں کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت پسندی کا مروجہ تصور اپنی سائنسی خوبیوں کے باوجود مکمل سچائی (FINAL REALITY) کے دعوے کی دلیل نہ بن سکا۔ "لاوا" میں فکری اسلوب، واقعیت پسندی کے اس کلاسیکی نظریئے سے انحراف کرتا ہے اور خارج سے داخل کی طرف رجوع ہو کر وجدان و الہام کی بالائی سطح سے استفادے کی ترغیب دیتا ہے۔

جدید سائنسی فکر کے مطابق وجدان و الہام بھی عقل کی ایک اعلیٰ و ارفع سطح ہیں۔ مغربی ناول نویسوں میں لارنس ڈرل، جوزف کونارڈ اور ہرمن ہیس کے یہاں فکر کا یہ میلان واضح ہوا ہے۔ یہی آج کی حقیقت پسندی ہے جس کو مغرب میں سائنسی عینیت پسندی کا نام دیا گیا ہے۔ خود آئین اسٹائین نے نیوٹن اور ڈارون کے نظریہ حقیقت و مادیت کو رد کرتے ہوئے حقیقت پر مبنی عینیت پسندی (SCIENTIFIC IDEALISM) کا ذکر کیا ہے۔ مغرب میں برٹرینڈ رسل، جیمز جینس، اور وائٹ ہیڈ، اور مشرق میں اقبال اسی نظامِ فکر کے پر جوش ترجمان ہیں۔ "لاوا" جو لائحہ عمل متعین کرتا ہے اس کی فکری فضا میں اقبال کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ جیسی واردات اور وجدانی حالت سے گذر کر سچائی تک رسائی اور پھر ماورا کے [illegible] کی طرف مراجعت جو تعینات و اعتبارات سے بالاتر ہیں۔ "لاوا" کے نظامِ فکر میں موجود ہیں۔ اس ساری خیال آرائی کا حاصل "لاوا" کے آخری جملے ہیں۔

فرازؔ نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ اس کا سینہ اپنے نور کی تیزی سے پھٹا جا رہا تھا ــــ ایسی امنگیں اور آرزوئیں جو مادی آسودگی کے ساتھ ذہنی و روحانی آسودگی بھی دے سکیں۔ وہ مادی ذہنی اور روحانی آسودگی جس کے حصول کے لیے دنیا بے چین و بے قرار ہے۔ اور فرازؔ اب زندگی اور اس کے واقعات کو ارتقاء کی ایک خاص منزل تک پہنچانے کے بعد ماورا کی ان حدوں کی نشاندہی کر رہا تھا جو تعینات اور ان کے اعتبارات سے کہیں آگے ملتی ہیں۔

اخباری کالم نویسوں اور تنقید کے نام پر تبصرہ و تجزیہ کرنے والوں کی عنایات و نوازشات سے قطع نظر آپ "لاوا" کو بہ آسانی اچھی ادبی تخلیق قرار دے سکتے ہیں۔

فن تخلیق اور اُس کے مسائل

عبدالقیوم ابدالی
ساؤتھ بہار ٹائر ریٹریڈنگ ورکس۔ او ایچ بی روڈ
کانٹاٹولی، رانچی (بہار)

آج ہمارا ادب ایک ایسے دور سے گذر رہا ہے، جس سے وہ اپنی پچھلی زندگی میں شاید کبھی نہیں گذرا۔ ایک طرف مشینی زندگی کی ہمہ ہمی اور بڑھتی ہوئی بھیڑ نے انسان کو انسان سے بے گانہ کر دیا ہے۔ ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والے مختلف لوگ بھی ایک دوسرے سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ انسان رفتہ رفتہ جذبات سے بالکل عاری ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کے سامنے کچھ بھی ہوتا رہے اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ہر شخص اپنے اپنے مسائل کو سلجھانے میں پریشان ہے۔ اب مذہب، تہذیب اور قدروں کی پرانی دیواریں اگر گر نے نہیں لگیں تو کم از کم شکستہ ضرور ہو گئی ہیں۔ اب نئے نئے صنم ہیں اور نئے نئے صنم کدے۔ پھر سائنس کی نئی نئی ایجادیں اور ٹکنولوجی میں نئی ترقیاں اور MASS MEDIA کے مختلف ذرائع میں توسیع نے ذہنی طور پر تو انسان کو خصوصاً ہم ہندوستانیوں کو چاند تک پہنچا دیا ہے لیکن حقیقی صورتحال یہ ہے کہ ہم آج بھی اُس پستی اور اُسی ظلم و تشدد کے شکار ہیں۔ مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھوں آج بھی ہمارا مکمل سماج چکی میں گھن کی طرح پس رہا ہے۔ جاہلیت اور پستی اب بھی اُسی طرح شباب پر ہے۔ ملک کی اکثریت جو کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل ہے اور دیہاتوں میں رہتی ہے اُسی طرح بے بس، لاچار اور مجبور ہے۔ اور ان لاچاروں اور بے بسوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر مٹھی بھر سرمایہ دار چند سکوں کے عوض اُن کا سب کچھ آج بھی چھین رہے ہیں۔ پیسہ ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ نہ قانون کوئی چیز ہے اور نہ ہی اخلاقی قدریں۔ اور معاشی جنگل میں ہر شخص حیوان ہو گیا ہے جو آنکھ بند کر کے ایک دوڑ لگا رہا ہے۔

چوں کہ ادیب یا شاعر بھی اسی دنیا میں رہتا ہے اس لیے وہ بھی انہیں حالات سے دوچار ہے اور اس کے ادب پارے انہیں حالات کے عکاس ہیں۔ چوں کہ وہ بھی دوسروں کی طرح جذبات سے عاری ہوتا جا رہا ہے اس لیے آج کا ادب جذبات سے زیادہ محسوسات کا فن ہو گیا ہے۔ فن کار کے لیے یہ بھی ایک مشکل ہے کہ وہ ذہنی طور پر بے انتہا اونچا اُٹھا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کے آس پاس کی ہر چیز اُسے "بونی" لگتی ہے۔ اور وہ جھلا جاتا ہے۔ یہ جھلاہٹ آج کے ادب میں ایک عام چیز ہے۔ وہ اسی لیے یہ

برداشت نہیں کر سکتا کہ اس بیچ اور کم نظر مخلوق کے لیے ادب تخلیق کرے۔ لیکن اس جھلاہٹ نے باوجود اسے معاوا اسی دنیا سے اخذ کرنا ہے۔ اس لیے وہ حالات کا مشاہدہ تو کرتا ہے لیکن ایک ناظر کی طرح ایک ایسے انسان کی طرح نہیں جو اُسی سماج میں رہتا ہے اور اپنے لیے حالات سازگار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی آدمی (خصوصاً جب وہ اپنے آپ کو زیادہ باشعور بھی تسلیم کرتا ہے) جس کے آس پاس ظلم تشدد اور عدم مساوات کا بازار گرم ہو وہ صرف خاموش تماشائی بنا رہ سکتا ہے۔ گو کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا لیکن ایسا ہی کرنے پر مجبور ہے کیونکہ اس کے اندر زمانے سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہے اور وہ حالات کو بدلنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔ اس لیے صرف کُڑھ سکتا ہے، خون کے آنسو رو سکتا ہے۔ یہ مجبوری یہ لاچاری ہمیں آج کے ادب میں ہر جگہ چھائی نظر آئے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہی جھلاہٹ اور مجبوری جو روزمرہ زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے اور جس سے ہر آدمی برسرپیکار ہے اُسی کی عکاسی کو ادبی شکل میں پڑھنے کے لیے کس کے پاس وقت ہے یا کوئی کیوں اپنے ذہن کو مزید بوجھل کرنا چاہے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ان ادبی فن پاروں کی وقعت گھٹنے لگی اور اب یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ لوگ جن کی روزی روٹی ہی اس سے وابستہ تھی وہ لوگ کیا کریں؟ انہوں نے بڑے بڑے مغربی دانشوروں کے قول نقل کرکر کے (خدا کرے ان کی صحیح توضیح بھی کر پائے ہوں) یہ ثابت کیا کہ ادب عوامی سطح کی چیز ہی نہیں ہے اور اگر ہیں تخلیق کو دو آدمی بھی سمجھ لیتے ہیں تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی محنت وصول ہو گئی۔ پرانے ادبی پرچے بند ہو رہے تھے اور نئی نئی دکانیں کھل رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے نام پر آسانی تخلیقات کا بازار گرم ہوا۔ ادب کا ترسیلی المیہ نا قابلِ حل ہو گیا۔ ایسے ایسے پیکر تراشے جانے لگے اور ایسی ایسی علامتیں استعمال کی جانے لگیں کہ عام قاری بیچارہ تو کیا خود بڑے بڑے نقاد (خود ساختہ) اس کی الگ الگ توضیح کرتے نظر آنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی خود ادیب یا شاعر بھی صحیح کچھ معنی

نکالتا تھا اور شام کو کچھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب و شاعر زیادہ پیدا ہو گئے۔ اور ان کو پڑھنے والے کم ہی لوگ رہ گئے۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ پوری کی پوری ادبی پیڑھی اس لعنت کا شکار نہیں ہوئی تھی اور دھیرے دھیرے جب ہمارے ادبی آسمان سے یہ گندے بادل چھٹے تو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ادب کا رشتہ عوام سے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ادیب کے لیے یہ ضروری تصور کیا جانے لگا کہ وہ ہماری ادبی روایت سے پوری طرح واقفیت حاصل کرے اور ان کی صحت مند قدروں سے بہرہ ور ہو۔ فنی لوازمات کا بہتر علم حاصل کرے اور جہاں اس کی ضرورت ہو اس کا خاطر خواہ استعمال کرے۔ دنیا کے تمام اچھے فن پاروں سے عرق حاصل کرے اور اس سے اپنے خیابان کو مہکائے۔ وہ جس قسم کا ادب پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کو سمجھنے والے ذہن کی تعمیر کرے۔ صرف کورے جذبات کو فن کے پیکر میں نہ ڈھالے بلکہ دنیا میں پیش آنے والے حقائق کا عرفان حاصل کرے۔ ایک فوٹوگرافر کی طرح محض تصویر کشی نہ کرے بلکہ ایک ماہر پینٹر کی طرح اُس میں ایسے ایسے رنگ بھرے جس سے اُس کی تخلیق میں خوبصورتی پیدا ہو۔

یہ ایک نیک قدم ہے۔ میرے نزدیک تخلیق ایک نہایت ہی متبرک فریضہ ہے۔ چاہے وہ ادب کی تخلیق ہو یا فن کی۔ مصوری ہو یا بُت تراشی۔ فن کار تخلیق کرنے سے پہلے یعنی اپنی تخلیق کو پیکر عطا کرنے سے پہلے جس کرب سے گزرتا ہے وہ اُسے دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ایک خالق محض ایک فوٹوگرافر کی طرح کسی بھی نظارے کو من و عن پیش کر دینے پر قانع نہیں ہو سکتا بلکہ وہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے جو کچھ بھی سنتا ہے اور جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اُسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور پھر اُسے اپنے مخصوص رنگ میں اپنے تخیلات اور جذبات کے سہارے الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فن کار کو کسی خاص موضوع پر لکھنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اُسے کسی خاص زاویے سے سوچنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کی نفسیات

الگ الگ ہوتا ہے اور وہ ایک الگ دماغ اور الگ ذہن کا مالک ہوتا ہے ۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی انسان کا انفرادی احساس دراصل اس کے ماحول، اس کے سماج اور اس کے حالات کا ترجمان ہوتا ہے ۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن حالات کے کونسے رُخ اُسے متاثر کرتے ہیں یہ اس کے ذاتی احساسات پر مبنی ہے ۔ وہ کسی بھری پڑی سڑک پر چلنے والے ہیتی ٹولے سے بھی متاثر ہو سکتا ہے ۔ کسی ٹرین ایکسیڈنٹ سے اس کا دل مرتعش ہو سکتا ہے، کسی فٹ پاتھ پر سوئی ہوئی بھکارن اُسے اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے یا پھر کسی محبت کرنے والے جوڑے سے وہ متاثر ہو سکتا ہے ۔ یا کسی بھاگتے ہوئے چور کو دیکھ کر دیکھ کر وہ اپنے فن پارے کے لیے مواد اکٹھا کر سکتا ہے ۔ وہ اسے یعنی اس مواد کو چاہے کسی طرح بھی استعمال کرے یعنی چاہے وہ " DIRECT " انداز بیان استعمال کرے چاہے " INDIRECT " وہ علامتوں سے کام لے یا تشبیہات سے، یہ اختیاری ہے لیکن اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے ۔ اُس سے اُس کے قاری کا رشتہ کا ۔ یا تو وہ اپنے قاری کو اس قابل بنائے کہ وہ اس کے استعمال کردہ علامتوں کو سمجھ سکے یا پھر وہ ایسی زبان، ایسی علامتیں استعمال کرے جسے اُس کا قاری اگر آسانی سے نہیں تو تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ضرور سمجھ لے ۔ اور پھر ہماری تہذیبی روایتوں اور پرانی کہانیوں اور فسانوں سے بہت سی ایسی علامتیں اخذ کی جا سکتی ہیں جس سے ہمارے قاری کی ہماری اکثریت اچھی طرح واقف ہے ۔

آخیر میں چند الفاظ فن کاروں کی نذر ہیں ۔ میرے خیال میں فن کار اپنے سماج کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ وہ مصلح یا رہبر نہیں ہوتا لیکن ایک ذمہ دار شہری کا یہ فرض بھی تو ہے وہ اپنے اردگرد کی گندگیوں کو صاف کرتا ہے یا عوام کو کم از کم اُن سے آگاہ ضرور کرا دے ۔ میں نے اپنے پورے مضمون میں کہیں بھی مثالیں پیش نہیں کی ہیں لیکن یہاں " قاضی عبدالستار کے ایک افسانے " بلا عنوان " کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔ اس افسانے میں قاضی صاحب نے جدید تہذیب کے بدن پر چند کھرنڈ پڑے ہوئے ناسوروں کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے ۔ میرے خیال میں ایسا کر کے قاضی صاحب نے اپنا مقام گرا نہیں لیا ۔ بلکہ ایک باشعور اور اچھے فن کار ہونے کا ثبوت مہیا کیا ہے ۔ دنیا کے لق و دق صحراؤں یا سورج کے تپتے ہوئے رہگذر تنہا درخت کا تصور کر لینا ہی ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا یا اپنی حالت دکھا کر سورج کو شرما کر اس کا منہ لال کر دینے سے ہم بری الذمہ نہیں ہو سکتے ۔ ضرورت ہے کہ ہم ہر ہاتھ کے لیے ایک سورج تخلیق کریں جس میں اُسے دنیا کی ہر چیز صاف نظر آجائے اور وہ اپنی حالت کا اندازہ کر سکے ۔ اور اس کے لیے نہ تو اب نظریے تراشنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اصول بنانے کی ۔ بلکہ ہر فن کار کو اپنے سینے میں نرم گوشہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ۔ اپنے نظریے میں وسعت اور اپنے جذبات و احساسات میں گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ چھچھلی حقیقت نگاری کی بجائے، حقیقت میں ڈوب کر اس کا عرفان حاصل کرنے کی ضرورت ہے ۔ ▲▼

تفصیلی مطالعہ

شبیر آصف

۴۱۸، نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

جو آج مجھ سے مِلا، یوں کبھی مِلا تو نہ تھا
تو کیا وہ شخص کہیں کوئی دوسرا تو نہ تھا

وہ ایک بار بُلا کر تو دیکھتا مجھ کو
شکستہ دِل تھا میں لیکن شکستہ پا تو نہ تھا

میں کیسے اُس کی ہر اک بات مان کر چلتا
وہ کچھ بھی ہو مرا لیکن مرا خدا تو نہ تھا

وہ میرے پاس بھی رہ کر ہمیشہ دور رہا
میں دور رہ کے بھی اُس سے کبھی جُدا تو نہ تھا

یہ ٹھیک ہے کہ بھرم کُھل گیا تھا آنکھوں سے
مری زباں پہ مگر حرفِ مدّعا تو نہ تھا

بچھڑ کے اُس سے، خود اپنے کو پا لیا میں نے
میں اُس سے مِل کے کبھی خود سے بھی مِلا تو نہ تھا

یہ کون آج بھی میرے جلو میں ہے آصف
وہ میرے ساتھ ذرا دور بھی گیا تو نہ تھا

یہ بات صرف دکھاوے کی ہے کہ دریا تھا
وگرنہ میں تو ازل سے شدید پیاسا تھا

میں خونِ دِل جو نہ کرتا تو اور کیا کرتا
وہی تو خوابوں کا قاتِل وہی مسیحا تھا

یہ کون پھر سے در آیا ہے میری دُنیا میں
کہیں یہ وہ تو نہیں جِس کو بھول بیٹھا تھا

سہاگ رات سے پہلے اُسے خبر نہ ہوئی
وہ جس کو پیار سمجھتی رہی، وہ پیاسا تھا

جواز اتنا بہت ہے مزید جینے کو
کوئی تو تھا جو کبھی اپنا بھی شناسا تھا

سِمٹ کے رہ گیا دِل میں ترے تعجّب ہے
میں آسماں کی طرح دُور دُور پھیلا تھا

یہ اپنے اپنے مقدّر کی بات ہے آصف
یہی بہت ہے کہ تیرا کوئی شناسا تھا

شبیر آصف

صحرا میں دھیرے دھیرے مرا غم سنبھل گیا
گھر کا خیال ذہن سے آخر نکل گیا

سوچا تو آسماں بھی بڑا مختصر لگا
اوڑھا تو اِک ردا سے مرا کام چل گیا

کس کس طرح سے تجھ کو سنواروں میں زندگی
جینے کی آرزو میں مرا دم نکل گیا

ترکِ تعلقات پہ آزردہ کون ہو
اِک ریت کا گھروندہ تھا آخر ڈھل گیا

آنکھیں کھلیں تو خود کو بھی میں اجنبی لگا
اِک مختصر سی نیند میں کیا کیا بدل گیا

منزل کے بعد پھر وہی سودائے جستجو
کوئی حدودِ وقت سے آگے نکل گیا[1]

پلکوں پہ پھر سے خواب کسی نے سجا دیئے
اور یہ دلِ فریب زدہ پھر بہل گیا

یہ کون ہے جو دِل میں اُجاگر لگا مجھے
آنکھوں میں روشنی کا سمندر لگا مجھے

حائل تھے اپنی راہ میں صدیوں کے فاصلے
طے کر لیا تو جیسے کہ پل بھر لگا مجھے

کس کس سے راہ و رسم بڑھاؤں میں دوستو
میری ہی طرح ہر کوئی بے گھر لگا مجھے

ہونا تھا کچھ نہ کچھ تو اثر ارتباط کا
اِک پھول سا وجود بھی پتھر لگا مجھے

یادوں کو اوڑھ کر بڑی آسودگی ملی
کل شب وہ میرے جسم کی چادر لگا مجھے

کوئی بھی گھونپ سکتا ہے خنجر اندھیروں میں
خود اپنے سائے سے بھی بڑا ڈر لگا مجھے

کب تک ہوا کی زد پہ میں یونہی اُڑا رہوں
اِک سنگ میل ہی سہی، ٹھوکر لگا مجھے

[1] "حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی" (شکیب جلالی)

"چوتھی کا جوڑا"

...... ایک تجزیہ

نگہت سلطانہ

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۔ علی گڑھ

اردو افسانہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ ابتداء ہی سے اردو افسانہ میں دو متضاد رجحانات کی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں زندگی کی حقیقت نگاری اور سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، اور اپنے ابتدائی دور میں مجنوں گورکھپوری رومانی افسانہ نگاری کے نمائندے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں پریم چند نے اپنا مشہور افسانہ کفن لکھا۔ یہ افسانہ گہری مقصدیت کے باوجود افسانہ کے فنی معیار کا بھی اچھا نمونہ ہے۔ اس لیے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ترقی پسند افسانے سے پہلے اردو میں اچھے مقصدی افسانے لکھے گئے۔ ہاں! یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند کی تمام تر کوششوں کے باوجود زندگی کی حقیقت نگاری افسانوں میں اس طرح ہمہ گیر نہ تھی جیسا کہ ترقی پسند دور میں ہوا۔ ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں مارکسزم سے متاثر افسانہ نگار اور فرائیڈ نظریات سے متاثر افسانہ نگار دونوں ہی ترقی پسند کہے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طبقاتی کشمکش، غریبی اور سرمایہ داری کا جھگڑا، رسم و رواج کی تنگ نظری، مذہب اور اس کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے جنسی پہلوؤں کی عکاسی ترقی پسندی سمجھی گئی۔ کرشن چندر اور بیدی اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش پیش کر رہے تھے۔ منٹو اور حسن عسکری وغیرہ شہری زندگی اور خاص طور پر تعلیم اور طوائفوں کی زندگی میں ایک جنسی چٹخارا لیتے ہوئے افسانہ لکھ رہے تھے۔ جنس کے موضوع پر ان کی حقیقت نگاری قابلِ اعتراض ہوئی۔ اور ترقی پسندوں نے منٹو وغیرہ کے جنسی افسانوں کو ترقی پسند افسانے ماننے سے انکار کر دیا۔ عصمت بھی ان ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہیں جو بنیادی طور پر مارکسی ہیں۔ زندگی میں جو ناانصافیاں ہوتی ہیں وہ ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ لیکن عصمت کے ہاں بڑی بات یہ ہے کہ مارکسی حقیقت نگاری کی دھن میں وہ افسانے کے فنی معیار کو مجروح نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کے ہاں مقصدی افسانے مختصر افسانوں کی خوبیاں رکھتے ہیں۔

عصمت چغتائی کو اپنے فن سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ اسی لیے اپنے فن کی خاطر وہ لوگوں کی دشمن بن گئیں ہیں۔ عصمت بہت سی باتوں کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ یہ باتیں ان کے آس پاس کے سماج کے متحدہ فیصلوں اور من بھاتے عقیدوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز ہو کر سچ بات کو جیسا دیکھتی ہیں ویسا لکھ دیتی ہیں۔ اس صاف

کر گئیں کبھی بے دردی اور بے دردی سے کام لینے میں بھی انہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا ۔ حق کے اظہار کے لیے انہوں نے بہت سے لطیف اور شدید حربوں سے کام لیا ہے۔ تیکھے، طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق اور اسی ہنسی میں پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں ۔ ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جانا۔ یہ سب سیدھی سادی روزمرہ کی باتیں ان کے فن کے تھوڑے سے حربے ہیں۔

حربے اور بھی ہیں لیکن ان حربوں سے پہلے شاید ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کا وار کس کس پر ہوتا ہے ۔ اور ان حربوں سے کہاں کہاں شعور کے موقلم کا کام لیا جاتا ہے ۔

عصمت نے مسلمانوں کے اوسط گھرانوں کی ایک خاص عمر کی لڑکیوں کی زندگی کی ترجمانی کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے ۔ اس کی ترجمانی میں انہیں وہ مہارت حاصل ہے کہ ماہرینِ نفسیات نے اس خاص عمر کے متعلق جو موشگافیاں کی ہیں ان میں بھی ہمیں سچائی کی وہ جھلک نظر نہیں آتی جو عصمت کے افسانوں میں ہے۔ عصمت نے شباب کی منزل میں پہلا قدم رکھنے والی لڑکیوں کی زندگی کے جو رنگ برنگے نقوش اپنے افسانوں میں دکھلائے ہیں وہ انہوں نے گہرے مشاہدے اور براہِ راست مطالعے سے حاصل کیے ہیں۔ اس لیے ان تصویروں کے پردے میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے اُسے ہم اس طرح ماننے پر مجبور سے ہو جاتے ہیں ۔ جیسے کوئی ماہر فن اپنی ساری زندگی کے تجربہ اور تخلیق کا نچوڑ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

عصمت کی حقیقت نگاری پر اکثر عریانی کا الزام عائد ہوا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کا مشاہدہ اس قدر باریک ہے اور نفسیات پر ان کی اتنی گہری نظر ہے کہ وہ جذبات واحساسات کی بالکل صحیح تصویر پیش کر دیتی ہیں ۔ اسلیے ان کے فن کو اولیت حاصل ہے ۔ زبان پر عصمت کو قدرت ہے اور جس طبقہ کے افسانے لکھتی ہیں اسی سے متعلق زبان کا اس طرح استعمال کرتی ہیں کہ صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔
عصمت کو زبان پر اس لیے بھی قدرت حاصل ہے کہ اس ہی زبان کو انہوں نے بچپن سے سُنا اور بولا ہے ۔ ان کے افسانے عام طور پر نچلے اور متوسط طبقے کے نسوانی کرداروں سے متعلق ہیں ۔

عصمت پر عریانی کا الزام یوں بھی غلط ہے کہ ان کا آرٹ اشاروں کنایوں کا آرٹ ہے ۔ وہ تشبیہہ اور استعارے سے کام لیتی ہیں ۔ یہ نہ صرف ان کے افسانوں کی دلچسپی اور آرائش میں مددگار ہوتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ وہ چند جملوں میں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں. ان کے یہ اشارے کہانی کے ارتقاء اور پس منظر میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔ وہ پلاٹ اور ٹیکنک پر زور نہیں دیتی ہیں۔ بلکہ ان کا سارا زور مکالمہ اور کردار پر ہوتا ہے ۔ مکالمہ ان کی کہانی کی جان ہے ۔ زبان کی یہ خوبی ان کے افسانوں کا سب سے بڑا حسن ہے ۔

"چوتھی کا جوڑا" عصمت کا نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھی درمیانی طبقہ سے متعلق ہے ۔ اس طبقے کی مشکلات کو انہوں نے بڑی تاثیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہیں تاثر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُسے برداشت کرنا دشوار ہوتا ہے ۔ اس افسانے کا تھیم بہت اہم ہے ۔ عصمت کا آرٹ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لکھنے کا آرٹ ہے۔ اس قسم کا افسانہ شاید یہ پہلا افسانہ ہے ۔

عصمت نے تو واضح طور پر نہیں کہا لیکن افسانہ کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کا معاملہ بہت بڑا اور دشوار ہے اور تھا۔ تقسیم کے بعد وہ لڑکے جو تعلیم حاصل کر کے پاکستان چلے گئے اور یہاں جن لڑکیوں سے ان کی نسبت تھی وہ شادی نہ ہو سکی۔ ان معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کی آرزوؤں تمناؤں اور خواہشوں کے جنازے نکلتے رہے۔ اور ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے ۔

اس افسانہ کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک غریب خاندان جس میں دو لڑکیاں اور ایک بوڑھی ماں۔ بوڑھا اور بیمار باپ ہے ۔ غربت کی یہ حالت ہے کہ کھانے تک کو نصیب نہیں ہوتا پھر یہ دو لڑکیاں جو جوان ہیں ان کی شادی کے لیے بہت کچھ روپیہ پیسے کی ضرورت درپیش ہے ۔ کبریٰ جو بڑی لڑکی ہے اور حمیدہ چھوٹی ہے ۔ ان کی ماں ایک ذہین عورت ہے وہ اپنی غربت اور مفلسی کے باوجود لڑکی کے لیے جہیز جوڑتی رہتی ہے۔ تاکہ وقت پر

کو پڑتا نہ ہو۔ پھر ایک دن وہ آتا ہے کہ کبریٰ کا باپ اپنی کھانسی اور بخار سے نجات حاصل کر لیتا ہے (یعنی مرجاتا ہے) اب کبریٰ کی ماں کو اور بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس سب باتوں کے باوجود وہ لڑکی کے لیے جوڑتی رہتی ہے۔ اور کسی نہ کسی طریقہ سے ایک جوڑا تیار کرتی ہے۔ لیکن جب سے شوہر کا انتقال ہوا ہے کوئی بھی پیغام اس گھر میں آتا ہی نہیں۔ جیسے لوگ اس گھر کو اس گھر کے رہنے والوں کو بھول ہی گئے ہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس گھر میں دو جوانیاں دم توڑ رہی ہیں۔ لیکن وہ باہمت عورت ہار نہیں مانتی۔ روز سہ دری میں اپنی کبریٰ کا جوڑا بناتی ہے۔ لیکن جوڑا جو خراب ہو جاتا ہے اس کو یہ کہہ کر رکھ دیتی ہے' اس کا تو کام خراب ہو گیا ہے۔ چاہے کے لیے اس کو رکھ دینا چاہیے اور صندوق میں رکھ دیتی ہے۔ پھر دوسرا چوتھی کا جوڑا تیار ہونے لگتا ہے۔

اچانک کبریٰ کے کسی رشتہ دار کا خط آتا ہے کہ اس کا لڑکا نوکری کے سلسلے میں اس شہر میں آ رہا ہے۔ اسی گھر میں قیام رہے گا۔ بس یہ سنتے ہی کبریٰ کی ماں کی ماتو عید ہو گئی۔ وہ نادان عورت سمجھ لیتی ہے کہ یہی اس کی کبریٰ کا محافظ ہے۔ اس کی خاطر کرنے کے لیے اپنے کانوں کے بالوں کو فروخت کر کے ایک دوپٹہ کچھ مصالحہ اور کھانے کے لیے سامان منگواتی ہے۔ کیوں کہ اس کو شادی کی بھی تیاری جلد سے جلد کرنی ہے۔ لڑکا جس کا نام راحت ہے آتا ہے اور کبریٰ روز اس کے ناشتہ کے لیے پراٹھے اور حلوے بناتی ہے۔ سوئٹر بنتی ہے۔ وہ لوگ خود بھوکے رہتے ہیں۔ اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرتی ہیں لیکن یہ لڑکا جب حمیدہ اس کے پاس ناشتہ اور کھانا لے کر جاتی ہے تو اس کو بری اور گندی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور پھر ایک دن وہ اس سے وہ بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ جب حمیدہ ماں سے شکایت کرتی ہے تو وہ اور محلہ کی دوسری عورتیں اس کی بات کو سمجھ نہیں پاتی اور کہتی ہیں کہ وہ تیرا ہونے والا بہنوئی ہے۔ اس طرح کا مذاق کرنا اس کا حق ہے۔ حمیدہ ہر طرف سے پریشان رہتی ہے۔ ایک طرف اس کو بہن کا خیال ہے دوسری طرف ماں اور اپنی غربت کا۔ لیکن مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتی۔ آخر ایک دن وہ آتا ہے کہ جب راحت کے گھر سے تار آتا ہے کہ تم فوراً چلے آؤ۔ تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔ راحت چلا جاتا ہے وہ بالکل نہیں سوچتا کہ ایک مظلوم لڑکی نے خیالوں ہی خیالوں میں اس کو کیا سمجھ لیا ہے۔ اس کے جانے سے کسی پر کیا گذرے گی۔ آخر کار کبریٰ کو بخار آنے لگا۔ پھر ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ جس سہ دری میں کبریٰ کی ماں اس کا جوڑا تیار کیا کرتی تھی اس کا کفن تیار کرتی ہے۔ اور اس کو اسی طرح سے رخصت کرتی ہے جیسے کہ سسرال روانہ کر رہی ہے۔ اس کو چوتھی کا جوڑا پہنا دیا گیا ہے جو کفن کے روپ میں ہے۔ اور آنکھوں سے خاموشی کے ساتھ آنسو گراتی جاتی ہے۔ یہ اس کہانی کا خلاصہ ہے۔

اس افسانے میں مرکزی کردار کبریٰ کی ماں کا ہے۔ جس کے گرد پوری کہانی گھومتی رہتی ہے۔ یہ ایک سگھڑ عورت ہے اور شروع ہی سے اپنی دونوں لڑکیوں کے لیے جہیز جمع کرتی رہتی ہے۔ جب کہ کھانے تک کے لیے پریشان رہتی ہے۔ پھر اچانک اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے جو ٹی بی کا مریض ہے۔ اس وقت عصمت نے بڑا پیارا جملہ لکھا ہے کہ

"جب سے ابا گذرے سلیقہ کا دم پھول گیا۔"

اس میں کبریٰ کی ماں کی محرومیاں، الجھنیں اور پریشانیوں کا سب سے شدید اور بھرپور اثر اسی پر پڑتا ہے۔ اس کا کردار ہم سے رحم کی اپیل کرتا ہے۔ اور پوری طرح ہمیں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ وہ ایک کم پڑھی لکھی عورت ہونے کے باوجود اپنی لڑکیوں کے رشتے کے لیے محلے کی عورتوں سے بات چیت کرتی ہے۔ تھوڑی سی امید پر پورا خواب بننے لگتی ہے۔

دوسرا کردار جو اچانک متعارف ہوتا ہے وہ حمیدہ کا کردار ہے۔ یہ ایک سادہ مزاج لڑکی ہے' اپنی بہن سے محبت کرتی ہے۔ ماں کی طرح اس کا بھی ارمان ہے کہ کبریٰ کے کھردرے دھنیے کی بساندھ میں سڑے ہاتھوں میں مہندی لگ جائے۔ دوسری طرف اس کو یہ بھی خیال ہے کہ جب تک کبریٰ کی شادی نہ ہوگی میری بھی نہیں ہو سکتی ہے۔

کبریٰ کا کردار ایک ایسی سوکھی سہمی لڑکی کا ہے جو نچلے متوسط گھرانوں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ سب کچھ اس کی خاطر ہو رہا ہے

اس کی خوشیاں اور غم اندر ہی اندر اُسے جھلساتے رہتے ہیں۔ لیکن زبان کچھ نہیں کہتی۔

راحت کا کردار ایک چھچھورے نوجوان کی تصویر پیش کرتا ہے۔ شروع میں وہ حالات سے ناواقف ہوتا ہے لیکن اس کے کردار میں کہیں بھی کوئی بلندی اور ستھرا پن نظر نہیں آتا۔

حمیدہ اور کبریٰ کے کردار اس کہانی کو بنانے میں مددگار ہیں۔ ان کے خیالات اور جذبات ہمیں ان سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عصمت نے ان کرداروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے جذبات کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ ان سے ایک خاص ہمدردی رکھتی ہیں۔ اکثر جذبات کی رو میں بے رحم ہو جاتی ہیں۔ اور سختی سے تنقید کرتی ہیں۔

عصمت کو لڑکیوں کے کردار پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ لیکن اس افسانے میں ان کا سب سے بڑا کمال کبریٰ کی ماں کا کردار ہے، وہ اس کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ ان کا ارمان سے کپڑوں کو سینا، ٹانکنا، انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہونا۔ راحت کے آنے کا سن کر اس کی خوشی اس بات کا اظہار ہے کہ کبریٰ کی شادی کا کتنا ارمان بلکہ جنون تھا۔ پھر وہ راحت کی آمد کا بھی ایک مطلب نکالتی ہے کہ وہ کبریٰ کے لیے آیا ہے۔ وہ کچھ اور اس کے علاوہ سوچنا بھی نہیں چاہتی۔

عصمت کو زبان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے وہ اس سے بہت کام لیتی ہیں۔ یہ افسانہ پہلے جملے ہی سے اپنی طرف قاری کو متوجہ کر لیتا ہے۔ "سہ دری" اور "جازم" کا ذکر ہمیں متوسط طبقہ کے اس گھرانے میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں یہ کہانی پروان چڑھ رہی ہے۔

"کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے"

ایک حقیقی منظر پیش کرکے تصویر میں رنگ بھرتے ہیں۔ رسد کی کمی کی دہائی دینے والا بچہ اس طبقہ کی پریشانیاں اور فلاکت زدگی کا حال بیان کرتا ہے۔ عصمت کا ایک فقرہ جہاں معنی رکھتا ہے کہیں کوئی غیر ضروری لفظ نہیں ملتا۔ عصمت کا مشاہدہ بہت قوی ہے۔ کبریٰ کی ماں کے متعلق یہ الفاظ ——

"لال ٹول کا عکس، ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ اور اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گپھاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں۔ جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔"

سانولے رنگ پر ٹول کا عکس، اُداس جھریوں کا گہرا نظر آنا اور اچانک مسکرانے سے جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اُٹھنا گو تشبیہات ہیں لیکن صرف تشبیہات نہیں۔ یہ ہمارے ذہن کو کہانی کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اس کا پس منظر بتاتی ہیں۔ اور کبریٰ کی ماں کا المیہ بیان کرتی ہیں۔

حمیدہ اپنے باپ کے بارے میں سوچتی ہے۔ "تو بڑے شفاخانے" کا ذکر اس کنبہ کی حالت کو فوراً سامنے لے آتا ہے۔ وہ کبریٰ کی جوانی کے لیے "مناؤنی" اور حمیدہ کی جوانی کے لیے "سانپ کے پھن" کے الفاظ استعمال کرکے بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔ ان پریشانیوں کا حال جو ایک فلاکت زدہ گھر میں جوان لڑکیوں کی موجودگی سے پیدا ہو جاتی ہیں ——

"سلیقہ کا دم بھول گیا" یہ الفاظ بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کرتے ہیں۔

باپ کے مرنے کے بعد "حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنا چھوڑ دی" یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ غربت بچپن ہی میں شعور دے دیتی ہے اور بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ اس افسانے کے مکالمے اس طبقہ کی مخصوص زبان اور انداز میں ہیں۔ مثلاً

"لو بوا اور سنو! تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی"

اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔

عصمت جنسی پہلو کو کام میں لاتی ہیں لیکن ضرورت کے مطابق۔ اس کے لیے وہ کوئی شعوری اور غیر شعوری کوشش نہیں کرتی ہیں۔

ہم اس افسانہ کو پڑھ کر معاشرہ کی ان تمام خامیوں سے نفرت محسوس کرتے ہیں جن کی بنا پر ایسے ناقابلِ برداشت حالات پیدا ہوتے ہیں جو کردار اس میں سب سے زیادہ ہمدردی اور رحم کا مستحق نظر آتا ہے جس سے آنکھ ملانا دشوار ہے وہ کبریٰ کی ماں ہے۔ وہ ایک پُر امید اور باہمت عورت ہے۔ اس کی [illegible] ناکامیوں اور محرومیوں سے عبارت ہے۔ وہ جاگتے ہی میں اپنی آرزوؤں کے خواب دیکھتی ہے لیکن خواب ہمیشہ تعبیر سے محروم رہتے ہیں۔ اور انجام اتنا دردناک ہے کہ قاری لرز جاتا ہے۔

کبریٰ جو راحت کے آنے پر کمرے میں سفیدی اپنے ہاتھ سے کرتی ہے گھر کی صفائی کرتی ہے جس سے اس کے ہاتھ چھل جاتے ہیں۔ اور پھر وہ اس سے مصالحہ بھی پیستی ہے۔ لیکن یہ سب رومانٹک طور پر نہیں کرتی بلکہ اس لیے کرتی ہے کہ اگر میری شادی ہو جائے گی تو میرے گھر سے ایک آدمی کا کھانا کم ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ وہ معاشی حالات کے سبب سے سوچتی ہے۔ پھر آگے چل کر اس کی ماں اپنی ناک کی کیل جو صرف چار ماشے کی ہے۔ اپنی سہیلی کو دے کر بکواتی ہے جس سے اس گھر کی غربت اور افلاس کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر اس پیسے سے اس لڑکے کی خاطر مدارات کی جاتی ہے کھانے میں پلاؤ، پراٹھے اس کو کھلاتی ہے۔ جس میں یہ خیال تو ہے ہی کہ شادی اس لڑکے کے ساتھ ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عصمت نے اس زمانے کی مہمان نوازی کو بھی دکھایا ہے۔ چھوٹی بہن کھانا لے کر جاتی ہے اور یہ عورتیں چاہتی ہیں کہ لڑکا کچھ بولے لیکن وہ گم سم بیٹھا رہتا ہے۔ اب اس کی ماں اس کو مشورہ دیتی ہے کہ تم کچھ کرو ایسا کیسے ہوگا۔ وہ بوڑھی عورتیں حمیدہ کو مجبور کرتی ہیں کہ حمیدہ اس سے مذاق کرے اس کو راہ پر لائے۔ حمیدہ بہت حساس لڑکی ہے۔ اس کو اپنی غربت کا احساس بہت ہے۔ اور گلگلے کے کباب بنتے ہیں۔ یہاں سے کہانی بڑا بھیانک موڑ اختیار کر لیتی ہے۔ راحت کباب کھا لیتا ہے۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دور بیٹھی ہوئی عورتیں اس کو دیکھ رہی ہیں۔ کہ اب وہ کچھ بولے، کچھ کہے، لیکن وہ خاموش رہتا ہے۔ تب بوڑھی عورتوں کے کہنے پر حمیدہ جا کر پوچھتی ہے کہ دولہا بھائی تم نے کیا کھایا تو؟ اس وقت بڑا بھیانک جملہ کہتا ہے۔ جب کبریٰ کی ماں نے کہا کہ تم نے کیا مزے سے گلگلے کے کباب کھا لیے۔

"گلگلے ارے تو روز کا بھس کے بھرتے ہیں۔ میں [illegible] عادی ہو چلا ہوں۔

گلگلے اور بھوسہ کھاتے کھاتے"

دوسری طرف کبریٰ حمیدہ سے پوچھتی ہے کہ کیا کہہ رہے تھے تو اس کو بہن پر رحم آتا ہے۔ وہ جھوٹی تعریف کرتی ہے کہ کہہ رہے تھے کہ بھابی آپا بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔ کبریٰ پہلے سے زیادہ مسرور ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سوئٹر بنتی ہے۔ اور حمیدہ سے کہتی ہے کہ تم دے آؤ۔ حمیدہ باوجود برداشت کرنے کے کہتی ہے "آپا تم کو سوئٹر کی فرصت ہے۔ لیکن کبریٰ بڑا دردناک جواب دیتی ہے کہ میں تو چولھے کے پاس رہتی ہوں ـــ حمیدہ جس وقت سوئٹر لے کر جاتی ہے راحت اس کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہے کہتا ہے کہ تم نے بنایا ہے یہ سوئٹر، کہتا ہے کہ نہیں تو۔ تب وہ سوئٹر لینے سے انکار کرتا ہے۔ حمیدہ راحت سے کچھ کہہ تو نہیں پاتی لیکن سوچتی ہے کہ ـــ

"یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو پنگوڑے جھلانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ٹوٹا بٹن ٹانکنے اور پھٹا ہوا دامن رفو کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا..........."

پھر آگے چل کر عصمت ایک رسم کی طرف اپنے قلم کو لے جاتی ہیں۔ کبریٰ جس کے ذہن میں یہ سما چکا تھا کہ راحت اس کا ہونے والا شوہر ہے تو وہ خود ماں کے بجائے ملیدہ بھیجتی ہے (جو مشکل کشا کی نیاز کا ہے) اس جگہ عصمت نے تین رُخ دکھائے ہیں۔ ایک تو اس زمانے کی عورتوں کی رسم۔ دوسری چیز کبریٰ کا ذہن کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اور تیسرا مقصد جس کا مقصد حمیدہ کو راحت سے ملانا ہے۔ یہاں تعجب ضرور ہوتا ہے کہ عصمت یہاں اپنے آرٹ سے ہٹ گئی ہیں۔ اور اپنی طبیعت کے باوجود انہوں نے پردے پردے میں بات کہی ہے۔ یہاں پر وہ بہت کچھ قاری کی سمجھ پر چھوڑ دیتی ہیں کہ آگے کیا

ہوا۔ اور پھر یہ حمیدہ کی پلیٹ کہانی کو سمیٹ لیتی ہے۔ اور راحت چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کی شادی ٹھہر چکی ہے۔ اب عصمت دکھاتی ہیں کہ کبریٰ کو بخار رہنے لگا اور وہ خون تھوکنے لگی ہے۔ اور پھر ایک دن وہ آیا کہ سہ دری میں جاجم بچھائی گئی۔ محلہ کی عورتیں جمع ہوئیں۔ لیکن آج کبریٰ کا چوتھی کا جوڑا نہیں بلکہ اس کی ماں کبریٰ کا کفن بڑے صبر و ضبط کے ساتھ بیونت رہی ہے۔ آج اس کو امید ہے کہ دوسرے جوڑوں کی طرح سے اس کا یہ جوڑا رکھا نہ جائے گا۔ بلکہ اس کی کبریٰ اس کو پہن کر رخصت ہوگی۔

"چوتھی کا جوڑا" عصمت کا بہترین افسانہ ہے۔ اس میں ان کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ تشبیہ اور استعارے کے پردوں میں سب کچھ کہہ جاتی ہیں۔ ان کے یہی لطیف اشارے ان کا فن ہے۔ وہ الفاظ کے نازک اور خوبصورت استعمال سے انتہائی نازک جذبات کو بھی بخوبی ادا کر دیتی ہیں۔ اور الفاظ ہی کے ذریعہ جال بچھاتی چلی جاتی ہیں۔

یہ کہانی نہ نئی ہے اور نہ انوکھی۔ نہ جانے کتنی بار زندگی اسے دہرا چکی ہے۔ اکثر اس موضوع پر کہانیاں لکھی گئیں۔ متوسط طبقہ میں لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ آج بھی ایک مسئلہ ہے۔ لیکن یہ عصمت کا انداز ہے جس نے اس کہانی کو اتنا پر اثر بنا دیا ہے۔ ہم اس کے کرداروں کے دکھ درد میں اپنے آپ کو برابر کا شریک محسوس کرتے ہیں۔

ہمارے متوسط طبقہ کی زندگی میں نہ کبریٰ کی ماں کا کردار انوکھا ہے اور نہ خود کبریٰ کا۔ حمیدہ تو ایک ایسا درمیانی عنصر معلوم ہوتی ہے گویا عصمت نے کہانی کی درمیانی کڑیاں جوڑنے اور کرداروں کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ قائم کرنے کے لیے تخلیق کیا ہے۔

ہمارے سماج کے ایک مخصوص طبقہ کے لیے یہ کہانی اپنے بھرپور تاثر کا احساس دلاتی ہے۔

کبریٰ کی ماں ایک ماں ہے جس کے سینہ میں بیٹی کی ممتا، خاندان کی عزت، شوہر کی غربت، اور سماج کے بخشے ہوئے حالات درد بن کر سما چکے ہیں۔ اس کی آہ، سوز، تڑپ، جب اس کی پرخلوص شخصیت میں نمایاں ہوتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس کے غم میں برابر کا شریک جانتے ہیں۔

چوتھی کے رنگین جوڑے کے تصور میں اس کا ہاتھ سفید لٹھے سے ٹکراتا ہے تو اس کا سارا درد، تمناؤں کی ساری گھٹن، ماں کی ساری ممتا وہ آنسو بن کر اس کی بیٹی کے سفید کفن میں جذب ہو جاتے ہیں ▲▲

پھانس

طاہر نقوی
اے ۵۶۱/۳۰ گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

جب رات کی سیاہی صبح کی دلفریب روشنی میں بدلنے لگتی، گاؤں کے کچے پکے مکانوں کے نقوش دھندلاہٹ سے واضح ہوتے چلے جاتے اور وہاں کے لانبے لانبے نازک پودے صبح کی سرد ہوا سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے تو وہ اس وقت اپنی کچی کوٹھری میں ایک طویل انگڑائی لیکر اُٹھتا۔ ایک نظر اپنی شانو پر ڈالتا جو صبح کی نرم اور دُھندلی روشنی میں گہری نیند سوئی ہوتی۔ ایک لمحے اُسے جگانے کے بارے میں سوچتا لیکن وہ اس کی میٹھی نیند میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس خیال سے باز رہتا۔ دھوتی کاندھے پر ڈال کر وہ باہر نکل آتا اور مٹی کے لوٹے سے ٹھنڈا باسی پانی لیکر دو ایک چھپکے مارتا۔ رات کی باسی روٹی کھاکر وہ اپنے ٹھیلے پر رات میں چنی ہوئی ترکاریاں ترتیب سے سجاتا اور شہر جانے والی سڑک پر ہولیتا۔

رات کو وہ ہمیشہ دیر سے سوتا۔ گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر دن بھر شہر میں جو دیکھتا وہ بیان کرتا۔ اور رات گئے گھر لوٹتا۔ صبح جب وہ ٹھیلا لیکر شہر کی طرف جارہا ہوتا تو اُسے بار بار یوں محسوس ہوتا گویا ٹھیلے کے زنگ آلود پہیوں سے اُٹھنے والی چرخ چوں میں لوری کی سی کیفیت ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے بے خبر ہوجاتا۔ اس کے قدم خود بخود ہی بڑھتے۔ پھر کسی چھوٹے سے گڑھے یا پتھر پر پاؤں پڑجانے سے اس کو ایک دھچکا لگتا تو اُس کو اپنا دل ایک دم اُچھلتا محسوس ہوتا۔ وہ چونک کر آنکھیں کھولتا۔ پھر اس کیفیت سے نکلنے کے بعد وہ ہوشیار ہوکر آگے بڑھتا۔

شہر کو جانے والی سڑک صبح بڑی مصروف رہتی۔ دودھ والوں کی سائیکلیں، مچھلیوں کے ٹرک، باہر سے لڑکیاں لانے والے ٹرک، گاڑیاں، ٹھیلے، سائیکلیں ہر آن ہر لمحہ، ذرا سی غفلت سے حادثہ ہونا کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ اُس کو اس وقت مرنا پسند نہ تھا کہ اس کی شانو تو گھر پر اس کا انتظار کر رہی ہو اور وہ سڑک پر سُرخ سُرخ خون سے نہایا پڑا ہو۔

جب کوئی ٹرک سڑک چھوڑ کر کچے میں آجاتا اور دھول اُڑاتا زن سے گزر جاتا تو وہ، اس کا ٹھیلا اور اس پر رکھی ہوئی ترکاریاں، دھول سے اٹ جاتیں، وہ دھول کے اس ہیولے سے نکلتا تو کچھ دیر کمبخت اور ذلیل کی گردان کرتا رہتا۔ پھر ٹھیلے کے ایک کونے پر رکھی ہوئی ٹنکی سے پانی چلو میں لیتا اور سبزیوں پر چھڑک کر ان کی تازگی اور نکھار کو زندہ

کرتا۔ برسات کے دنوں میں تو وہ بہت احتیاط سے چلتا۔ اس لیے کہ ان دنوں میں ٹرک والے اس کے قریب سے اس طرح تیزی سے ٹرک نکال لے جاتے کہ گڑھے میں جمع شدہ پانی کی چھینٹیں اس کے کپڑوں اور کاروں پر گلکاری کر دیتیں۔ یوں وہ شہر کی چوڑی اور معروف سڑک پر آنکلتا۔ جہاں اس وقت کالج اور اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں گنگناتے، باتیں کرتے، ہنسی مذاق کرتے۔ سڑک پر چلتے نظر آتے۔ ان جوان لڑکیوں کو دیکھ کر جو اپنے جوان سینے سے موٹی موٹی کتابیں، کاپیاں لگائے آپس میں ہنسی مذاق اور باتیں کرتی چلتیں اس کو ہمیشہ اپنی شانو اتنی شدت سے یاد آتی کہ ایک لمحے وہ خود کو بھول کر ان لڑکیوں کے لباس میں اپنی شانو کو دیکھتا۔

اور کچھ دیر بعد جب اسے اچانک اپنے وجود کا احساس ہوتا تو غربت کے احساس سے اس کے منہ سے گہری آہ نکل جاتی۔ دوسرے لمحے یہ سوچ کر کہ شانو اگر ایسی لڑکی بن گئی تو شاید اس کی نہ رہے اسے کچھ اطمینان ہوتا۔

"میری شانو ایسی ہی بھلی" ــــــ وہ خود کو تسلی دیتا۔ غربت میں حقیقت سے فرار انسان کو کتنا سکون بخشتا ہے لیکن اس کے باوجود اس خیال کو دل سے نہ نکال پاتا کہ کاش شانو کے پاس بھی ایسے ہی عمدہ عمدہ لباس ہوتے اور کیوں کہ اس کے پاس یہ سب کچھ نہ تھا اور نہ امید کی کوئی کرن ہی غربت کے اندھیرے میں نظر آتی۔ وہ رفتہ رفتہ شہر کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگا۔ یہ جذبہ اس میں دن بدن قوی تر ہوتا گیا اور ہر لمحے اس نفرت کا زہر قطرہ قطرہ اُچھل کر اس کے دل پر گرنے لگتا۔

دن بھر وہ دھوپ میں کھڑا رہتا اور سوچتا کہ جب وہ شام گئے گھر لوٹے گا تو شانو اس کو دیکھ کر کھلکھلا اُٹھے گی۔ اُس کی تمام دن کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی اور اس کا دن بھر کی دھوپ میں جلسا ہوا بدن شانو کے قرب کی ٹھنڈک میں طمانیت حاصل کرے گا۔ ایک دوسرے کے قرب سے ان دونوں کے دلوں میں ہمیشہ اندھیرے مہرے کھیتوں کی سی خوشبو بس جاتی جو روح تک کو تازہ کر دیتی ہے۔

اس کی زندگی میں شانو کے قرب سے رسیلے پھلوں کے تازہ شگوفوں اور مہکتے پھولوں کی کچی کلیوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ پھر جب سورج کی الوداعی کرنیں کانپتے کانپتے دم توڑنے لگیں، زمین پر شام اُتر آئی اور وہ گھر واپس پہنچا تو شانو نے ایک نئی بات اس سے کہی۔

"راجو مجھے بھی شہر دکھا دے نا ــــ"

اس نئے اور اچانک سوال پر اس نے شانو کو غور سے دیکھا پر خاموش ہی رہا تو شانو جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔

"آج شہر سے ایک لڑکی آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں ایسی ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ بس دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ وہ میری سہیلی تو بن گئی ہے۔"

اُسے یوں محسوس ہوا جیسے فضا کی ساری تپش اس کے دل میں اُترتی جا رہی ہو۔ روئیں روئیں میں اُس کا احساس جاگنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے اندر سے نکلنے والے الفاظ پگھل پگھل کر فضا میں تحلیل ہونے لگے۔

شانو کے یہ الفاظ اس کے ذہن کی کسی انجانی سطح پر جم کر رہ گئے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے جب اگلے روز وہ تھکا ماندہ اپنے ٹھیلے کو لیے عدم اعتمادی سے قدم رکھتا گھر کے صحن میں پہنچا تو خلافِ معمول شانو اُس کے ٹھیلے کے پاس نہیں آئی۔ ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے اردگرد سناٹا سا محسوس ہوا، اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اور اُس کے وجود میں سے کوئی چیز نکل کر باہر جا پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کیا تو شانو کی آواز کان کے پردے پر کنکریوں کی طرح گری۔ شانو کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہم کسی کا احسان نہیں لیتے۔ تم پیسوں کے بدلے آم لے لو۔"

اس پر کسی دوسری لڑکی کی ہلکی سی ہنسی آئی۔

"تم ویسے ہی لے لو کیا میں تمہاری سہیلی نہیں ــ؟"

"نہیں ــــ ویسے ہی نہیں لوں گی۔ راجو کو آنے دو پیسے

اُس کے پاس ہوتے ہیں۔ بس آنا ہی ہوگا۔"

"راجو کون ہے؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

"راجو ـــــ!" شانو کی آواز سے حیا صاف ٹپک رہی تھی۔

"راجو، راجو ہے۔"

راجو شانو کی اس بات پر خود بھی مسکرایا۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ اس کی اپنی مسکراہٹ نہ ہو کسی اور کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر مڑھ لی ہو۔

"لو راجو آگیا ـــــ" شانو کے کہنے پر اس لڑکے نے بھی جھانکا۔

"یہ تو مرد ہے، مرد!" شہری لڑکی کے منہ سے اس طرح آواز نکلی جیسے اس کے منہ میں کوئی ذائقہ دار چیز گھل گئی ہو۔ راجو یہ سن کر جھاں تھا وہیں رہ گیا۔

"کیا شہر میں مرد نہیں ہوتے؟" شانو نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھولپن تھا۔ اس پر شہری لڑکی کا ہلکا سا قہقہہ اُبھرا۔

"ہوتے تو ہیں، مگر سڑے سڑے سے" اس لڑکی کے اس جملے کے پس منظر میں پوری شہری معاشرت اور وہاں کا ماحول چھپا بیٹھا تھا۔

اس لڑکی کے جاتے ہی شانو اُس کے پاس دوڑی دوڑی آئی۔ اُس نے دیکھا شانو کے ہونٹوں پر لالی لگی ہوئی ہے۔ شانو اُسے متجسس اور پُر اشتیاق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تجھے اس کی ضرورت نہیں شانو ـــــ"

شانو راجو کے لہجے کی بے رُخی اور ناپسندیدگی فوراً بھانپ گئی۔

"اتنی اچھی تو لگتی ہے" شانو نے شیشے کے ایک ٹکڑے میں دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "تجھے کیا پتہ شہر کی تمام لڑکیاں لگاتی ہیں، میری سہیلی نے بتایا تھا۔"

اُسی وقت شانو نے اُس کے سامنے شہر دیکھنے کی پھر ضد کی۔ اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"دکھا دوں گا ـــــ دیکھ لینا شہر بھی مگر تو خوش نہ ہوگی ـــــ

اری پگلی وہاں کیا ہے ـــــ؟ بناوٹ اور ملاوٹ کے علاوہ کیا دھرا ہے۔ وہاں تو خالص پانی بھی نہیں ملتا۔ اور انسان تو خالص ہوتا ہی نہیں ـــــ"

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اُس کی خاموشی میں اُداسی کا عنصر بھی شامل تھا۔ چوپال میں بھی چپ چپ ہی رہا۔ سب نے وجہ پوچھی، وہ ٹال گیا۔ بتاتا بھی تو کیا بتاتا۔

جب شہر سے اگلی شام وہ ٹھیلا لیکر واپسی کی سڑک پر آیا تو اس وقت بھی وہ خود اپنے خیالوں میں بھٹک رہا تھا۔ کبھی شانو کی خواہش اور کبھی اس کی شہری سہیلی کا خیال آجاتا لیکن آج تو اس قصور کے ساتھ نہ معلوم کیوں غصہ آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہر کی حدود سے نکل کر جلدی سے گاؤں پہنچ جائے تاکہ اسے سکون نصیب ہو۔ اسے مٹی کی کچی دیواروں اور چھپر کی چھت والی اپنی جھونپڑی کے سامنے شہر کی اونچی اور خوشنما عمارتیں ہیچ دکھائی دیں جہاں اس کے ہر جذبے سے اس کی جھونپڑی کا چراغ جلتا ہے۔ وہ شہر سے گذرتے ہوئے ان عمارتوں کو دیکھنے لگا اور جب اُسے خیال آیا کہ ان کے رہنے والوں میں خلوص نام کو نہیں تو وہ ان مکینوں پر ترس کھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچنے لگا اس کی جھونپڑی میں کم از کم خلوص اور اپنائیت کی خوشبو تو بسی ہوئی ہے اس میں رہنے والی شانو کا خیال آتے ہی اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ یکایک وہ موٹر کے ہارن سے چونک پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خیالات یوں بکھر گئے، جیسے ہار ٹوٹ جانے سے موتی بکھر جاتے ہیں۔ ابھی وہ کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ ہی اس کے کانوں سے یہ الفاظ ٹکرائے۔

"ذلیل ـــــ بیچ سڑک پر ٹھیلا لیکر چلتے ہیں جیسے ان کے باپ کی سڑک ہے ـــــ نامعقول!"

اور پھر موٹر تیزی سے ایک طرف نکل گئی، لیکن یہ الفاظ جیسے اس کے کانوں پر جم کر رہ گئے۔ خون کی مہین سی لکیر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ وہ گھر پہنچا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ شانو کی بیساختہ استقبالیہ مسکراہٹ اس کے

چہرے کو خون آلود دیکھ کر زخمی ہو گئی۔

"کیا ہوا ـــــ راجو کیا ہوا ـــ؟"

آج شانو نے شہر جانے کے لیے اس سے نہ پوچھا تھا آج گویا اُسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔

"تو شہر دیکھنا چاہتی تھی نا ـــ" اُس نے عجیب لہجے میں کہا ـــ میرے چہرے پر خون کی لکیریں دیکھ رہی ہے نا ـــــ یہی وہ سڑک ہے جو شہر جاتی ہے۔ شہر تو خون کا ایک بڑا سمندر ہے۔ ہم ایسے غریب اپنے خون سے شہر کو سجاتے ہیں۔ دیکھ شانو شہر دیکھ لے۔ جہاں غریبوں کے خون سے کوٹھیوں اور بنگلوں کے لیے مٹی گوندھی جاتی ہے ـــ"

شانو کچھ نہ سمجھی اور کبھی سمجھی تو صرف یہ کہ راجو کا دماغ چل گیا ہے۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے؟" وہ سسکنے لگی۔ آج جب شانو اُس کے سامنے رو رہی تھی تو وہ ایک نامعلوم قسم کا سکون محسوس کر رہا تھا۔

"شانو!" اُس نے محبّت بھرے لہجہ میں کہا ـــ" ارے یہ تو معمولی سی خراش ہے۔"

اُس کے لہجے میں یہ اچانک تبدیلی شانو نے بھی محسوس کی۔ اس وقت اس کے رگ و پے میں طمانیت رچی ہوئی تھی کیوں کہ آج شانو نے نہ شہر جانے کو کہا نہ اپنی شہری سہیلی کا تذکرہ کیا۔ وہ چبھن جو شہر سے گھر واپس آتے ہوئے اُس کے دل میں محسوس ہوتی تھی اس وقت غائب ہو گئی۔

"آج تجھے ایک چیز دکھاؤں۔" شانو یہ کہہ کر کوٹھری میں گئی اور فوراً ایک ہار ہاتھ میں لیے واپس آ گئی۔ ہار چوکھٹ سے لٹکی ہوئی لالٹین کی پیلی، زرد اور اُداس روشنی میں جھلملا رہا تھا۔

"اچھا ہے نا ـــ؟ میری شہری سہیلی آج پھر آئی تھی"

شانو کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی مسلسل خودفریبی کا جوالا مکھی آج اُبل پڑا۔ اُس کی سُرخ سرخ آنکھوں میں شدید غصّے کا احساس جھنجلاہٹ سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے اچانک ہار ایک طرف پھینک دیا جیسے یہ ہار نہ ہو بچھو ہو۔ جو فوراً ڈنک مار دے گا۔ شانو کو بھی ایک طرف دھکیل دیا کہ کہیں اُسے یہ ڈنک نہ مار دے اور خود چارپائی پر جا بیٹھا۔

"کم بخت......" کچھ دیر وہ جھجکا کیوں کہ اس کے منہ سے گالی نکلنے والی تھی۔ شانو زمین پر بیٹھی رو رہی تھی ـــ" ذلیل یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ جیسے یہ گاؤں ان کے باپ کا ہے۔"

"راجو، راجو یہ کیا کہہ رہا ہے۔" شانو کے گالوں پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔ دھیمی آواز میں بولی۔

"یہ ہار پہن کر میں تجھے اچھی نہیں لگتی تو اسے پھیر دوں گی" لہجہ میں مایوسی چھپی ہوئی تھی ـــ "لیکن تجھے یہ بتا دوں کہ گہنے پہننا عورت کی فطرت ہے۔" شانو کہیں غار میں سے بول رہی تھی ـــ مجھے اچھا لگا تو میں نے لے لیا۔"

خواہش کے باوجود اپنی بےبسی اور شانو کی فطری کمزوری کو بیک وقت محسوس کر کے راجو کے دل میں ایک سرد لہر سی چلی۔ لالٹین کی کمزور روشنی میں جھلملاتے ہار کو دیکھ کر اس نے پھریری لی پھر وہ شانو کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ہار اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ اسی لمحے تیز ہوا کے ایک جھونکے سے لالٹین کی کمزور لو پھڑپھڑا کر بجھ گئی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کلبلا گیا کہ یہ جھونکا شہر کی طرف سے ہی آیا ہے۔ وہ شانو کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ تو نہ دیکھ سکا مگر اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ اس نے بخوبی لگا لیا۔

"راجو ـــ!!!" شانو کے لہجے میں چھپی ہوئی مسرت محسوس کر کے راجو کے دل سے چھن سے آواز آئی۔ جس طرح گرم لوہے پر پانی کے چھینٹے ڈالنے سے آتی ہے ـــ ▲▲

ہر تخلیق پر اپنے نام کے ساتھ
آخر میں اپنا پورا پتہ ضرور لکھیے۔

محافظ

اسلم سلازار
آبگلہ گیا ۸۲۳۰۰۳ (بہار)

تیسرے دن بھی طوفان نہیں آیا۔
اور لوگوں نے نتھنے سکوڑ کر مسرت کی سانس کھینچی۔

—— شکر ہے .... آج بھی طوفان سے جان بچی!
مگر ہوا یہ کہ ساتھ ہی ساتھ بے چینی کی گرد بھی اُڑ کر اُن کے پھیپھڑوں میں بیٹھ گئی۔

—— مگر اُف ..... اے آسمان ...... کاش تو آج ٹوٹ پڑتا اور طوفان آجاتا کہ کم از کم پھر تو طوفان آنے کا خدشہ دل سے نہ لگا رہتا۔ آخر ہم اس طوفان کی نگرانی کب تک کرتے رہیں گے!

—— لیکن طوفان کے بعد بھی طوفان آسکتا ہے۔ اُمڈی ہوئی ندی دوبارہ اُبھر سکتی ہے۔

ندی اپنی وسیع آنکھ میں پوری طرح اُبھری ہوئی تھی۔ اور تیزی سے دوڑتا ہوا ..... بہتا ہوا پانی ...... گھر گھرا رہا تھا اور گاؤں کے کچھ لوگ کنارے سے تھوڑی دور پر کھڑے بہتی ہوئی دھاروں کا معائنہ کر رہے تھے۔

—— لیکن ....

اُس روز گاؤں کے چوپال میں سارے فیصلے ہو گئے تھے۔

—— "ندی کی دیکھ ریکھ کے لیے تم سب اپنی باری بنالینا۔" مکھیا بولا۔

—— "اور اگر اندھیرا ہوا ..... ؟" کسی نے پوچھا تھا۔

—— "تم اپنی لالٹینیں ساتھ رکھنا اور جو ہوائیں تیز ہوئیں .....؟"

—— "تو ہوائیں انہیں بجھائیں گی اور ہم انہیں جلائیں گے۔"

اور آج ہوائیں تیز تر تھیں۔ ہواؤں کی فوجیں اپنے مقبوضہ علاقہ میں دندناتی پھر رہی تھیں اور عورتیں دہشت کے دام میں اُلجھی ہوئی ...... اپنے مکانوں کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ کچھ آپس میں اس بلا سے بچنے کی تدبیریں سوچ رہی تھیں۔

—— بھلا اس ندی کا کوئی بھروسہ نہیں...... کب پھوٹ پڑے۔ چوپال میں کوئی بولا۔

— "لیکن اسے سنبھالنے کے لیے ہمیں کچھ تو کرنا ہی ہوگا"

" — سنبھالنے کے لیے ...... اسے سنبھالنے کے لیے ہمیں کسی کی بلی دینی ہوگی!" مکھیا نے کہا تھا۔

— "بلیدان ....." یکسر سب خاموش ہوگئے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں لکھی ہوئی الجھنوں کی تحریر پڑھنے لگے۔ اور مکھیا پھر بولا۔

"اور اس کا فیصلہ اسی وقت ہوجانا بہتر ہوگا"

سب خاموش تھے اور رات کی ناگن چپکے چپکے رینگ رہی تھی۔ ہوا کی رفتار ہر دم بڑھتی گھٹتی رہتی تھی۔

— "نہ جانے کب کیا ہوجائے!"

— "نہ جانے کب کیا ہوجائے ?!"

— نہ جانے کب کیا ہوجائے !!

کبھی کبھی جب آنکھیں آپس میں ٹکرا جاتیں تو جیسے رو رو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگتیں ....

— کیا یہ ہماری زندگی کی آخری رات ہے؟

تبھی بھیگی ہوئی ہواؤں کا ایک تیز جھونکا چلا اور وہ اپنے اپنے تنوں میں کانپ اٹھے۔

.... آخری رات ..... !

.... آخری رات ..... !!

مگر کوئی بولا ..... کوئی جیالا اور ساہسی کہہ اٹھا۔

— "سامنے کھڑی ہوئی موت سے اتنا ڈر کیا جائے ......

جاؤ، سب اپنے اپنے گھروں میں جاکر آرام سے سوجاؤ۔ جب مرنا ہی ہے تو اس قدر لرز لرز کر کانپ کانپ کر کیوں مریں۔ چلو ..... سب سو جاؤ کہ آنے والا یہ طوفان ہمیں ہماری نیند سے چرا لے جائے!"

— "ہاں ٹھیک ہی کہتے ہو!"

— "ہاں ہاں ...... ٹھیک ہی کہتے ہو ...... مرنا ہے تو اطمینان سے کیوں نہ مریں ؟!"

— "تو آؤ چلیں اور سو جائیں"

" — اور وہ جو ساحل کے محافظ ہیں .... اور ہواؤں کے تیز طمانچوں سے لالٹین کی لو بچانے میں مشغول ہیں؟"

— "نہیں محافظوں کی لاپروائی اچھی نہیں!"

— "اور ہماری ...... ؟"

"— آؤ !!"

"کیا خطرہ ٹل گیا — ؟" گھر آتے ہی دروازے پر کھڑی اس کی بیوی بولی۔

— "نہیں ..... !"

— "تو تم یہاں؟ — طوفان سے ایسی بے پروائی کیوں؟"

— "ہم اس سیلاب اور طوفان کے خوف سے گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتے۔ جب ہمیں مرنا ہی ہے تو کیوں نہ ان کا ڈر دل سے نکال پھینکیں اور مزے سے سو جائیں کہ جب کبھی یہ طوفان آئے تو ہمیں خبر بھی نہ ہو اور یہ ہمیں ہم سے ہی چرا کر کہیں دور لے جائے .... تو آؤ چلیں .... اور بے خوف ہوکر سو جائیں!"

— "ہاں سچ ہی کہتے ہو!"

— "تو چلو ......"

انہوں نے اپنے آپ کا رخ کمرے کی طرف کر دیا۔ چلتے چلتے جیالا بولا — "لختِ جگر کہاں ہے؟ ۔ .... سو رہا ہے کیا؟"

بیوی چونکی ......

— "لختِ جگر؟ ...... میں تو طوفان کے چکر میں الجھی تھی ...... ممکن ہے کمرے میں سو رہا ہو"

— "یہاں کہاں ہے وہ ؟!" کمرے میں داخل ہوکر جیالے نے چاروں طرف دیکھا۔ "طوفان کے خوف سے کہیں دبک تو نہیں گیا؟"

پھر لختِ جگر کی تلاش میں کمروں کمروں میں وہ چکرانے لگے — ہر ہر جگہ ..... ہر ایک گوشہ چھان مارا ..... مگر لختِ جگر لاپتہ تھا۔

—— لختِ جگر ...... کہاں ہے لختِ جگر ؟! ——

وہ چپ چاپ بولا اور جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ......

—— کہیں لختِ جگر کی ہی بلی ......

بکلخت جیسے وہ پاگل ہوگیا ...... اور جھپٹ کر دروازے کے باہر نکل گیا ......

—— لختِ جگر ..... لختِ جگر !

وہ اُمڈی ہوئی ندی کی طرف سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

—— میرا لختِ جگر ! ..... کہیں میرے لختِ جگر کی بلی تو کسی نے نہیں دے دی۔ ؟!

محافظوں نے اسے دیکھا اور ایک ...... بیڑی کا دھواں پھونکتا ہوا بولا —— " دیکھو! وہ چنگھاڑتی ہوئی اس طوفانی ندی کی جانب جا رہا ہے ...... کہیں ڈوب کر جان ہی نہ دے دے !"

—— " جانے دو ..... کہ یہ ہماری زندگی کا ضامن بن جائے گا "

—— " ہاں، جانتے ہو ..... یہ اُبھری ہوئی ندی کوئی بلیدان ہی چاہتی ہے ...... اور جیالا اپنی بلی ہی دینے جا رہا ہے "

—— " لختِ جگر ..... میرا لختِ جگر !! " وہ ندی کے ٹھیک کنارے جا پہنچا اور اچانک اس کے پیر زمین سے اکھڑ پڑے ......

—— " لو ..... وہ ڈوب گیا۔ اب سمجھو تو ندی اُتری اور ہماری جان اسی بلا سے چھوٹی !"

مگر ہوا یوں کہ چنگھاڑتی ہوئی ندی نے اپنے بندھ اسی وقت توڑ ڈالے اور رینگتی ہوئی گاؤں کی اور چل دی ...... اور فضا میں چیخ و پکار کی کبوتریں گھبرا گھبرا کر ...... پھڑپھڑا کر اُڑنے لگیں۔

...... اللہ ......

دم بھر میں محافظوں کا وجود ...... ناگ کے زہر کی مانند گاؤں کے روم روم میں پیوست ہوگیا۔ ▲▲

مظہر امام

اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر۔ ٹیلی ویژن سینٹر، سری نگر

ہر کھرا اس کسوٹی پہ کھوٹا ہوا
طاق پر رہ گیا اپنا پرکھا ہوا
ساحلِ صبح پر کشتیٔ نور تھی
بادباں کھل گئے تو اندھیرا ہوا
ہو گیا سرخ سے سرخ تر آسماں
فرش و دیوار کا رنگ پیلا ہوا
خون بوئے گئے، جسم کاٹے گئے
بے بہا، منفعت بخش سودا ہوا
کس سلیقے سے مہریں لگائی گئیں
لب جو کھولے کسی نے اچنبھا ہوا

تول مجھ کو، مجھے میزان میں رکھ
میں علامت ہوں مجھے دھیان میں رکھ
تند ہوتی ہوئی ہر لحظہ ہوا
اس کو بھی اپنے ہی احسان میں رکھ
شہر اور گاؤں کو ویرانی دے
موسمِ گل کو بیابان میں رکھ
کاٹ ہے جنبشِ ابرو میں بہت
اپنی تلوار کو اب میان میں رکھ
منزلِ آخرِ شہرت کے سفیر!
اپنے آغاز کو بھی دھیان میں رکھ

خلشؔ مظفر

قلعہ روڈ، نصرت بازار - حیدرآباد سندھ (پاکستان)

قافلہ سالار کے بچوں کی آنکھیں نم نہیں
صبر کا یہ آخری لمحہ صدی سے کم نہیں

آندھیوں کے ساتھ اب کے معرکہ آرائی ہے
اور خیموں کی طنابیں ٹوٹنے کا غم نہیں

دور تک پھیلی ہوئی ہے پیاس کی جادوگری
اور اس رستے میں کوئی چشمۂ زم زم نہیں

آشنا چہروں کے اس نفرت بھرے میدان میں
سر نہیں، سایا نہیں، سبزہ نہیں، شبنم نہیں

لوٹ جاتی ہے دریچوں سے ہوا یہ سوچ کر
اِن مکانوں میں ابھی کوئی دِیا مدھم نہیں

آنسوؤں کے ساتھ رخصت کر رہے ہو کیوں مجھے
یہ مرا یومِ شہادت ہے، شبِ ماتم نہیں

ایک ہی تحریر ہے سارے در و دیوار پر
رتجگوں کے زخم کا تو نیند بھی مرہم نہیں

جنگ جاری ہے، چراغوں کی ہواؤں سے خلشؔ
سرنگوں پھر بھی ہمارے شوق کا پرچم نہیں

ظہیرؔ غازی پوری

ریلوے آؤٹ ایجنسی - ہزاری باغ (بہار)

نظر سے سورج کا فاصلہ صرف ہات بھر تھا
مگر ہجاط ہی جسیمِ شاخِ نبات بھر تھا

سحر کی کرنیں تو کھڑکیوں میں شگاف بھر تھیں
گھنا اندھیرا شعور میں کائنات بھر تھا

وہ ایک تالاب جس میں پتھر بھی تیرتا ہے
جواز میرے مشاہدوں کا حیات بھر تھا

جو بند کمرے میں خوف کے جنگلوں سے گذرا
وہ حوصلہ مند تھا مگر اپنی بات بھر تھا

بدن کی لذّت کہاں ابھی کائنات بھر تھی
نگاہ کا لمس بس حدِ التفات بھر تھا

پہاڑ، ندی، شجر، سمندر فقط مظاہر
وقار تیرا ہماری بے مایہ ذات بھر تھا

خود اپنی دنیا کا اِک نظارہ بھی غیر ممکن
سفر ہمارے گمان کا کائنات بھر تھا

عجیب شئے تھی کِسی کی یادوں کی شعلگی بھی
بدن میں چنگاریوں کا طوفان رات بھر تھا

غلام حسین ساجد

۴۲ ایف عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن ۔ لاہور (پاکستان)

ملنے کی مدہوشی تو گھر ایسی ہے
لیکن کالی رات سمندر ایسی ہے
جیسے اپنا آپ اچانک دیکھا ہو
حیرانی کی دھوپ کسی پر ایسی ہے
آنکھیں دکھ سے گھائل ہوتی جاتی ہیں
محرومی میں شکل اتر کر ایسی ہے
جس کی رو سے سارے رشتے ناطے ہیں
دونوں میں کچھ چیز برابر ایسی ہے
میدانوں، شہروں کے موسم ایک ہوئے
باہر کی آواز بھی اندر ایسی ہے
بہتا پانی اوروں کو دہلاتا ہے
اور ہمیں ہر لہر پیمبر ایسی ہے
آیا ہے لاہور ہمارے حصے میں
جس کی ہر اک زیست مقدر ایسی ہے
ساجد زندہ رہنا ایک عبادت ہے
ورنہ یہ دیوار ہمیں در ایسی ہے

لطف الرحمٰن

ٹی، این، بی کالج ۔ بھاگلپور ۔ ۷

دل لٹا دشتِ محبت میں نظر سے پہلے
آرزو خاک بسر ہے مرے سر سے پہلے
میری راہوں میں ستارے نہ بچھاؤ کہ مجھے
منزلیں چھوڑ گئیں راہ گزر سے پہلے
راکھ کے ڈھیر میں کرنوں کو چھپا رکھا ہے
آگ اٹھے گی کسی دن مرے گھر سے پہلے
بند ہونٹوں میں یہی سوچ چھپی بیٹھی ہے
زخم پہنچے نہ کوئی دیدۂ تر سے پہلے
روتے روتے بھی تو تھک جاتا ہے انساں اک دن
بجھ ہی جاتے ہیں ستارے بھی سحر سے پہلے
کس پرندے کی تمنا میں رہی شاخ ہری
زرد رو ہو گئی موسم کے اثر سے پہلے
نشۂ زہر رگ و پے میں رواں ہے اب بھی
کس نے دیکھا تھا مجھے میری نظر سے پہلے

حکیم افتخار فخر

منڈی بہاؤالدین ۔ (پاکستان)

کھلا ہوا جو یہاں زہر ساعتوں میں ہے
اذیتوں ہی کا اب ہاتھ راحتوں میں ہے
ہوا ہی کیا جو خلاؤں میں کر رہا ہوں سفر
یہ چاند بھی تو بلا کی مسافتوں میں ہے
اب آفتاب کے اوپر کی سطح پر چلئے
زمیں کا سینہ غضب کی تمازتوں میں ہے
کہاں کی صبح ۔ یہاں تیرگی کا دشتِ بلا
گھرا ہوا ہے ابھی شب کی قباحتوں میں ہے
ہر ایک پھول ہے مغموم صحنِ گلشن کا
خزاں کا ہاتھ چمن بار نکہتوں میں ہے
اثر ہزار سہی غم کی حکمرانی کا!
مرا خیال خوشی کی عدالتوں میں ہے
کھلی رہیں مری آنکھیں کہ بند ہو جائیں،
سفر تو پیشِ نظر، دونوں صورتوں میں ہے
چلو مجھے ہی نہیں وقت اس سے ملنے کا
میں جانتا ہوں وہ ظالم تو فرصتوں میں ہے
اُڑی ہے ذات کے صحرا میں فخرؔ دھول بہت
وجود خاک ہوا، سوچ وحشتوں میں ہے

شاہد میر

گورنمنٹ کالج ۔ بانسواڑہ (راجستھان)

دیکھ اُٹھتے ہیں کیا بھنور مجھ میں
اے سمندر کبھی اُتر مجھ میں
میں ہوں اُجڑا ہوا سا ایک مکاں
ڈھونڈتے کیا ہو "بام و در" مجھ میں
جب سے موسم نے رنگ بدلا ہے
جی اُٹھا ہے کوئی شجر مجھ میں
در بہ در ڈھونڈتا ہوں میں جس کو
سو رہا ہے وہ بے خبر مجھ میں
جل اُٹھے گا الاؤ یادوں کا
برف پگھلے گی رات بھر مجھ میں
میں جو بھولے سے مسکراتا ہوں
کوئی روتا ہے پھوٹ کر مجھ میں
بہہ چلی جوئے آب آنکھوں سے
ابر برسا ہے ٹوٹ کر مجھ میں
دیکھ کر وسعتیں خلاؤں کی
پھڑ پھڑاتا ہے کوئی پر مجھ میں
جسم ہے میرا اک گھنا جنگل
اے پرندے بنا لے گھر مجھ میں
تو بڑی خوبیوں کا مالک ہے
کوئی "خامی" تلاش کر مجھ میں
زخمِ دل کھل کے آفتاب ہوا
دور تک ہو گئی سحر مجھ میں

پرکاش فکری

معرفت ۔ درزی محلہ، رانچی (بہار)

موج موج سے اُلجھے خواہشوں کے دریا میں
اور میں پھروں تھک کر تشنگی کے صحرا میں
ایک ان کہا قصّہ ہونٹ میں جلن بھر دے
آنکھ سے گریں موتی حسرتِ تماشا میں
میں صدائے زخمی سا ڈھونڈتا پھروں جس کو
وہ سکوت پنہاں ہو، منظرِ ہویدا میں
روشنی کے سینے میں درد ہو اندھیرے کا
زرد کی کسک جاگے سبز کے سراپا میں
وہ مری مسافت سے بے خبر ملے فکری
اس تلک اگر پہنچوں میں تلاشِ سایا میں

حصیر نوری

۳/۸ ۔ ایف، جوائنٹ کوارٹر، محمد پور ۔ ڈھاکہ

گمان ہم کو ہے دریاؤں پر سرابوں کا
زمیں کی خاک پہ مرقد ہے آفتابوں کا
قدم پڑا تھا کبھی ہم جنوں خرابوں کا
جو دشت تھا وہی اب شہر ہے گلابوں کا
ہر ایک شخص ہوا ہے شعورِ ذات میں گم
میں داد دے نہ سکا اپنے انتخابوں کا
تلا ہے درد کی میزان میں مرا ہی لہو
وجود مجھ پہ ہی توڑا گیا عذابوں کا
جو اضطرابِ محبت میں دل شکستہ ہیں
انہیں پہ فاش ہوا راز بے حجابوں کا
خیال تھا کہ ترے بام تک پہنچ جائیں
فلک سے پست رہا زینہ اپنے خوابوں کا
ذرا میں آگے بڑھا تھا بصد خلوص مگر
سوال اس نے اٹھایا مرے جوابوں کا
میں اس دیار میں اک پل بھی جی نہیں سکتا
کہ سایہ دھوپ میں جلتا ہے کامیابوں کا
ہر ایک صفحے پہ تصویر ہے اپنی حصیر
نہ جانے حشر ہو کیا آج کی کتابوں کا

خاطر حافظی

محلہ شاہ معروف، گورکھپور

پیلے شجر کی چارسو رنگت ہوا میں ہے
کیا دلکشی سی آج سہانی فضا میں ہے
باہر نہیں ہے کوئی بھی اُس کے مکان سے
ہر چیز اختیار کی صاحب، خُدا میں ہے
شیشے کے اس مکان پہ پتھر چلائیے
لیکن وہ ایک چیز جو میری دُعا میں ہے
آنکھوں سے دُور خواب کے منظر نہ دیکھئے
مت سوچئے زمین ہماری خلا میں ہے
مانا شکستِ خواب ہوا، پھر بھی کیا ہوا؟
عزمِ بلند آج بھی میری صدا میں ہے

واجدہ تبسم

دوردرشن کیندر۔ سری نگر، کشمیر، ۱۹۰۰۱

حاصل ہو کیا سکوں تہِ چرخِ کہن ابھی
گردش میں آسماں ہے زمینِ وطن ابھی
رکھتی ہوں دل میں جراَتِ اظہارِ آرزو
دیکھی نہیں ہے ان کی جبیں پر شکن ابھی
میں تو ازل سے حُسنِ ازل پر ہوں شیفتہ
قائم ہوا ہے رابطۂ روح و تن ابھی
میرا جنونِ عشق اسیرِ خرد نہیں
ہر چند تار تار نہیں پیرہن ابھی
بھٹکا ہوا خیال ہے میرا ترے بغیر
رہ کر وطن میں بھی ہوں غریب الوطن ابھی
روشن جگر کے داغ بھی ہیں دل کے ساتھ ساتھ
پھیلی ہوئی ہے آگ چمن در چمن ابھی
مجھ سے مرے مزاج کی رنگینیاں نہ پوچھ
رکھتی ہوں شوقِ شرکتِ ہر انجمن ابھی
تیرا ہی نام ہے ابھی موضوعِ گفتگو
تیری طرف ہے شعر میں روئے سخن ابھی
پوچھیں نگارِ صبحِ تبسم اُسی سے ہم
دیکھی نہیں اُمید کی جس نے کرن ابھی

نازؔ قادری

شعبۂ اردو، ٹی این کالج، بھاگلپور - ۸۱۲۰۰۷

آشنا کہئے مجھے، ناآشنا کہئے مجھے
یعنی اپنے آپ سے بھی کچھ جُدا کہئے مجھے

دشتِ محرومی کا لمبا راستہ کہئے مجھے
عمر بھر جو طے نہ ہو وہ فاصلہ کہئے مجھے

میں شکستہ تن اب اپنے آپ پر بھی بوجھ ہوں
آہِ بے تاثیرِ مُفلس کی قبا کہیے مجھے

مجھ کو سورج کی طلب میں راکھ کی قسمت ملی
آرزو کے دشت میں بُجھتا دیا کہئے مجھے

جس کے بوڑھے جسم سے لپٹا ہے صدیوں کا لباس
معبدِ اخلاص کا وہ دیوتا کہیے مجھے

تہہ بہ تہہ جس کے بدن پر جم گئی ہو کائیاں
کشتیٔ حالات کا وہ ناخُدا کہیے مجھے

میرے چاروں سمت روشن ہے عجب رنگِ رواں
ٹوٹتے لمحات کا اِک سلسلہ کہئے مجھے

میں کہ اپنے آپ میں گُم ہوں نہ اوروں پر عیاں
لفظ بے معنی، فقیرِ بے صدا کہئے مجھے

عمر بھر اپنے تعاقب میں بھٹکتا ہی رہا
نازؔ! اِک کربِ مسلسل کا صلہ کہئے مجھے

منوہر لال ہادیؔ

۱۳۷ سیکٹر تھرڈ - آر کے پورم، نئی دہلی ۲۲

چشمِ ادراک کو ہر راز عیاں لگتا ہے
ایک دریا سا ہر اِک شے میں رواں لگتا ہے

جس کو بھی دیکھیے پرواز پہ مائل ہے یہاں
ذرّے ذرّے میں کوئی ذوقِ نہاں لگتا ہے

جس کی تعریف کے پُل باندھ رہی ہے تاریخ
ہم کو وہ وقت ہی بے نام و نشاں لگتا ہے

وہ جو رقصاں ہے چمن میں بُتِ تشکیک نہ ہو
ایک اِک پھول ہی تصویرِ گماں لگتا ہے

تم نے کیا سوچ کے ڈھائے ہیں در و بامِ ضمیر
ہم کو اس بات میں امکانِ زیاں لگتا ہے

یہ عجب جنگ چھڑی ہے مِرے دل میں کہ مجھے
شہر کا شہر ہی بے امن و اماں لگتا ہے

خون رِستا ہے ترے حرف و بیاں سے ہادیؔ
درد کی بات نہیں، غم بھی جواں لگتا ہے

احمد شناس
ریڈیو کشمیر، جموں

ساتھ اپنے اِک آوازۂ دستک ہی لیے چل
مجھ کو تو مرے بابِ نفس تک ہی لیے چل

اِک روز اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھ
دِل کے شرر کو جامۂ خس تک ہی لیے چل

پھر نوچ لیں گے جسم کے اعضاء بھی راستے
تو دوستی کے بوجھ کو بس تک ہی لیے چل

تجھ پر کھلیں گے باب نئے حرف و صوت کے
کورے بدن کو لمسِ ہوس تک ہی لیے چل

کملا نہ جائیں خواہشیں اپنی ہی دھوپ میں
کچھ ذائقہ گلوں کا مگس تک ہی لیے چل

یوں صفحہ صفحہ ڈائری ناموں سے تو نہ بھر
احمدؔ کو کوئی ایک برس تک ہی لیے چل

ط یہ اِک غزل ہے سراپا عروض داں کے لیے (مدیر)

اِقبال انجم
للا پورہ، ڈونگر پور (راجستھان)

جس کا نہیں جواب کوئی، وہ صدا ہوں میں
دشتِ طلب میں کب سے اکیلا کھڑا ہوں میں

کس کی تلاش ہے مجھے اپنے وجود میں
وہ کون کھو گیا ہے جسے ڈھونڈتا ہوں میں

یہ میں نے کب کہا ہے کہ ٹھہرو، مگر سنو
دیکھو کبھی تو مُڑ کے، کہاں رہ گیا ہوں میں

ہے کس کا انتظار، تجھے راہِ رفتگاں
تیری حدوں سے دور بہت جا چکا ہوں میں

مدّت کے بعد لوٹ کے گھر آ گئے بھی تو کیا
اب سوچنے لگا ہوں، کوئی دوسرا ہوں میں

ایک طویل کہانی

ہرچرن چاولہ
اوسلو۔ ناروے

آج کل پھر میں دو حصوں میں بٹ گیا ہوں۔ کئی بار کئی حصوں میں بٹ جاتا ہوں اور وہاں بھی پہنچ جاتا ہوں، جہاں میں نہیں ہوتا۔ بس میں چڑھتا ہوں تو کوئی دوسرا شخص بھی مجھ سے کندھا بھڑا کر اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر "پہلے آپ" کہہ کر مجھے راہ دے دیتا ہے مگر میں کنکھیوں سے دیکھ کر محسوس کر لیتا ہوں کہ وہ بھی میرے ساتھ بس کے اندر آیا ہے۔ بس میں وہ میرے پاس ہی بیٹھتا ہے۔ میں کھڑا رہتا ہوں تو وہ بھی پاس ہی کھڑا رہتا ہے۔ میں بس کے جھٹکوں سے ہلتا رہوں تو وہ بھی ہلنے لگتا ہے۔ کوئی اکیلی خالی سیٹ دیکھ کر میں خوش ہوتا ہوں کہ اب اس سے جان بچی۔ اب وہ کس طرح میرے ساتھ بیٹھ سکے گا مگر وہ ظالم میرے سر پر آ بیٹھتا ہے یا میری گود میں اور ہم ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی اناڑی نے میری تصویر کھینچتے ہوئے کیمرے کا لینس (Lence) ہلا دیا ہو اور مجھے ایک سے دو یا کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہو۔ کام کرتے ہوئے یا کوئی چیز اٹھاتے ہوئے میرے ہاتھ کے ساتھ کوئی اور ہاتھ بھی آگے بڑھتا ہے۔ یہ مددگار ہاتھ میرے ذہن کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ کیونکہ یہ میری سوچوں کی دنیا میں بلا اجازت گھس آتا ہے۔ اور اس میں اتھل پتھل سی مچا دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں لوہے کی وہ مورتی ہوں جو کسی مندر کی دیواروں میں لگے، چھپے ہوئے مقناطیسوں کی مدد سے بیچ مندر ہوا میں معلق کھڑی ہے۔

اور پجاری لوگ میرے نام پر شردھالو لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ میری کوئی رات بھولے بھٹکے سے اگر کبھی رنگین ہو جاتی ہے تو یہ شخص مجھے میری محبوبہ کی باہوں کی پناہوں میں بھی چین کا سانس نہیں لینے دیتا اور بالکل ہمارے پہلو میں آکر دراز ہو جاتا ہے۔ میں اسے گروپ سیکس کا لیبل لگا کر بھی اپنے دل کو نہیں بہلا سکتا ہوں نہ ہی کبھی عیاش نواب کے پلنگ تلے چھپے ہوئے کسی چکولڑکے کی معصوم ہنسی ہنسنے سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ کیونکہ وہ میرے ذہن کے سب احساس سلب کر کے میرے جسم کی تمام حرکتوں کا ساتھی بن بیٹھتا ہے۔ اس نے میرے لیے، میری اپنی پہچان مشکل بنا ڈالی ہے۔

رات کے خوابوں میں اپنے ساتھ یہ جانے مجھے کہاں کہاں لیے پھرتا رہتا ہے۔ صبح کی کسلمندی کو میں رات کی بے آرامی پر محمول کر کے دل کو بہلانا چاہتا ہوں مگر باتھ روم کا شیشہ میرے جسم پر لاسوں کے نشان دکھا کر مجھے پھر سوچوں کی دنیا میں لا پٹکتا ہے۔ میں اس پردیس میں

مچھروں اور کھٹملوں کی غیر موجودگی کے باوجود، انہیں دو چار گالیاں دے کر اپنے روزمرہ کے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ وہی صبح کی حاجاتِ ضروری، پھر کھانا اور کپڑے پہن کر کام پر نکل جانا۔ رات کے خوابوں کو میں جھٹلا سکتا ہوں مگر دن کے خوابوں سے کیسے آنکھ بند کر لوں؟ دن کو اپنے سامنے جگہ جگہ اس کی موجودگی سے کیسے انکار کروں؟

آج کل کام پر میرا شیف مجھے کئی دفعہ ٹوک چکا ہے کہ میں کام دھیان سے نہیں کرتا۔ اُسے ڈر ہے کہ میں ایسے تو کبھی دن مشین سے اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھوں گا۔

میں نے اپنے ہاتھ کٹوائے ہیں۔ ننگی پیٹھ پر کوڑے بھی کئی بار خوشی خوشی کھائے ہیں۔ یہ تب کی بات ہے۔ جب کوڑے مارنے والے یا میرے ہاتھ کاٹنے والے ہاتھ پوتر اور صاف ہوتے تھے جو میرے جسم کی گناہ آلود چمڑی اور ذہن کی ٹیڑھی سوچوں کو چھیل ڈالتے تھے۔ اور میں پھر ایک "اپنا آپ" ہو جاتا تھا اور تب میرے اُس "آپے" کی پہچان ہوتی تھی۔ جیسے سونا آگ سے تپ کر نکلتا ہے تو اُس کی الگ اور بھرپور شان اور پہچان ہوتی ہے۔

میں ہاتھ کٹوانے کو تیار ہوں۔ میں ہنٹر کھانے کو تیار ہوں۔ میں اپنے گناہوں کو سرِ عام تسلیم کرتا ہوں، مگر جن ہاتھوں نے ہنٹر تھام رکھے ہیں وہ میرے ہاتھوں سے زیادہ کالے، خون آلود اور گناہ زدہ ہیں۔ پہلا تو دھوبی کے کپڑے کی دھر ٹیک ہے۔ اُس کے بعد تو میرے من کا میل صاف ہو جانا چاہیے۔ اُس کے بعد تو دنیا کا کوئی گناہ مجھے اپنی جانب راغب نہ کر سکے۔

میرا شیف کہتا ہے۔ مجھے کام کرتے ہوئے بڑبڑانا نہیں چاہیے۔ بکتا ہے۔ میں کب بڑبڑاتا ہوں۔ میں تو نہایت تندہی اور خاموشی سے کام کرتا ہوں۔ میں اُسے ہر بار جھٹلا دیتا ہوں۔ اُس کی مسکراہٹ کو چبھتا ہوا محسوس کر کے اُس کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہوں۔ مگر شام کو نہاتے ہوئے میرے باتھ روم کا آئینہ میرے ننگے جسم پر ہنٹروں کے نشان دکھا کر مجھے شرمندہ کرنا چاہتا ہے ـــــ میں پوچھتا ہوں شرمندہ مجھے ہونا چاہیے یا انہیں جنہوں نے میرے جسم پر یہ نشان لگائے ہیں۔ میں غصے میں شیمپو کی بوتل شیشے پر دے مارتا ہوں۔ شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے ہر ٹکڑہ میرے جیسا ایک مظلوم انسان ہے۔ مگر یہ کیا ـــ مجھے ہر ایک کے ہاتھ میں خنجر، تلوار یا نیزہ بھی نظر آ رہا ہے۔ تیز اور خیرہ کن ـــ ▲▲

وھسکی اور پرندے کا گوشت

احمد داؤد

اے۔ ۳۶۱، موہن پورہ۔ راولپنڈی (پاکستان)

کھڑکی کھلتے ہی شہر کا شور کمرے میں پھیل گیا۔

دور گاڑھے سیاہ سمندر کی پشت پر آسمان ہتھیلیاں ٹکائے یوں جھکا تھا کہ جیسے گرنے سے بچنا چاہتا ہو۔ سمندر اور آسمان کے اس طویل ملاپ نے ایک محوف بنا رکھی تھی جس کے بیچوں بیچ پھیلے بے انت خلاء میں انگنت پرندے اُڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی اُڑان اتنی نیچے ہو جاتی کہ لہروں کی زنجیروں میں اُلجھنے کا اندیشہ پھوٹ پڑتا۔ اور کبھی اتنی قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر ان کی پرواز کے اجتماعی آہنگ کو چھو لیتا۔ لیکن جب وہ ہتھیلیوں پہ ناچتی پھڑپھڑاہٹ کو دبوچنے کی خاطر / فالتو پر توڑنے کی خاطر انگلیوں کو حرکت دیتا / سازشی انداز میں ہاتھ بڑھاتا تو پرندے خم کھاتے، پہلو بچاتے کھلے آسمان کو نکل جاتے۔ اس لمحے وہ بے چینی سے آنکھیں موند کر بے بسی سے کندھے جھٹک دیتا۔

کھڑکی کھلتے ہی کمرہ آوازوں سے بھر گیا۔

اُس نے کندھے سے لگی دوربین سے پرندوں، انسانوں، گاڑیوں اور مصروف زندگی کے حجم کو پھیلا کر دیکھا اور فوراً دوربین آنکھوں سے ہٹا لی۔ پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ گاڑیوں کے ہارن، مصروف لوگوں کا شور اور ہزاروں انسانی الفاظ جو لبوں سے طلوع ہو کر فضا میں غروب ہو رہے تھے۔ اسے بے بسی کی دلدل میں گھسیٹ رہے تھے۔ آوازیں چاروں اور اپنے نقش بناتی گونجتی رہیں۔ کمرے کی کارنس آوازوں سے بوجھل ہو کر ایک طرف کو جھک گئی۔ گلاس کی تہوں میں شور جمنے لگا۔ پانی سے بھرا جگ جو الکوحل سے گلے ملنے کو بے تاب تھا آوازوں کے بھنور چھوڑتا رہا۔ تپائی، تصویر زدہ فریم، پردے، کرسیاں، کیلنڈر، آوازوں میں تحلیل ہو گئیں۔ اور وہ ان کے درمیان اکیلا کھڑا میرا منتظر تھا۔

کھڑکی کی دہلیز پہ کہنیاں ٹکا کر اس نے گردن باہر نکالی۔ اور نیلی خلاء کے طشت پہ تیرتے پرندوں کو دیکھ کر بولا۔

"پرندے ...... کیا ہمیں ان جیسی آزادی نہیں مل سکتی؟"

دائیں طرف کی بلند و سیع عمارت کے کونے سے پرندوں کی ایک ڈار نکلی اور

اور اس کے غلام جذبوں کی رسی کو جھنجھوڑتی سمندر کے ماتھے پہ بنی شکون کی جانب پھیل گئی۔

"اگر میرے پر ہوتے تو ....؟"

نیچے سڑک پر نگاہ پڑتے ہی اس کا بدن کانپا۔ وہ ساتویں، آٹھویں، دسویں، سولہویں پتہ نہیں کتنویں منزل پہ تھا۔ میں اسے بتلائے بغیر کہ میں کس منزل پہ رہتا ہوں اسے بٹھا کر وہسکی لینے گیا تھا۔ نیچے سڑک پہ بسیں اپنے اصل سائز سے کہیں چھوٹی کہیں کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ گاڑیوں کا دھواں بندے بشر اور معروف زندگی اپنے چھوٹے پن کو چھپائے سڑک کی رانوں پر گندے مواد کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس نے سڑک کی آخری حد تک نگاہ دوڑا کر میرے ہونے کا احساس کرنا چاہا۔ مگر ہزاروں لوگوں کے درمیان وہ مجھے کیسے پہچانے گا...... ممکن ہے وہسکی کی مہک اسے میری موجودگی کی شہادت دے دے۔ مگر وہسکی ...... یہ بھی تو نیک لوگوں کی طرح نایاب ہو گئی ہے....

ایک طویل گہرا سانس لے کر اس نے دوربین مضطرب آنکھوں پہ رکھی اور ننھے ننھے پرشور متحرک نقطوں میں شامل ہو گیا۔ آنکھیں زندگی کے دریا میں ڈوبتی ابھرتی بس اسٹاپ پہ کھڑی لڑکی کے شانوں پہ جا ٹکیں۔ ہاتھوں میں پکڑی فائلیں اور الم زدہ چہرے کو گھورتے ہوئے اس کے قریب جا پہنچا۔ لڑکی نے اس کی سانس کی دھار اپنی گردن پہ گرتے محسوس کی۔ اوپر تلے کئی دھماکے ہوئے، خوف زدہ لہو روتی آنکھوں پہ یقین کرتے اس نے سمندر اور آسمان کی کھوں کے درمیان پھیلے اڑتے پرندوں کو دیکھا۔ زخمی پرندے پتوں کی مانند سڑکوں پر گر رہے تھے۔ دوربین آنکھوں پہ جا چڑھی۔ سارا منظر ٹھہر گیا۔ زندگی کا شور زمین کے سینے سے چپک گیا۔ صرف سامنے کی عمارت کے پہلو میں کھڑے مجاہدوں کی حرکت زندہ تھی۔ مرتے ہوئے پرندوں کو انہوں نے سمیٹا۔ ہوا میں چند فائر کئے اور بس اسٹاپ کی طرف چل دیئے۔

"شاید اسلحے کی آزمائش ہو رہی ہے" وہ بڑبڑایا —

"ہنستے لوگ اور گلیاں اسلحے کی آزمائش کے لئے بے حد مناسب ہیں، مگر پرندے ..." اس نے لمحہ بھر کے لئے سمندر اور آسمان کی مشترکہ سرحد پر نگاہ دوڑائی۔ جہاں پرندوں کا ہجوم تھا۔

"کیا آسمان تلے ان پرندوں کو آزادی میسر ہے؟ اگر میرے پر ہوتے تو یقیناً اچھا ہوتا۔"

اس نے گردن موڑی اور بس اسٹاپ کو اپنے فوکس میں لے لیا۔ سڑک سے مجاہدوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لڑکی نے بس اسٹاپ کی چار دیواری میں پناہ لینی چاہی مگر اس کے قدم اٹھاتے ہی وہ پہنچ گئے۔

دوربین کے شیشوں پہ الم زدہ چہرہ اور بکھری فائلوں کی گرد جمنے لگی۔

"وہسکی، پرندوں کا گوشت، نوخیز لڑکیاں، ہمارے مجاہدوں کی مرغوب غذا ہے۔"

یونیورسٹی کی کینٹین میں بحث کرتے وقت وہ اپنے اس مدمقابل سے کہنے لگا۔ جو راشن اور محفوظ کیریر کی خاطر مجاہد بننے جا رہا تھا۔

"لیکن بھاگتے وقت جرابیں، جانگیئے اور معشوقوں کے خط بھی خندقوں میں چھوڑ آتے ہیں۔"

"تمہیں ان میں کس چیز پر اعتراض ہے؟" مدمقابل بولا۔

"مجھے صرف اس اسی فیصد پر اعتراض ہے جو ہم اپنے زوال پہ خرچ کرتے ہیں۔"

"گویا تمہیں اسی فیصد کا افسوس ہے" مدمقابل زور سے ہنسا اور کہنے لگا —

"بھلے آدمی — اس سرمائے سے تو ہم اپنے لئے شہادت خریدتے ہیں اور بچ جائیں تو تمغہ۔"

"لیکن فتح نہیں خرید سکتے"۔ وہ بولا۔

"ہونہہ ۔۔!" مدمقابل نے غصّے سے کہا اور پھر کینٹین میں داخل ہوتی لڑکیوں کی ٹولی کو دیکھ کر بولا ۔

"جب میں واپس آؤں گا تو یہ لڑکیاں میرے پیچھے تتلیوں کی طرح اُڑیں گی' میں اللہ کے خواب کا مجاہد ہوں گا۔ ہیرو ہوں گا۔ ایک نمبر ۔۔"

"اور جب تم محاذ پر اپنے فرضی دشمنوں سے لڑ رہے ہوگے تو تمہاری نسل کی افزائش دوسرے لوگ کر رہے ہوں گے۔"

"بکومت ۔۔۔!" مدمقابل بپھر گیا۔ "تم میری متوقع اولاد کو حرامی کہہ رہے ہو۔"

"ارے یار ناراض کیوں ہوتے ہو۔ غازی یا شہید کہلانے کے لیے حرامی حلالی کی شرط نہیں ۔۔۔ بہتر کیریئر لازمی ہے۔ سڑک پر آدمی حادثے میں مر جائے تو حرام موت۔ ہسپتال کے بستر پر جان نکلے تو انتقال۔ اور اگر کیریئر کی تاریک راہ میں قتل ہو جاؤ تو شہید ۔۔ واہ سبحان اللہ۔"

"تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ پاگل ۔۔۔ غدار ۔۔۔ الّو کے پٹھے ہو۔"

مدمقابل بات ادھوری چھوڑ کر لڑکیوں کے پاس جا بیٹھا۔

شیشے میں جان پڑ گئی اور بکھری خاموشی سے کاغذ اُڑ اُڑ کر لڑکی کے دور ہوتے بچوں کے سینے پر چپکتے رہے' معروف زندگی انہیں روندتی آگے بڑھتی رہی ۔۔ دوربین کے زاویے بکھرے کاغذوں کو اپنی گرفت میں لینے لگے۔ سڑک پر پانچ سالہ منصوبے بکھرے پڑے تھے۔ سلطانی گواہوں کے نام لڑھک رہے تھے۔

اس نے ہجوم کے درمیان مجھے ڈھونڈنا چاہا' کئی چہروں پہ میرا شک کیا' کئی شانوں کو میرا شانہ سمجھ کر ہلایا مگر ناکام ہو کر کمرے میں لوٹ گیا۔ کھانا کھانے سے پہلے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دور تک پھیلے آسمان پہ قریب آتے پرندوں کو دیکھا اور پھر اپنے دل میں مجھے کوستے ہوئے کرسی پہ بیٹھ کر اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب بازار کے کسی کونے سے پھر فائر ہوگا۔ ایسے موقعوں پر ایک عجیب بے بسی کا احساس اس کے اندر پھوٹ پڑتا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر وہ مجھ سے وہسکی منگواتا اور بے تحاشہ پینے لگتا۔ بے بسی اور ذلت کا یہ احساس صرف ان موقعوں پہ جنم لیتا جب کوئی سانحہ گزرتا۔ ایک دفعہ اس کے دھان کے کھیتوں میں اس کے گاؤں کے چوکیدار گھس آئے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے ...... خیر جانے دیجئے۔ وہ جب خود اس المیہ کو فراموش کرنا چاہتا تو ہم اسے کیوں دہرائیں۔ اس نے کئی دفعہ کوشش کی' انا الیوں کے محرکات کے بارے میں سوچنا چھوڑ لیکن ناکام رہا۔ آدمی کے ہونے کا جواز تو سوچنے میں ہے۔ اور جب وہ اپنے ہونے کی شہادت دوسرے کو دیتا تو مکروہ ضابطوں کا خوف اسے بے بس بنا دیتا۔ دراصل وہ قسطوں میں ہلاک ہو رہا تھا۔

پچھلے دنوں جب اسے میں یہ بتلائے بغیر کہ میں کونسی منزل پہ رہتا ہوں اسے اپنے کمرے میں لایا تو وہ کہنے لگا۔

"تم آسمان کے بہت قریب رہتے ہو۔ یہ پرندے جنہیں دیکھ کر آزادی کی اُمنگ اُبھرتی ہے کیا اس آسمان تلے واقعی آزاد ہیں"

میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ۔۔۔

"تم نے وہ تازہ ریگولیشن نہیں پڑھا جس میں پرندوں کا ذکر اور آسمان کی طرف دیکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔" میں نے اسے اخبار تھمایا تو وہ اسے مروڑتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

"لوگوں کی گردنوں پر اتنے بھاری پتھر رکھے گئے کہ اب وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھ سکتے۔ اور پرندے ......" اس نے کھڑکی سے پرے کھلی فضا کو تکتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ایک ایک کر کے ختم کر دیے جائیں گے؟ اور ہم جو یہ سب کچھ جانتے ہیں اظہار نہیں کر پاتے۔"

"لیکن ہمارے مخاطب کون لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اخبار کا گولہ بنا کر نیچے سڑک پر پھینک دیا اور کہا۔

"یہ تمام لوگ جو آنکھیں پاؤں پہ دھر کر چلتے' جو ایک دوسرے

سے خوفزدہ ہیں، جو اظہار چاہتے ہیں لیکن ڈرتے ہیں کہ سننے والا قومی سلامتی کے نام پر اسے پھنسوا نہ دے۔

میں زور سے ہنسا ——— "قومی سلامتی، یہ بھی خوب چیز ہے؟"

اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولا ———

"عصمت فروش عورت کی انا جو بگڑ جائے تو عصمت دری کے الزام میں پکڑوا سکتی ہے۔ ہماری قومی سلامتی بھی اسی قسم کی چیز ہے۔"

"تو پھر خرابی کی جڑ کہاں ہے؟"

"کسی زمانے میں معلوم تھی، لیکن اب بھلا بیٹھا ہوں۔" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مدھم لہجے میں بولا ———

"اصل میں بات یہ ہے کہ تاریخ کے سفر میں آدمی کو اپنی کم مائیگی، اپنے حقیر پن کا احساس ہو جائے تو اسے مر جانا چاہیے مگر ..." وہ آہستہ سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا ——— "ہمارے اختیار میں یہ بھی نہیں۔"

کھڑکی سے باہر پرندوں کی ایک ٹولی گزری، ان کی پھڑپھڑاہٹ کے تنکے کمرے میں بکھر گئے۔ ہم دونوں شکست اور ندامت سے ہنسنے لگے۔

عمارت کی سیڑھیوں پہ کوئی آواز اُبھری اُس نے سمجھا کہ میں آ گیا ہوں، جلدی سے اُٹھ کر اُس نے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ کوئی شخص نیچے جا رہا تھا۔ مایوسی سے پلٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور دوربین آنکھوں سے لگا کر نیچے سڑک پہ میری تلاش کی خاطر ہجوم میں شامل ہو گیا۔

پرندے کبھی اتنے نیچے آ جاتے کہ کھمبوں کی تاروں سے اُن کے پَر اُلجھ جاتے۔ ان کی پھڑپھڑاہٹ معروف زندگی کے ساحل پہ جھاگ اُچھالتی مگر لوگ گردن اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ سامنے سیلف اسٹور کے دروازے پہ خریداروں کا ہجوم تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے "دیانت ایمان ہے" کا سائن بورڈ نظر آتا اور کاؤنٹر پہ لگے ترازو کے وزن کے پور خانوں کے اوپر نبیوں کے اقوال کھدے ہوئے تھے۔

سیلف اسٹور میں میری تلاش میں ناکام ہو کر وہ سامنے کے ہوٹل کی طرف بڑھا اور دروازے کے اوپر آویزاں "صفائی نصف ایمان ہے" کی رنگین تختی تلے سے گزر کر وہ ہال میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف مرد، عورتیں ایک دوسرے کی طرف بغیر دیکھے قہقہوں میں مشغول تھے۔ میری تلاش میں ناکام ہو کر وہ ایک خالی میز پر بیٹھ گیا اور شوربہ کا آرڈر دے دیا۔

باورچی خانے کی طرف تیز بُو کے ریلے آ رہے تھے۔ گاہکوں کے کپڑوں پہ شوربہ کے داغ، ہاتھوں پہ چکنائی اور باتوں سے بُو جھانک رہی تھی۔

اپنے سامنے رکھی شوربے کی رکابی سے چمچ منہ سے لگاتے وقت اس کے کانوں میں انسانی چیخوں اور آنکھوں کے سامنے جانوروں کے پنجر لہرانے لگے۔ اُسے اپنا سارا وجود کثیف سیلی دھند میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ خوف زدہ سا ہو کر وہ اُٹھا اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلتے وقت اُس کی ٹکر مومنوں کی اس ٹولی سے ہو گئی جو دکانوں پہ حدیثیں اور اقوال کے کیلنڈر آویزاں کرنے کا کاروبار کرتی ہے۔ سب سے آخر میں داخل ہونے والے مومن کے ہاتھ میں جو کیلنڈر تھا اُس پہ لکھا تھا ——— "اس سے پہلے کہ تمہارا دشمن تمہیں مارے تم اُسے مار دو"

اس نے سینے میں پھیلی چیخ کا گلا دبا دیا اور سسکیاں بھرتا سڑک پہ آ گیا۔ باہر لوگ ایک دوسرے کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالے گوشت نوچتے اپنی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔ پرندے بہت نیچے تھے تبھی بازار کے کسی کونے سے فائر ہوا۔ دوربین کے شیشے کے آگے سے ایک سایہ گزرا۔ ایک زخمی پرندہ تڑپتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ اس نے سارا بازار چھان مارا میں اسے کہیں نظر نہ آیا۔ دوربین کونے میں پھینک کر گہرے دکھ کے ساتھ اُس نے کہا۔

"نصف ایمان کے ساتھ جینا عذاب ہے۔"

اس کی صدا کا کہیں سے جواب نہ آیا۔ زخمی پرندے گرتے رہے، اس نے اپنے ہاتھوں کا مائیک بنا کر کھڑکی سے سر باہر نکالا۔

اور لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر بولا ۔

"نصف ایمان کے ساتھ جینا ذلت ہے "۔

تیز گاڑیاں، دھواں، شور، مصروف زندگی کے گرم ہجوم اس کی صدا کی نحیف پھیلی کو نگلتے رہے ۔

اس نے اپنی پوری توانائی اور جذبہ آواز میں سمویا اور اپنا آدھا دھڑ باہر نکال کر چلایا ۔

"نصف ایمان کے ساتھ جینا گناہ ہے"۔

گرتے ہوئے سُرخی پرندے اس کی آواز کے گرد فصیل بناتے رہے ۔ اس کے چاروں طرف اڑتے رہے گرتے رہے ۔

نیچے کسی کونے میں کھڑے جاہروں کی نظر کھڑکی کے پاس پرندوں پر پڑی ۔

وہسکی، پرندوں کا گوشت، نوخیز لڑکیاں ۔

پرندوں کی اتنی بڑی تعداد ۔

فائر ــــــ

"نصف ایمان کے ساتھ جینا ....."

اس کی آواز راستے میں ٹوٹ گئی ۔ انگنت پرندوں نے ایک انسانی جسم کو کھڑکی سے باہر کھلی فضا میں اپنے ساتھ پرواز کرتے دیکھا ۔

میں جب واپس آیا تو پرانی وہسکی اور نئے موضوعات ساتھ لایا ۔ اس کے انتظار کا مجھے احساس تھا اس لیے میں نے سیڑھیوں کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا ۔

پھولتی سانسوں کو سینے کے تابوت میں دباتے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے میں نے کئی مرتبہ اس کا نام پکارا ۔ کمرے میں پھیلی چپ کے چہرے پہ میری آواز کی گرد جمتی رہی ۔ چاروں طرف تلاش میں ناکام ہو کر میں نے کونے میں پڑی دوربین اٹھائی اور کھڑکی سے نیچے جھانکا ۔ آٹھویں، دسویں، سولہویں نہ جانے وہ کون سی منزل پہ رہتا ہے اس نے تو مجھے کبھی بتایا ہی نہیں ۔ نیچے سڑک پہ آوازیں اور ضعیف ننھے نقطے بکھرتے بھاگتے چلے جا رہے تھے ۔ سامنے سمندر اور آسمان کی ملن کے نیچے نئے پرندوں کا طلوع شروع ہو گیا تھا اور کھڑکی کے عین نیچے طویل چوڑی سڑک کے وسط میں اس کی لاش پہ ٹوٹے پروں کی تہہ جم رہی تھی ۔ ▲▲

ایک ضروری اطلاع

"ہم زبان" کیلئے صرف نئے یا پرانے ادبی مسائل پر مضامین بھیجئے ۔ انٹرویو، تعارف، سوانحی خاکے اور شخصی مطالعے وغیرہ شائع نہ ہوسکیں گے ــــ ..

علاج

مقتدر حمید
ٹریفک سپرنٹنڈنٹ ۱۹/۴ پی۔ این
ایئرلائنز کالونی ـــ کالینہ بمبئی ۲۹

" بے شک' یہ بے حد نجی سوال ہے ـــ اور آپ کے اس طرح بے ٹوک پوچھنے پر یقیناً بڑا کر سخت سست کہا جاتا اگر آپ اس مختصر سے عرصے میں اتنے قریب نہ ہو گئے ہوتے۔"

ـــ تو اس کا مطلب ہے کہ تم میرے سوال کا جواب ضرور دو گے ـــ میں نے سوچا، لیکن بظاہر صرف مسکرا کر اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتا رہا۔ جیسے وہ ماضی کے کرب ناک اندھیروں میں جھانک رہا ہو۔

" ساتھ ہی یہ بھی مانتا ہوں کہ آپ کا مشاہدہ غضب کا ہے۔ جس بات کو ہم دونوں نے دانستہ اس خوبصورتی سے چھپائے رکھا کہ آج تک کسی کو گمان نہ ہو سکا' وہ بات آپ اس طرح محسوس کر جائیں گے' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

مہابلیشور کے گرینج ہوٹل کا بار اور ایک میز پر ہم دونوں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی' پہاڑی خنکی میں' ہولے ہولے گذرتی ہوئی رات۔ میں خود بھی کسی پرانی داستان کا کردار محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یوں تو میں تنہا نہیں بلکہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ لیکن دن بھر کے سیر سپاٹے کے بعد' جب سب تھک کر بستروں میں بے خبر سوئے رہتے تو میں اکیلے بیٹھ کر شغل کرتا تھا۔ اسی طرح وہ بھی رات کے ابتدائی حصے میں چپکے سے ایک میز پر آن بیٹھتا اور شروع ہو جاتا۔ پھر کسی طرح ہم قریب ہوئے اور ایک ہی میز پر بیٹھنے لگے۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور غالباً ہنی مون منانے وہ لوگ اس ہل اسٹیشن پر آئے تھے۔ اس کی بیوی بے حد دلکش خط و خال کی مالک' بڑی پُر وقار عورت تھی۔ ان دونوں کے تعلق سے میں نے جس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا اُس نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اس سے یہ سوال کروں۔ اور اب میں منتظر تھا کہ اس راز سے پردہ اُٹھے۔

" دراصل بات یہ ہے شرما کہ بال بچوں کے ساتھ ہل اسٹیشن گھر کی چار دیواری سے ذرا بھی مختلف نہیں ہوتا۔ اپنا تو کیا' بس گھر کے لوگوں کی تفریح کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ ساری زندگی ہم دوسروں کے لیے جیتے ہیں' اور جو زندگی اپنے حصے میں آتی ہے' صرف اپنے لیے جینے کی' وہ اس قدر کم ہوتی ہے کہ اپنے وجود پر شک ہونے لگتا ہے۔ کبھی تو آدمی خود سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کون ہے ....؟

اس لیے مجھے یہ مختصر سے لمحے بے حد عزیز ہیں کہ زندگی کی اُس کا اتا پتا تو ملتا ہے ان سے "

" نہیں صاحب! مجھے یہاں آپ سے اختلاف ہے۔ زندگی تو وہ ہے جو دوسروں کے لیے گزرے ــــ ایسی ہی گم گشتگی میں اپنا پتہ ملتا ہے۔ صرف اپنے لیے جینے والا تو اس قدر اندھیرے میں مقید ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے کہیں کوئی روشنی نہیں رہ جاتی ــ اور اس طرح صرف اپنے آپ کے ساتھ جینا، بڑا کٹھن مرحلہ ہے "

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر میز کی رسمی کارروائیوں کے بعد جیسے خود کو کچھ نہ کچھ کہنے کی کشمکش سے گزار کر، فیصلہ کن انداز میں اپنے آپ سے باہر نکلتا ہے ــ

" میں آپ کو ساری بات بتاؤں گا "

میں سگریٹ جلا کر کرسی کی پشت سے ٹک جاتا ہوں۔ اب کوئی جلدی نہیں ہے۔ بار تقریباً خالی ہے۔ فضا میں خنکی بڑھ چلی ہے اور کھڑکیوں کے لرزاں پردوں سے پرے پہاڑوں کی پراسرار خاموشی کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں۔

" یونیورسٹی میں ریتا سے میری ملاقات ان دنوں ہوئی جب وہ لائبریری سائنس کے شعبہ میں ریسرچ کر رہی تھی۔ مطالعہ میری بھی ضرورت رہا ہے، تو اس طرح ہم قریب ہو گئے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی اتنی شدت سے اچھی لگی۔ اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

" ایک بات بتاؤ ریتا ــ تم اتنے سارے لوگوں سے دوستانہ تعلقات کے باوجود اتنی اکیلی اتنی تنہا کیوں ہو ــ میں نے تم کو کسی سے کھلتے ملتے، قریب آتے نہیں دیکھا۔ خود مجھ سے بھی تم نے فاصلے رکھے۔ اتنا ضرور ہے کہ کبھی جانے پر، کبھی ویسے لان میں، مجھے تھوڑا وقت دے دیتی ہو، پھر بھی ......"

" اس لیے کہ لوگوں کے قریب آنے کا محض ایک ہی نفرت انگیز مقصد ہوتا ہے اور تم سے ملنا جلنا پسند کرنے کی وجہ بھی صرف اتنی ہے کہ تمہارے ایپروچ میں وہ پہلو نہیں تھا "

" لیکن یہ تم نے کیسے یقین کر لیا کہ آگے چل کر بھی وہ پہلو سامنے نہیں آئے گا؟ "

" جس دن میں ایسا محسوس کروں گی " اس کا چہرہ تن گیا ــــ " وہ ہماری دوستی کا آخری دن ہوگا "

مجھے چوکنّا ہو جانا چاہیے تھا لیکن آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ میں جتنا خود کو اس سے دور کرنے کی کوشش کرتا رہا، وہ میرے وجود پر چھاتی چلی گئی۔ اب تو میری زندگی کا مقصد صرف ریتا کو حاصل کرنا رہ گیا اور اس کے لیے میں جان کی بازی لگانے پر تُل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ریتا کو شادی کے نام سے چڑ ہے۔ اس نے پوری زندگی اسی طرح تنہا گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور تعجب تو یہ کہ کرنل صاحب بھی اپنی بیٹی کے اس فیصلہ پر حیرت ناک انداز سے چپ تھے۔ میں نے رات دن ایک کر دیے لیکن فاصلہ بدستور قائم رہا۔ ایک روز جب ضبط کی حدوں سے گزر گیا تو میں نے کرنل کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور میرا وجود ایک چیخ بن کر رہ گیا۔ پہلی بار کرنل کے بے جان چہرے پر انجانے جذبوں کی پرچھائیاں رینگ گئیں ــــ اور انہوں نے آخر اس راز میں شریک کر لیا ــــ ریتا کے بچپن کا ایک المیہ جو اس کی موجودہ یخ بستہ کیفیت کا باعث بنا۔

بھورے مٹیالے بادلوں سے بھرا ہوا آسمان، ہوائیں جیسے تھم سی گئی ہوں۔ فضا میں کتنی گھٹن ہے۔ سہ پہر لیکن ایسا اندھیرا چھایا ہوا جیسے شام ہو گئی ہو۔

" چلئے گھر لوٹ چلیں " لیکن گھر دور رہ گیا تھا۔ اور سامنے جھاڑیاں بھوتوں کی طرح ڈراؤنی اور ہیبت ناک تھیں۔ اور پیروں کے نیچے سوکھی گھاس اور پتے جو بے ہنگم آوازوں کے ساتھ ٹوٹتے جا رہے تھے۔ وہ ہاتھ جو شانے پر تھا اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ننھی ریتا کے

دل کو دہلا رہی تھیں ۔۔۔ پھر آسمان پر بادل زیادہ گھنیرے ہوتے گئے، سورج نے جانے کہاں منہ چھپا لیا اور چاروں طرف سوکھی گھاس اور مردہ پتے پھیل گئے ۔۔۔۔ سر پر، شانوں پر، بالوں میں اور آنکھوں میں اور ہیبت ناک چیخوں میں اور پھر ساری زمین لہو میں لت پت ہو کر بڑی تیزی سے چکر کاٹتی اُلٹی گھوم گئی ۔

کرنل نے ہر ممکن طریقے اور علاج اپنائے، ریتا یوں تو ایک نارمل لڑکی رہی لیکن بس یہی ایک حادثہ اس کے ذہن پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ پوری بات جان لینے کے بعد کچھ عرصہ بڑی کشمکش میں گذرا ۔ پھر میں نے نفسیاتی معالج سے رجوع کیا ۔ اس کے مشوروں کی روشنی میں ایک پلان بنایا اور فیصلہ کر لیا کہ چاہے جو ہو یہ مہم تو ضرور سر کروں گا ۔ میں نے کرنل صاحب کو بھی اپنا منصوبہ بتا دیا اور ریتا کو بھی راضی کر لیا ۔

" دیکھو ریتا، جب تک شادی کی عمر ہے تمہارے لیے رشتے آتے رہیں گے ۔ اور تمہارا انکار لوگوں کے تجسس کو ہوا دیتا رہے گا ۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس معاملے کی تہہ کو پہنچے کیا بُرا ہے جو ہم لوگ میاں بیوی ہونے کا ڈھونگ رچائیں، لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے اور ۔۔۔۔ ویسے بھی ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک ساتھ نہیں رہ سکتے کیا ؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کوئی معاملہ، کوئی تقاضہ ہمارے بیچ نہیں ہوگا ۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں "

شادی کی رسمی کارروائیوں کے بعد رفتہ رفتہ بہت ہی صبر اور لگن کے ساتھ میں نے تکلف کے پردوں کو یکے بعد دیگرے گرانا شروع کیا ۔ بڑی احتیاط اور ضبط کے ساتھ پورا ایک سال گذر گیا۔ اس درمیان اپنے جسم کے تقاضوں سے بارہا مجبور ہوا لیکن میں نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا ۔ اب وہ بہت قریب آ گئی تھی ۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا ۔ برف پگھل رہی تھی اور مری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا!

پھر مری زندگی کا وہ سب سے خوبصورت دن بھی طلوع ہوا جب جھکی جھکی شرمیلی نگاہوں سے ریتا نے بنا کچھ کہے بہت کچھ کہہ ڈالا ۔ پورے ایک سال کی شادی شدہ زندگی کے بعد میں اپنی سہاگ رات منانے جا رہا تھا ۔ ریتا دلہن بنی بیٹھی تھی اور چاروں طرف موگرے کی مہک نے نشہ بکھیر دیا تھا ۔ میں نے اس کے خوبصورت ہاتھوں کو چوما، اس کی گردن کے تِل کو بوسہ دیا ۔ میری لرزتی انگلیاں اس کے نرم و نازک جسم کو سہلاتی رہیں اور ریتا پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ اس کی سانسوں کا زیر و بم، بند آنکھیں، بے قرار باہیں، .... اپنے سارے وجود سے وہ ایک تقاضہ بن گئی

میری پیشانی پسینے میں تر ہو گئی ۔۔۔ ذہن کو زبردست جھٹکا لگا ۔ اور میں ۔۔۔ میں نے دیکھا کہ مجھ میں اُس تقاضے کے جواب کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے ۔۔۔ ▲▲

بِسْمِ اللّٰہِ وحدہٗ لا شریک لہٗ

سلیم کوثر

پاکستان ٹیلی ویژن سینٹر۔ کراچی (پاکستان)

تو ہم سے پہلے جو لوگ تھے
کیا انہیں بھی تنہائیوں کے ایسے بسیط صحراؤں میں مسافت کا ڈھنگ آتا تھا
تم بتاؤ ــــ ؟

بتاؤ نا ــــ وہ جو آئینے تھے
وہ کتنے سچے تھے ؟ بات کرتے تھے یا خموشی کی آگ میں خود شکستگی کا خراج چہروں سے مانگتے تھے
مجھے بتاؤ
کیا اب سے پہلے بھی موسموں کا مزاج ایسا ہی جارحانہ تھا
جیسا اب ہے ؟
بتاؤ نا ' ہاں مجھے بتاؤ
کیا اب سے پہلے بھی طاقچوں میں سیاہیوں کے عذاب روشن تھے
کیا دُعاؤں کے حرف ہونٹوں پہ منجمد ہو کے حیرتوں میں بدل گئے تھے
گھروں کو لے جانے والے رستے مسافروں کو نصابِ آوارگی پڑھاتے تھے
تم بتاؤ ؟
اور اس سے پہلے میں وقت کی بے لحاظ رسموں کی زد پہ آؤں
مجھے بتاؤ ــــ مجھے بتا دو
نہیں تو تم بھی مرے کہے پر یقین کر لو ۔
کہ ہم سے پہلے جو لوگ تھے' آئینے تھے' رستے تھے
ان پہ اکثر کتاب اترتی تھی
اور ہم حرف کی صداقت کو ماننے سے بھی منحرف ہیں
بتاؤ نا ' کیا یہ سچ نہیں ہے
مجھے بتاؤ نہیں تو تم بھی مرے کہے پر یقین کر لو ۔

نظمانے

محسنؔ بھوپالی

محسن منزل ۱۷ ایف - ۵/۲۴ اے، ناظم آباد، کراچی ۱۸

دور اندیشی

تم محسنؔ ہو،
—— یہ تو ٹھیک ہے
لیکن تم یہ "بھوپالی" کیوں لکھتے ہو؟

—— اگر نہ لکھتا —— آپ پوچھتے
کہاں کے رہنے والے ہو؟
—— میں کہتا لاڑکانے کا
تم پھر کہتے پاکستان آنے سے پہلے،
کون سے شہر میں رہتے تھے
—— میں کہتا بھوپال!
کہا پھر اکر مجھ کو جو بتلانا پڑتا
میں نے ساتھ ہی لکھ رکھا ہے!

ارتقائے زوال

برائی سے نفرت ہی کرتا تھا پہلے
کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی کچھ سُنا تھا۔
—— پھر اک وقت آیا —— کہ اوروں کی خاطر
بُری چیز کو بھی بُری چیز کہتے ہوئے
میں جھجکنے لگا!

اب بُرائی کو اچھا سمجھنے لگا ہوں
یہی "ارتقا" کی وہ دلدل ہے
جس سے بچانا —— کسی اور کے کیا
یہ میرے خدا کے بھی بس میں نہیں ہے!
—— اگر میں نہ چاہوں!!

حسبنا اللہ

احمد حسین شمس
کشن گنج، پورنیہ (بہار)

ایک شعلہ
زمیں سے فلک کی طرف اتنی تیزی سے لپکا
کہ رضوان جنت کی آواز کا تیر بھی
سیکڑوں سال پیچھے خلاؤں ہی میں تیرتا رہ گیا۔
ناگہاں
اوم بھر بھوہ سوہ کی سرور آفریں نغمگی چھا گئی
اندر مستی میں شنکر لگے ناچنے
روشنی کی لچکتی کمر کٹ گئی
ظلمتوں کے سمندر میں کونین غرقاب ہوتا گیا۔
کفل والے نے برگد کو ڈھونڈھا نہ تھا
بلکہ بے چینیاں کھینچ لائیں انہیں
سالہا سال تک
آنکھ موندے ہوئے
پالتی مار کر آپ بیٹھے رہے
ستیہ خود ستیہ کی کھوج میں کھو گیا
نون والے زمانے سے بھاگے نہ تھے
بلکہ خود کو کیا قید خود دوڑ کر
ایک مچھلی کے تہہ خانۂ بطن میں ..... اور پھر
انی کنت من الظالمین ان کے لب پر تھرکنے لگا۔

اور جب دونوں قرنوں کے مالک نے دیکھا
کہ تاریک کی جھیل میں
مہر انور لگا ڈوبنے
اک دھچکا لگا شیشۂ فکر پہ
دوسری سمت منہ موڑ کر چل دیئے
سامنے دیکھتے ہیں
کہ ایقان کے بحر زخار سے
ایک سورج ابھر کر سوئے چرخ ہے گامزن
اک کرن
لپلپاتی ہوئی، جھلملاتی ہوئی، مسکراتی ہوئی
عقل کے دشت میں رقص کرنے لگی
ذرے ذرے نے آخر سپر ڈال دی
حسبنا اللہ نعم الوکیل
الغرض روشنی کی زباں بن گیا۔

ماہر منصور
وائرلیس انسپکٹر، ونوبا نگر، ٹمکور ۵۷۲۱۰۱

ناخن

میں نے پرسوں ہی تراشا تھا انہیں
کتنی تیزی سے بڑھ گئے ناخن
آج پھر سر اُٹھا کے کہتے ہیں
تم میں ہمت نہیں ہے بڑھنے کی
کب تلک تم ہمیں تراشو گے
سر بُریدہ نہ کر سکو گے ہمیں
آخرش تم ہی ہار جاؤ گے۔

BEWARE OF DOGS

سڑک پر خون چغلی کھا رہا تھا
کہ پچھلی شب
اِسی اونچی عمارت سے
جواں لڑکی نے گر کر
خودکشی کر لی

میں حیراں ہوں
کہ اُس نے کیوں نہیں دیکھا
اِسی اونچی عمارت کے
عظیم الشان دروازہ پہ
پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے
"یہاں خونخوار کتے ہیں"

بے آواز

ابن کنول

بیت الشمس ۔ جمالپور ۔ علی گڑھ

جیل کی آہنی سلاخوں کے اندر رہتے ہوئے اسے پورا ایک مہینہ ہوچکا تھا اس کے بدن کا ایک ایک جوڑ درد سے کراہ رہا تھا۔ کون کون سی اذیتیں تھیں جو اسے نہ دی جاچکی تھیں لیکن وہ پتھر کا آدمی خاموش تھا۔ جیل کے حکام گرمی میں زبان نکال کر ہانپتے ہوئے کتوں کی طرح نالیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ پتھر کے آدمی کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتے کرتے وہ تھک چکے تھے۔ اور وہ خاموش آدمی دور لیکن بہت نمایاں منظر کو دیکھنے میں اسقدر محو تھا کہ اپنے قریب کی چیزیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں ——

انسانوں کے جسموں سے اُبلتے ہوئے سُرخ فوارے ہولی کے رنگوں کی طرح سڑکوں کو رنگین کر رہے تھے۔ عورتوں اور بچّوں کی چیخ وپکار نے آسمان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ ہاتھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی ہوئی چوڑیوں کے بوجھ سے زمین کانپنے لگی تھی۔ مانگوں سے سیندور اُڑنے لگا تھا۔ دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں کچی اور ادھ کچی کلیاں "اشرف المخلوقات" کے ہاتھوں بے دردی سے ٹوٹتی دیکھ کر قدرت انگشت بدنداں تھی۔ خون پسینے سے بنائے ہوئے لوگوں کے آشیانے اُجڑ رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا ماحول تھا۔ ہر شخص اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے اِدھر اُدھر چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے بھی اس ہنگامی طوفان سے بچنے کے لیے اپنے گھر کے تمام دروازوں کو مقفل کر لیا تھا۔ لیکن چادر اوڑھ لینے سے کب کوئی بارش سے بچ سکا ہے۔ اچانک اتنی زبردست آندھی دروازے سے ٹکرائی کہ دیواریں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دل کی حرکتیں ٹھہرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ رنجنا، سونیا اور اُرملا خوف سے لرز گئیں اور اس کے اندر جذب ہونے کے لیے بے اختیار اس سے لپٹ گئیں۔ وہ خود گھبرایا ہوا تھا۔ دروازہ کو کھولنا موت کو دعوت دینا تھا۔ دروازہ برابر چیخ رہا تھا۔ اس کی دلخراش چیخوں سے جانے کتنے معصوم دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ اچانک اسے لگا جیسے صحن میں کوئی کودا اور تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھ آیا۔ جس میں وہ چاروں پناہ گزیں تھے۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ چند لمحوں میں کمرے کا دروازہ زمین سے جا لگے گا۔ اور ان کے جسموں سے خون کے فوارے بہنے لگیں گے۔ ان کی نظروں میں ایک دوسرے کے خون میں لتھڑے ہوئے جسم نظر آنے لگے۔ دروازہ پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

"رنجو کھولو ـــ دروازہ کھولو رنجو ـــ میں ہوں مجید ـ جلدی کرو رنجو ـــ جلدی کھولو ـــ"

مجید رنجو کا پڑوسی تھا۔ بچپن ہی سے دونوں ساتھ ساتھ پڑھے اور کھیلے تھے۔ رنجیت تو پڑھ کر ایک بڑا افسر بن گیا تھا لیکن مجید پانچویں جماعت تک پڑھ کر باپ کے ساتھ پھلوں کے کاروبار میں لگ گیا۔ رنجیت لاکھ بڑا افسر بن گیا لیکن ان دونوں کی دوستی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ دونوں جب ملتے تو اس طرح بغلگیر ہو جاتے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے یار ملے ہوں۔ عید کی سویاں رنجیت مجید کے یہاں بڑی بے تکلفی سے کھایا کرتا اور مجید ہی کی طرح نئے کپڑے پہن کر اس کے ساتھ گھومتا۔ ہولی کے رنگوں سے مجید اپنے سارے کپڑوں کو اس طرح رنگ لیتا کہ مجید خاں اور مجید سنگھ میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا۔ ہندوستان کی تقسیم کا جب ذکر چلا تو مجید اور رنجیت نے یہ عہد کیا تھا کہ لاہور چاہے ہندوستان میں رہے یا پاکستان میں لیکن ہم لوگ لاہور ہی میں رہیں گے۔ مجید نے پھلوں سے تیار کی ہوئی اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو ابھارتے ہوئے کہا تھا ـــ

"ہے کوئی مائی کا لال ہم تم کو علیحدہ کر دے، سیب کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

اتفاق کی بات جن دنوں یہ تاریخی حادثہ پیش آیا مجید ان دنوں کابل میں تھا۔ سنتے ہی فوراً واپس آ گیا۔ یہاں آ کر عجیب منظر دیکھا۔ بڑے بڑے ہندو خاندان اپنی لمبی چوڑی کوٹھیوں کو چھوڑ کر خالی ہاتھ ہندوستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے دوسری طرف ہندوستان کے مسلمان اپنے بھرے پُرے گھروں کو چھوڑ کر پاکستان آ رہے تھے۔ جس کو کوئی خالی مکان مل جاتا اسی پر قبضہ کر لیتا۔ بہت سے امیر اس تقسیم میں بھیک مانگنے لگے اور بہت سے فقیر دولت خاں اور دھنی رام بن گئے۔ مجید کو فوراً رنجیت کا خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں رنجیت بھی ہندوستان کے لیے روانہ نہ ہو گیا ہو یا زبردستی نکال دیا گیا ہو۔ جیسے ہی وہ اپنے محلّے میں داخل ہوا اس کے کانوں سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی زوردار صدا ٹکرائی۔ ویسے تو وہ پورے شہر میں اس طرح کی صدائیں سنتا چلا آ رہا تھا لیکن یہاں کچھ زیادہ ہی ہنگامہ تھا۔ وہ دوڑ کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ گھر میں صرف عورتیں ہی تھیں۔ ایک جانب بوڑھا باپ اپنی کھانسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باپ کے بلانے پر مجید اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے اپنی کھانسی پر فتح پاتے ہوئے مجید سے کہا ـــ

"بیٹے اس وقت تم اپنی دوستی کا حق ادا کرو۔ دیکھو غنڈے رنجو کا دروازہ توڑے ڈالتے ہیں، تھوڑی دیر میں دروازہ ٹوٹ جائے گا اور وہ سب کو مار ڈالیں گے۔ بیٹے وہ ہندو ہیں تو کیا ہوا آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے ـــ جاؤ تم انہیں اس گھر میں لے آؤ۔ اگر وہ کہیں تو حفاظت سے ہندوستان پہنچانے کا انتظام کر دینا۔"

مجید اور رنجیت کے گھر میں صرف ایک دیوار کی دوری تھی۔ وہ دیوار سے کود کر رنجیت کے گھر پہنچ گیا ـــ اس وقت رنجیت کے گھر والے عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ دروازہ کھولیں یا نہیں۔ آخر مجید بھی تو مسلمان ہے۔ وہ ہی ہمارا کیوں بھلا چاہنے لگا۔ ممکن ہے وہ باتیں بنا کر دروازہ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجید برابر پکار رہا تھا۔

"رنجو دیر مت کرو ـــ جلدی دروازہ کھولو"

"مجید ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو ـــ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا قاتل ہمارا ......" رنجیت کی مری ہوئی آواز نکلی لیکن اس نے بات پوری نہیں کی۔

"رنجیت تم یقین کرو مجھ پر ـــ اتنا ذلیل مت سمجھو ـــ دیکھو جلدی دروازہ کھول دو ـــ باہر کا دروازہ ٹوٹنے ہی والا ہے"

اور پھر رنجیت نے یہ سوچ کر دروازہ کھول دیا کہ مرنا تو ہے خواہ کسی کے ہاتھ سے۔ دروازہ کھلتے ہی مجید فوراً ان چاروں کو باہر لے آیا۔ رنجیت کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی چیزیں تھوڑی تھوڑی کر کے الگ الگ باندھ کر آپس میں بانٹ لی تھیں یہ سوچ کر کہ شاید کہیں بھاگنے کا موقع مل جائے۔ مجید نے جلدی جلدی

ان چاروں کو دیوار سے اپنے گھر میں اُتارا۔ ان سب کے اُترتے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا جس سے عورتوں کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ رنجیت کا دروازہ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ اور دروازہ توڑنے والے تیزی سے اندر گھس آئے تھے۔

مجید نے سکون کا سانس لیا۔ اور ان لوگوں کو اپنے گھر میں چھپا دیا۔ رنجیت — کا برسوں کی محنت سے بنوایا ہوا گھر اُجڑ چکا تھا۔ اس کے کانوں سے اس کے گھر سے آنے والی یہ آوازیں ٹکرائیں۔

"سالے بھاگ گئے"

"ابے یار اس کے ہاں دو لونڈیے بھی تو تھیں"

"جائیں گے کہاں بھاگ کر"

رنجیت نے یہ آواز پہچان لی تھی۔ یہ ستیے ٹال والے کی آواز تھی جس سے بہت دن پہلے کچھ تو تو میں میں ہوگئی تھی۔ شاید آج بدلہ لینے آیا تھا۔ ستیے نے زور سے آواز لگائی ——

"لگا دیو سالے کافر کے گھر میں آگ۔ لوٹ لیو سب"

ستیے کے ساتھیوں نے سامان توڑنا پھوڑنا شروع کیا۔ مجید لاٹھی لیکر دیوار کی طرف دوڑا۔ رنجیت نے اسے پکڑ لیا۔

"نہیں جاؤ مجید —— لوٹنے دو" لیکن مجید تڑپنے لگا۔

"چھوڑ دو رنجو! —— دیکھوں سالوں کو کیسے لوٹتے ہیں —— حرام کا مال سمجھ رکھا ہے"

رنجیت نے اُسے چھوڑا نہیں ——

"مجید تم اگر وہاں جاؤ گے تو میری لاش دیکھو گے' تمہیں میری قسم"

مجید ڈھیلا پڑ گیا۔ رنجیت اس کی جان بچانا چاہتا تھا کیوں کہ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں پر اگر کوئی ساتھ دے سکتا ہے تو وہ صرف مجید ہی ہے اور اگر مجید ہی چلا گیا تو پھر وہ تنہا رہ جائیں گے —— تھوڑی دیر تک توڑ پھوڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر وہ ہنگامی جلوس اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ آج کسی غیر مسلم کو پاکستان میں نہیں رہنے دیں گے۔ آہستہ آہستہ وہ آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔

رنجیت اور اس کے گھر والوں کو یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ رنجیت نے مجید کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"مجید — مجھے فخر ہے کہ تم میرے دوست ہو۔ تمہارے اس احسان کا بدلہ میں زندگی بھر نہ چکا سکوں گا"

"پاگل ہو گئے ہو کیا —— ؟ احسان کیا ؟ —— ہاں اگر میں نہ آیا تا تو زندگی بھر اپنے آپ سے شرمندہ رہتا —— رنجو! اُرملا اور سونیا میرے لیے سائرہ اور طاہرہ کی طرح ہیں۔ اب جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوتے تم اسی گھر میں رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا"

"نہیں مجید اب ہم ہندوستان جائیں گے۔ دلی میں سر جیت کا بڑا بزنس ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا......"

"تم یہیں رہو گے —— بھول گئے ہم نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

مجید نے رنجیت کی بات کاٹی۔

"مجید ہمیں جانے دینا۔ تمہارا اتنا اور احسان ہوگا کہ ہمیں لاری میں سوار کرا دینا" رنجیت بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہندوستان جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ جیسا گھر وہ یہاں چھوڑ کر جا رہا ہے ویسا ہی اسے وہاں مل جائے گا۔ مجید نے محسوس کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رکیں گے

"دیکھو رنجو تم نے پھر احسان کہا۔ احسان کیا؟ رنجو! دل تو نہیں چاہ رہا کہ تم یہاں سے جاؤ' ہمیشہ ساتھ رہا ہے اب چھوٹ جائے گا۔ لیکن تم جانا ہی چاہتے ہو تو تمہاری مرضی —— خدا تمہاری حفاظت کرے۔ لیکن تم وہاں جا کر اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دینا۔ اور جب کبھی ملنے کا موقع ہو ملنا —— " مجید کی آواز بھرا گئی۔

دوسرے دن مجید سب کی نظروں سے بچاتا ہوا ان لوگوں کو لاری میں سوار کرانے کے لیے ساتھ ساتھ گیا۔ لاری میں سوار کرتے وقت وہ دونوں دوست اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے اب کبھی نہ مل سکیں گے۔ ان کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ لاری بالکل بھری ہوئی تھی۔ مجید جاتی ہوئی لاری کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آ رہی تھی۔

ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ درمیان میں سرحد قائم ہو گئی۔ سرحد پر پہنچ کر تمام سواریاں لاری سے اُتاری گئیں۔ یہاں سے دوسری لاری میں سوار ہونا تھا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بھری ہوئی سواریوں نے اُترنا شروع کیا۔ رنجیت انجلا کے ساتھ آگے کے دروازے سے اُتر کر سونیا اور اُرملا کے اُترنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن تمام سواریاں اُتر جانے کے باوجود بھی وہ نہیں اُتریں۔ کئی اور لوگ بھی اپنی سواریوں کو تلاش کر رہے تھے۔ رنجیت کی فکرمند نظریں بے چینی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اس نے لاری کے اندر جھانکا۔ لاری بالکل خالی تھی۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہی چڑھی تھیں۔ وہ تیزی سے ڈرائیور کی طرف بڑھا۔

"اس میں دو لڑکیاں سوار ہوئی تھیں ـــــ وہ کہاں گئیں؟"

ڈرائیور نے ایک بار اس کے چہرے کو دیکھا اور مسکرایا۔

"ابے مجھے کیا معلوم ـــــ بھاگ گئی ہوں گی کسی کے ساتھ ـــــ آج کل تو لونڈیے بڑا سستی ہو رہی ہیں کوئی اور دیکھ لے۔"

رنجیت کے جی میں آیا کہ وہ ڈرائیور کا منہ نوچ لے لیکن اس کی حیثیت تو یہاں دن کے ستارے کی سی تھی جس کی چمک پر آفتاب کی روشنی غالب آجاتی ہے۔ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ لاری راستے میں دو مرتبہ رکی کیوں تھی۔ پاس کھڑا ہوا ایک بوڑھا آدمی اُس کے قریب آیا جو اسی لاری سے اُترا تھا۔

"بیٹے! کیا تمہارے ساتھ بھی لڑکیاں تھیں؟ ـــــ راستے میں جو ذرا سی دیر کو لاری رُکی تھی اس تھوڑے سے وقت میں پچھلی کھڑکی سے دو تین لڑکیوں کو نیچے اُتار لیا گیا تھا۔" بڑھا اتنا کہہ کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں کوئی کسی کا غمخوار نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی ذات میں گم تھا۔ مال بدلا جا رہا تھا۔ ہندوستان کا ایسا مال جو پاکستان جانا چاہتا تھا پاکستان بھیجا جا رہا تھا۔ جو کچھ دن پہلے ہندوستان ہی تھا۔ اور پاکستان کا مال ہندوستان بھیجا جا رہا تھا، جس کا جنم ہندوستان کے دائیں بائیں پہلوؤں سے ہوا تھا۔ رنجیت خاموشی سے انجلا کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نہ انجلا نے کچھ پوچھا نہ ہی اس نے کچھ بتانا چاہا۔ اس کی متفکر نگاہیں بار بار آتی ہوئی لاریوں میں سے اُترتی ہوئی سواریوں پر پڑ رہی تھیں۔ لیکن مایوسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جو مسافر بچے ہوئے تھے وہ وہیں آرام کر رہے تھے۔ رنجیت اور انجلا بھی بیٹھ گئے۔ انجلا نے ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے آلو بھرے پراٹھے نکالے جو مجید کی ماں نے ان لوگوں کے لیے بنا کر رکھ دیئے تھے۔ دل تو بالکل نہ چاہ رہا تھا لیکن بھوک پریشان کر رہی تھی۔ تھوڑا بہت کھایا، باقی باندھ کر رکھ دیا۔ لاریاں اب بھی آ جا رہی تھیں لیکن سونیا اور اُرملا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ رات کی سیاہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تھکے ماندے بے گھر مسافر تھکے ہوئے پرندوں کی طرح شاخوں پر اونگھ رہے تھے۔ رنجیت اور انجلا بھی کچھ دور پر لیٹ گئے لیکن نیند ان کی آنکھوں کے آس پاس بھی نہ تھی! ایسے میں نیند آتی بھی کیسے جب دو جوان لڑکیاں اچانک غائب ہو گئی ہوں۔ رات کے اس نیم سناٹے میں دور ایک باغ کی جانب سے ہواؤں پر لہراتی ہوئی ایک مظلوم کی چیخ سنائی دی ـــــ

"بچاؤ ـــــ بچاؤ"

لیکن کوئی اس چیخ پر چونکا نہیں۔ جب سے اس ہجرت کا آغاز ہوا ہے ہر رات اور اکثر دن میں بھی اس طرح کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ سنتے سنتے لوگوں کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ لیکن رنجیت اس چیخ پر چونک پڑا ہے۔ اُسے لگا جیسے یہ آواز اس کے اپنے خون کی ہے۔ انجلا اس آواز کی طرف بھاگتے بھاگتے رہ گئی۔ رنجیت دوڑ پڑا۔ یہ اُرملا کی آواز تھی۔ رنجیت کے پیچھے پیچھے انجلا بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بھاگتے بھاگتے راستے ہی میں ساڑی سے اُلجھ کر گر گئی۔ رنجیت بہت جلد اُرملا کے قریب پہنچ گیا۔ دوڑ کر آتی ہوئی اُرملا اس سے لپٹ گئی۔ اس کے تمام کپڑے پھٹ چکے تھے۔ جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ رنجیت نے اُسے بازوؤں کا سہارا دیا ـــــ

"کیا بات ہے بیٹی؟"

"بابا — بابا — بچاؤ — بچاؤ — ویدی — بچاؤ"

رنجیت سمجھ گیا، اُرملا کو آہستہ سے زمین پر لٹایا اور تیزی سے سونیا کو بچانے کے لیے باغ کی طرف دوڑا۔ اُرملا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اندھیرے باغ میں وہ اُس جانب بڑھا، جہاں سے کچھ قہقہے بلند ہو رہے تھے اور کچھ گھٹی گھٹی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ رنجیت جیسے ہی ان کے قریب پہنچا اُسکے سر پر کسی نے پوری طاقت سے لاٹھی ماری۔ وہ چکرا کر گر گیا۔

"دیکھا بابو ہم سے دشمنی لینے کا مزہ"

رنجیت آواز کو پہچان گیا۔ یہ اسی ستیے کی آواز تھی۔ جس نے رنجیت سے لڑائی ہوتے وقت کہا تھا —

"تیری تو میں نے زبان نہ کھنچوائی تو میرا نام ستیے نہیں۔"

رنجیت نے آنکھیں کھول کر اطراف کا جائزہ لیا۔ کئی بھیانک آدمی اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ اس جگہ پر پہنچی جہاں سونیا بالکل برہنہ حالت میں پڑی ہوئی ہانپ رہی تھی۔ رنجیت نے تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ستیے کی ٹھوکر نے اُسے پھر اوندھے منہ گرا دیا۔

"جاتا کہاں ہے اس کا کیا کرے گا اب — آج تو تجھ سے وعدے پورے کرنے ہیں۔"

تقریباً پندرہ دن بعد جب رنجیت کو ہوش آیا تو وہ کسی دوسرے ہی مقام پر تھا۔ اب وہ تنہا تھا۔ انجلا، اُرملا اور سونیا ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ اس سے بچھڑ چکی تھیں۔ کئی روز تک رنجیت امرتسر کے ایک اسپتال میں داخل رہا۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد جگہ جگہ وہ اپنے گھر والوں کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ کس طرح انجلا اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو سنبھالتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ اُرملا اس کی باہوں میں آ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ سونیا درندوں کے درمیان بالکل برہنہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ ان سب مناظر کو بھلا بھی نہ سکا۔ بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

جب سے رنجیت ہندوستان میں آیا تھا اسے کسی نے بولتے ہوئے نہیں دیکھا وہ ہمیشہ خاموش رہتا۔ اب وہ کچھ برسوں سے پاکستان جا کر اپنے گھر والوں کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جاتا کیسے؟ اس کے پاس پیسے بھی تو نہ تھے۔ مسلسل اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ کہیں سے پیسوں کا انتظام ہو جائے۔ لیکن یک وقت اتنے روپے اُسے نہ مل سکے۔ جانے کتنے بھائی بہن، ماں بیٹے اور دوسرے رشتے دار ہندوستان و پاکستان میں ایسے ہوں گے جو صرف اس وجہ آپس میں نہیں مل سکتے کہ ان کے پاس فاصلوں کو طے کرنے کے لیے پیسے نہیں۔

جب سے ہندوستان و پاکستان میں سمجھوتہ ہو کر آمد و رفت شروع ہوئی۔ رنجیت پاکستان جانے کے لیے اور بھی بے چین ہو گیا۔ اس بار اس نے طے کر لیا تھا کہ کسی طرح بھی جائے وہ پاکستان ضرور جائے گا۔ اور پھر ایک دن وہ بغیر ٹکٹ اور پاسپورٹ امرتسر سے لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اِدھر اُدھر ڈبہ تبدیل کرتا ہوا وہ پاکستان کی سرحد تک پہونچ ہی گیا۔ لیکن جب وہاں پر پولیس نے گاڑی چیک کی تو وہ زیادہ دیر تک ان کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ اس نے ایک ٹوائیلیٹ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لیکن دروازہ کھول لیا گیا اور اسے گرفتار کر کے امرتسر روانہ کر دیا گیا۔

امرتسر جیل میں پہنچ کر اس کی تلاشی لی گئی۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اس سے طرح طرح کی تکلیفیں دے کر پوچھا گیا۔ لیکن اس کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ اس کی مسلسل خاموشی سے جیل کے حکام کو اور بھی شبہات میں مبتلا کر دیا۔ شاید رنجیت اب مرنا چاہتا تھا۔ وہ اب تک اس اُمید پر زندہ تھا کہ اس کے گھر والے اسے مل جائیں گے لیکن اب اسے ذرا بھی اُمید نہیں تھی وہ جیل کی چہار دیواری میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس بوڑھے رنجیت نے اس طرح

جیل کی پتھریلی دیوار سے اپنے سر کو ٹکرایا جیسے کوئی خطرناک جنگلی بھینسا پوری طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ جیل کے سبھی حکام اور قیدی اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک کانسٹبل نے دوڑ کر پانی لایا۔ لیکن جب جیلر نے پانی پلانے کے لیے اس کا منہ کھولا تو اس کا ہاتھ کپکپا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس گرتے گرتے بچا۔ جیلر سمجھ گیا کہ یہ شخص اب تک کیوں خاموش تھا۔ رنجیت کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ ہندوستان کی تقسیم نے اس کے منہ سے زبان چھین لی تھی تاکہ وہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی اپنے گھر کی تباہی کو کسی کے سامنے بیان نہ کر سکے۔ رنجیت ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا۔

ہلکی ہلکی گرم ہوا چل رہی تھی۔ درختوں پر گرمی سے ہانپتے پرندے خاموش بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جیسے ان کی بھی زبان چھین لی گئی ہو تاکہ جیل کے اندر ہونے والی باتوں کو وہ باہر تک نہ پہنچا سکیں ــ ▲▲

ہیولوں کا شہر

اعجاز وقار
(پاکستان)

چاروں کتے نیم دائرے کی شکل میں اس کے قریب کھڑے تھے ۔ ٹامی اور جیک' جن کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی ۔ پُرسکون تھے اور سردار کے پاؤں چاٹ رہے تھے لیکن ٹائیگر ——— (جو بس نام کا ٹائیگر تھا) کی انگارہ آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ آج وہ سخت غصے میں ہے ۔ اس کی دم اِدھر سے اُدھر جاگیردار کے کوڑے کی طرح برس رہی تھی' منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور حلق سے غوں ——— غوں کی آوازیں نکل رہی تھیں ۔ اس کی گردن کے بال اکڑے ہوئے تھے اور وہ بار بار پاؤں پٹک رہا تھا ۔ بلو بھی بظاہر تو پرسکون ہی نظر آ رہا تھا لیکن اس کی بل کھاتی ہوئی دُم جس کی شکل اس وقت "9" کے مشابہ تھی سے احساس ہوتا تھا کہ اس سکون میں کوئی طوفان دبا ہوا ہے ۔ وہ بار بار اپنے ساتھیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتا اور پھر اپنا منہ اگلے پاؤں میں لے جا کر غصہ دبائے رکھنے کی کامیاب کوشش کرتا ۔

ان کے سامنے ان کا سردار چارپائی پر کھیلی چادر اوڑھے جس پر جابجا خون کے دھبے خشک ہو کر اکڑ چکے تھے لیٹا تھا ۔ جب اس نے اپنے چہرے سے دانتوں اور پاؤں کی مدد سے چادر اُتاری تو دیکھنے والوں کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن تھا کہ یہی وہ پچیس چھبیس برس کا نوجوان ہے جس کے گال دھوپ میں شفق کی طرح دہکتے تھے اور جس کی آنکھوں کی چمک سانپ کو بھی مسحور کر دیتی تھی ۔ شاید بیماریوں' افلاس اور تفکرات نے ہی اسے قبل از وقت ساٹھ ستر سال کا بوڑھا بنا دیا تھا ۔ اس کے چہرے پر بے شمار زخم تھے ۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی خونخوار درندے نے اپنے تیز نوکیلے پنجوں سے یہاں تجریدی آرٹ کا شاہکار تخلیق کیا ہے ۔ بعض زخم خاصے پرانے تھے لیکن ان کے نشانات اب بھی واضح طور پر باقی تھے ۔ جن سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہ تھا کہ یہی مصوّر اس سے قبل بھی اپنے موقلم کو یہاں آزما چکا ہے ۔ چہرے کے زخموں سے رستا خون ٹھوڑی پر جم کر خوبصورت جھالر بنا رہا تھا ۔ اس کے اوپر والے ہونٹ پر بائیں طرف یقیناً کسی سخت شے سے ضرب لگائی گئی تھی جس نے ہونٹ کاٹنے کے ساتھ ساتھ تین دانت بھی توڑ ڈالے تھے ۔ اب اس دراڑ سے زبان حلق سے چپٹی صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ دونوں آنکھوں کے درمیان جہاں سے ناک شروع ہوتی ہے کسی الٹے سے وار نے تھوڑا زخم کر دیا تھا جس سے سفید پانی بہہ بہہ کر منہ میں داخل ہو رہا تھا ۔ کبھی اس کی آنکھیں بڑی اور خوبصورت

ہوا کرتی تھیں لیکن آج توان کی جگہ صرف دو گڑھے ہی دکھائی دیتے تھے۔ جن سے ہلکے بھورے رنگ کا کوئی رقیق سا مادہ بہتا گالوں سے ہوتا سینے پر گر رہا تھا گاؤں کے بدرو کے سیاہ پانی کی طرح جو گڑھا بھر جانے کے بعد زمین کے چہرے پر حسین نقش و نگار بناتا یا نالوں میں بہہ نکلتا ہے لیکن چہرے کی اس شکستگی کے باوجود اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے روشن خوابوں کی طرح اب بھی چمکتے تھے۔ اس کا سر کلاک کے گھنٹے کی طرح مسلسل دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔ جیسے اس کا دایاں کان جو کسی زہریلی چیز سے زخمی تھا موم کی طرح پگھل پگھل کر گر رہا تھا۔

جب اس نے ہاتھوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی درد سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کے ہاتھ مکمل طور پر ٹوٹ چکے تھے صرف کھال کے ذریعہ جسم سے اس کا رشتہ قائم تھا۔ انگلیوں اور کہنیوں پر خون کے لوتھڑے جمے ہوئے تھے جو اس کوشش میں بستر پر گر گئے اور اس کی پسلیوں کے ساتھ چمٹ گئے۔ اس کا باقی جسم بھی مختلف چھوٹے چھوٹے تالابوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک جوہڑ خاصہ گہرا تھا جس کی تہہ میں تھوڑا پانی —— زیادہ کیچڑ —— اور چھوٹے چھوٹے کیڑے —— رینگتے نظر آتے تھے۔ پانی اگرچہ کم تھا لیکن اتنا —— بدبودار —— کہ دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہوتیں۔

جونہی جسم سے چادر ہٹی —— بہت سی مکھیاں ارد گرد سے اکٹھی ہو کر اس پر بھنبھنانے لگیں اور پیپ ملے خون سے —— اس نے مکھیوں کو اپنے سے دور رکھنے کی ناکام کوشش کے بعد اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا —— چار دن کتے ابھی تک اس کے پاس کھڑے تھے ان کی حالت میں تبدیلی صرف اتنی سی آئی تھی کہ اب جیک بھی سفید لمبے لمبے دانت دکھانے لگ گیا تھا۔ سردار نے انہیں اپنے قریب آنے کو کہا۔ اور خود بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر چارپائی کے بازو کے ساتھ لگ کر ایک ایک کی پشت پر محبت سے اپنے پاؤں پھیرنے لگا۔ اسے یہ کتے بڑے عزیز تھے۔ بڑی محبت سے اس نے انہیں پالا تھا۔ اگرچہ وہ پانچوں الگ الگ نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن ایک ہی گھر میں ایک مالک کے ساتھ اکٹھے پلنے سے ان میں نسل کا امتیاز بالکل مٹ گیا تھا۔ چونکہ وہ مختلف النسل تھے قدرت نے انہیں صلاحیتیں بھی مختلف عطا کر رکھی تھیں۔

ٹامی بڑے مضبوط جسم لمبے قد موٹے سر اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں والا صحت مند کتا تھا۔ بڑا کم گو اور زیادہ سونے والا۔ سارا سارا دن سویا رہتا کسی کو کچھ نہ کہتا۔ مالک دوسرے کتوں کو کھانا کھلانے لگتا تو اس کو بھی بلا لیتا۔ اس پر بھی بلو ہمیشہ اس سے شاکی رہتا۔ خوراک ہم سے زیادہ کھاتا ہے۔ ان کی شکایت شاید اس وجہ سے ہو۔ وہ کم کھانے کی شکایت نہیں کیا کرتا۔ اس بظاہر سست سے کتے کے جوہر اس وقت کھلتے جب وہ کسی دشمن سے لڑ رہا ہوتا۔ اتنی بے جگری سے لڑتا کہ دیکھنے والے انگلیاں دانتوں میں کاٹ لیتے۔

جیک بھی قدرے اس سے ملتا جلتا تھا۔ وہ اپنی بھوک برداشت کر لیتا لیکن اپنی طرف اٹھی کسی کی غصیلی نظریں برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا، خواہ یہ نظریں اس کے کسی بھائی کی کیوں نہ ہوں۔ بس یہی فرق تھا اس میں اور ٹامی میں۔

ٹائیگر بڑا چالاک کتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتا۔ کھانے کو تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو مالک کو کاٹنے کو دوڑتا اس کے کھانا کھاتے کوئی پاس سے گزر جاتا تو اس پر بھونکنا شروع کر دیتا اور ذرا سی خلاف طبع بات سنتا تو مرنے مارنے پر فوراً تیار۔

بلو ان تینوں سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں اسے بھوک بہت ستاتی تھی وہاں وہ خوبصورت اور چھوٹے چھوٹے کتوں کی قربت کے لیے بھی بے چین رہتا اور ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے وہ منت سماجت سے لیکر طاقت تک ہر حربہ استعمال میں لاتا۔ شکی مزاج اتنا کہ اپنے بھائیوں تک کو شک کی نگاہ سے دیکھتا۔

کرزویلا بہت تیلا تھا مرنجان مرنج "لوہا" ساری ساری رات اور دن بھر جاگنے والا واحد کتا جو تھوڑی سی خوراک پر گزارہ کر لیتا لیکن

جنسی اس کی بھی کمزوری تھی۔ اپنے مالک کے گھر کی پاسداری اس ہوشیاری سے کرتا کہ کسی ہمسائے تک کو ادھر گذرنے کی جرأت نہ ہوتی اور ہمسائے جب کبھی آتے پہلے سردار کو آواز دے کر کہتے کہ ذرا "لوما" کو بلالو ہم بازار سے گذرنا چاہتے ہیں اور سردار لوما کو بلا کر انہیں رستہ پار کرواتا۔ کئی بار اس کے ہمسایوں نے رات کو سردار کے گھر نقب لگانے کی سوچی لیکن ہر بار لوما آڑے آیا۔ کئی بار چور ہمسایوں نے لوما کو گوشت کا لالچ دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن الٹا اس نے انہیں کاٹ کھایا۔ لیکن کب تک؟ بالآخران کا حربہ کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار وہ اپنے ساتھ ایک کتیا لائے تھے —— جنس لوما کی کمزوری تھی۔ سو وہ اپنی اس کمزوری سے مات کھا گیا اور رنگے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی ان کے چنگل سے نکلنے کی بہتیرا اپنے بھائیوں کو پکارا لیکن چونکہ چور تھے انہوں نے باقی چاروں کے درمیان قیمہ بھری موٹی سی ہڈی پھینک دی اور یہ سب اُس پر پل پڑے۔ ساری رات اس کی خاطر آپس میں لڑتے رہے۔ چور گھر کا سارا سامان لوٹ کر لے گئے۔ جاتی دفعہ سردار کو اتنا پیٹا کہ اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ اور جسم کے بخیئے اُڑ گئے۔

آج سردار نے ان چاروں کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اور ان کی پشت پر پیار سے پاؤں پھیر رہا تھا جب تمام پرسکون ہو گئے تو سردار نے کہنا شروع کیا ——

بیٹا: تم قیمہ بھری ہڈی کے لیے آپس میں لڑتے رہے چور ہمسایہ میری ساری عمر کی پونجی لوٹ کر لے گیا۔ تمہارا بھائی قید ہو گیا اور میری حالت تمہارے سامنے ہے۔ (چاروں کتوں نے ندامت سے اپنے سر جھکالئے) یہ بات یہیں ختم ہو جاتی تو بھی خیر —— لیکن تم نہیں جانتے وہ کتنا عیار ہے۔ میری آتنی عمر اس کے ساتھ گذری ہے میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں اس کا تو کام ہی لوٹ مار ہے وہ پھر تمہیں آپس میں لڑائے گا —— میرا گھر لوٹے گا۔ اور تم میں سے جسے غافل پائے گا پکڑ کر لے جائے گا۔ —— غور سے سنو تو یہ قدموں کی چاپ —— یہ منحوس ہمسایہ ہے جیسے وہی ہمسایہ پھر قیمہ بھری ہڈی لئے پھر ہمارے گھر کی طرف آ رہا ہے —— وہ تم میں ہڈی ضرور پھینکے گا اور تم —— نہیں نہیں تم تو بھائی ہو آپس میں نہیں لڑو گے —— میں اپنے جیتے جی تمہیں آپس میں لڑنے نہیں دوں گا —— تم ہڈی پر اس لیے لڑتے ہو ناکہ تمہیں بھوک ستاتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا! —— ہاں تو شاباش میرے بیٹو آگے بڑھو اور میری زندہ لاش چبا ڈالو —— اپنی بھوک مٹالو —— آگے بڑھو' خاموش کھڑے کیا کر رہے ہو ——

میرا گوشت اس ہڈی سے یقیناً مزیدار ہو گا —— مجھے خوشی ہو گی۔ بہت خوشی کہ میرے بیٹوں نے مجھے عذاب سے بچالیا۔ وہ منظر دوبارہ دیکھنا عذاب سے کمتر نہیں ہے میرے لیے —— میں تمہیں آپس میں لڑتے نہیں دیکھنا چاہتا —— اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے میری جان تو معمولی چیز ہے —— مگر

—— یہ کیا —— ؟

—— تم میں جھگڑا کیوں نہ ہوا —— ؟ عیار ہمسایہ نے تم میں واقعی ہڈی پھینک دی؟ —— نہیں نہیں!

—— ایسا نہیں ہو سکتا ——

——

—— اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ گھسیٹا جا رہا ہے ——

چاروں کتوں نے چور ہمسایہ کی لاش سردار کی چارپائی کے پاس رکھ دی اور محبت سے ایک دوسرے کا منہ چاٹنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں ——

• اب یہ بدبخت ہمیں آپس میں کبھی نہیں لڑا سکے گا۔ •

—— دور سے لوما کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی ▲▲

تلاش

شبنم سحر دہلوی

۵۴۶، چوڑی والان — دہلی ۶

دو مختصر کہانیاں

میں نہ جانے کب سے بھٹک رہی تھی اس کی تلاش میں جس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ہر دکھ کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ بھٹکتے بھٹکتے میں اس ملک میں جا پہنچی جہاں ہر کوئی خوش تھا۔ کسی کو کوئی غم، کوئی خوف اور کوئی فکر نہ تھی۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا ——

"بتاؤ وہ کہاں رہتا ہے، جو میرے دکھوں کا زہر خود چوس لے اور مجھے خوشی کا امرت پلا دے؟"

اُن لوگوں نے مجھے راہ بتائی۔ راہ بڑی دشوار تھی، قدم قدم پر گہری خوفناک کھائیاں منہ کھولے منتظر تھیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور ان لوگوں کے نقشِ پا پر اپنی زخمی روح اور بوجھل قدم لیکر چلتی رہی —— چلتی رہی، چلتے چلتے مجھے ایک دریا نظر آیا۔ آگ کا دریا، جس میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے میرے قدم لڑکھڑائے مگر پھر منزل پانے کی جستجو نے مجھے وہ دریا پار کرنے پر مجبور کر دیا۔

کیوں کہ دریا کے اُس پار ہی میری منزل تھی۔ دریا کو پار کر کے میں ایک پرفضا مقام پر جا پہنچی، میری منزل قریب تھی، مگر یہ کیا ——؟ میرا سارا جسم آگ کے شعلوں سے بھڑک رہا تھا، میرے سارے جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ چکے تھے۔

"آہ — کاش کوئی میرے ان زخموں پر مرہم رکھ دے ....؟" میں شدتِ درد سے چیخ اُٹھی۔ میں نے ایک ایک کو پکارا مگر لگتا تھا اُن لوگوں کے سینے میں پتھر کے دل ہیں۔ وہ لوگ مجھے دیکھتے اور مسکرا کر آگے بڑھ جاتے۔

میں اپنے جسم کی اس تپش سے گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ شاید اس طرح یہ آگ سرد پڑ جائے مگر یہ آگ بھڑکتی رہی، اس سے پہلے کہ میں جل بھن کر خاکستر ہو جاتی مجھے اس ملک کا سب سے بڑا اور سب سے ٹھنڈا دریا نظر آیا، میں بنا سوچے سمجھے اس میں کود گئی۔ میرے جسم کی آگ میں دریا کھول اُٹھا۔ اور پھر جو جو اس دریا کے پانی کو پی کر واپس گیا وہ سڑکوں پہ دیوانہ وار چیختا چلاتا پھرتا اور میں .... اب میں ان لوگوں کو دیکھکر

- شبنم سحر —— تلاش
- شبنم مرزا —— بریک
- ڈل کے کنول — ایک ناقابلِ فراموش لمحہ

قہقہے لگاتی تھی کہ میں نے اس پتھروں کے شہر میں جینا سیکھ لیا ہے ——
مگر نہیں ——!

یہ میری منزل نہیں تھی، مجھے تو اس دیوتا کو تلاش کرنا تھا۔ میں چلتی رہی —— چلتی رہی —— اور آخر میں نے اُسے پا ہی لیا۔ وہ نجات دہندہ میرے بالکل سامنے کھڑا تھا میں دوڑی اور اس کے قدموں میں گر پڑی

"مجھے ان دکھوں سے نجات دلا دو میں بہت تھک گئی ہوں، روح کا کرب اب مجھ سے نہیں سہا جاتا"

"نجات...... دکھوں سے نجات کون دلا رہا ہے مجھے اس کا پتہ بتا دو —— میں بھی صدیوں سے اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں"

اس کی زبان سے یہ سن کر میں سکتے میں رہ گئی۔

اور اب مجھے کسی کی تلاش نہیں ہے میں نے دکھوں کی صلیب اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر جینا سیکھ لیا ہے ——..

بریک

شبنم مرزا

ڈین ہیگ (ہالینڈ)

وہ میری زندگی میں یوں دبے پاؤں چلی آئی تھی جیسے ڈاکیہ محبوب کا خط چپکے سے لیٹر بکس میں چھوڑ جاتا ہے۔ اور شام کو تھکا ہوا ذہن اُس خط کو پاکر جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔

اُس نے بھی مجھے پہلے خط ہی لکھا تھا۔ جو ایک شام پوسٹ مین میرے لیٹر بکس میں تھما گیا تھا۔ بالکل نئی تحریر —— کچھ دیر تو وہ خط اجنبی سا میری میز پر پڑا رہا تھا۔ کتنا اجنبی تھا وہ خط...... اور پہلی بار میری اُنگلیوں کی گرفت میں آتے ہوئے کتنی جھجک محسوس کر رہا تھا۔ خط کا مضمون بھی بالکل اجنبی تھا۔ جیسے بس میں سفر کرتے ہوئے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی کوئی اجنبی لڑکی بس کے ہچکولوں سے اپنے وجود کو کسی اور کے جسم سے بچانے کی خاطر سمٹ سمٹ رہی ہو اور...... اچانک بس میں ایک جھٹکے سے بریک لگا ہو اور اس کا گداز جسم میرے وجود سے ٹکرا گیا ہو۔ وہ گھبرا کر اُٹھی ہو —— پھر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے سوری کہا ہو۔

شاید یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ میری تخلیقات سے بے حد متاثر ہو اُٹھی تھی۔ اور اپنے پہلے خط میں اُس نے مجھے مبارکباد کے ساتھ ہی آئندہ چھپنے والی تخلیقات کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ جواب میں نے بہت تاخیر سے دیا تھا جیسے بس میں بریک لگنے پر بس کچھ پل کے لیے رُک جاتی ہے۔ میں بھی تھم گیا تھا۔

ایک شام میں نے اُسے اپنی آئندہ چھپنے والی کہانیوں کی فہرست لکھی تھی اور ساتھ ہی اس سے دریافت کیا تھا کہ اس کا کیا شغل ہے ——
جواب بہت جلد ہی آ گیا تھا۔ خط پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے شاید ہم ساتھ ہی بس میں سفر کر رہے ہوں اور اچانک بس میں جھٹکے کے ساتھ بریک لگا ہو۔ لیکن...... آج سوری کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپا نہیں تھے۔ کیونکہ اُسے پتہ ہو گیا تھا کہ اب ہر روز کا سفر ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہر روز بس میں بریک لگے۔

اب باقاعدگی سے اُس کے خطوط آنے لگے تھے۔ اس نے کسی رسالے میں میری تصویر دیکھی تھی۔ اس کے بعد ہی اُس نے مجھ سے تصویر اور حالات زندگی مانگے تھے۔ جواب میں نے تو لکھ دیا تھا لیکن اُصولاً پہلے اُس سے اس کی تصویر مانگی تھی اور تصویر اس نے بھیج دی۔ تصویر میں نے بھی بھیجا۔ اپنے حالاتِ زندگی بھی اور ساتھ ہی اُسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے وطن سے دور جانے کے بجائے اپنی تنہائی کا ساتھی تلاش کر لے تاکہ اس کی اس کی زندگی کی صحیح تعمیر ہو سکے۔ اور خط کے آخیر میں اپنی بہت پرانی غزل لکھ دی تھی۔
جواب آیا لیکن شکایت بھرا۔ اُس نے میری تصویر کو بہت سراہا

اور ہمالیہ بالا نے میرے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف، صاف تحریر کر دیا کہ اس کا آئیڈیل ہیرو بالکل مجھ جیسا ہے۔

پھر...... رفتہ رفتہ ہماری دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔

میں نے اس کے سامنے اپنی شادی کی پیشکش کی جسے اس نے بخوشی منظور کر لیا ــــ اور ــــ مجھے یوں لگا جیسے آکاش میں کوئی بجلی چمکی ہو ــــ لیکن ــــ وہ دھڑام سے مجھ پر گر گئی۔ ▲▲

ایک ناقابلِ فراموش لمحہ

ڈی، کے، کنول

بڈگام ــ ۱۹۱۱۱۱ (کشمیر)

ہماری ناٹک منڈلی ہر سال شیوراتری کے تہوار پر کوئی نہ کوئی دھارمک ڈرامہ اسٹیج کیا کرتی تھی۔ ہمارے ڈرامے دیکھنے کے لیے آس پاس کے گاؤں سے لوگ پیدل چل کر آتے تھے اور کڑاکے کی سردی میں گھنٹوں کھلے میدان میں بیٹھ کر بڑے شوق اور دلچسپی سے ڈرامہ دیکھتے ــــ

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک اسٹیج آرٹسٹ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ریہرسل کے لیے ہمیں کہیں دور جانا پڑتا تھا اور کسی کھلے میدان میں آسمان کی چھت کے نیچے ریہرسل کیا کرتے تھے۔ ہمارے جنون کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگ اپنے ذاتی اخراجات گھٹا کر کچھ پیسے پس انداز کر لیتے تھے اور ان پیسوں سے میک اپ وغیرہ کا سامان خریدا جاتا تھا۔

میں اس ناٹک منڈلی کا میک اپ مین تھا اور یہ کام میں بغیر کسی معاوضے کے کیا کرتا تھا۔ گھر والے میرے اس شغل کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے اور ہر روز مجھے گھر والوں کی جلی کٹی سننا پڑتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی گھر والوں سے آنکھ بچا کر اپنے آرٹسٹوں میں پہنچ جایا کرتا تھا اور کئی کئی راتیں اُن کے ساتھ جاگ جاگ کر گزارا کرتا تھا۔

ڈرامہ "شیو پاروتی" اسٹیج ہونے والا تھا۔ ڈرامہ کا مسودہ ہم نے مل جل کر تیار کیا تھا۔ ڈرامے میں شیو کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ سب نے شیو کے کردار کے لیے مادھو جولال کی سفارش کی۔ مادھو جولال غضب کا آرٹسٹ تھا۔ بلا کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس نے بلا کی آواز پائی تھی۔ مکالموں کی طرزِ ادائگی میں مادھو جولال کو جو قدرت حاصل تھی اس نے دوست تو کیا دشمنوں کو بھی اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔

میں مادھو جولال کے میک اپ میں مگن تھا۔ میک اپ کے دوران مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ہاتھ کسی اور کے اشارے پر چل رہے ہوں۔ میرے ذہن میں تو بس شیو کی ایک دھندلی سی شبیہ تھی۔ جس وقت میں مادھو جولال کا میک اپ کر رہا تھا تو

مجھے لگا جیسے کوئی میرے ذہن کے در و دیوار کو پھاند کر میرے سامنے آکھڑا ہوا ہو اور مجھ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو کہ میں ہی اشیوہن کمل —

—— میں ہی اشیو ہوں ——

جب میک اپ ختم ہوا تو میں نے باہر جانے کے لیے اپنا سامان سمیٹنا چاہا کہ میرے تایا کنہیا لال تیزی سے اندر داخل ہوئے اور مادھو جولال کو یکٹک دیکھنے لگے۔ مادھو جولال جہاں کھڑا تھا وہیں پُر وقار انداز میں کھڑا رہا۔ تایا مارے عقیدت کے دو زانو ہو گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے —— " پربھو! آپ کی شرن میں آیا ہوں —— آج میری منو کامنا پوری کر دیجئے "

میں نے ایک نظر مادھو جولال اور ایک نظر تایا پر ڈالی —— دونوں سنجیدہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مادھو جولال تایا کی اس حماقت پر ایک زور دار قہقہہ لگا دے گا اور پھر اپنی چھاتی ٹھونک کر کہے گا —— " مان گئے نا ہمیں تایا۔ آپ جیسے گھاگ کو بھی ہم نے بدھو بنا دیا "

مگر ایسا نہیں ہوا —— مادھو جولال نے بہت ہی گمبھیر لہجے میں تایا سے استفسار کیا۔ " تمہاری منو کامنا کیا ہے بچہ ؟ "

میں اس اندازِ تخاطب پر برافروختہ ہو اٹھا مگر تایا کے ڈر سے چپ رہنا پڑا۔ مادھو جولال کے اس سوال پر تایا کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ خوشی اور اندوہ کی ملی جلی کیفیت میں بولے۔

" بھگوان میری ایک ہی اچھا ہے کہ میں آج کی رات سوؤں تو پھر کبھی نہ اٹھوں اور میری اکلوتی بیٹی کو میرے بعد ایک اچھا سا ور اور گھر ملے "

تتھا استو —— تتھا استو "

میں جہاں کھڑا تھا وہیں سن ہو کر رہ گیا۔ آخر تایا زندگی سے اس قدر بیزار کیوں تھے ؟ —— تایا سے پوچھنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ بادلِ نخواستہ میں وہاں سے کھسکا اور ایک کونے میں جا کر چھپ گیا۔

ڈرامہ اسٹیج ہوا اور بہت ہی پسند کیا گیا۔ ڈرامہ کے ہنگامے میں وہ بات میں بھول گیا جو کانٹے کی طرح میرے دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔

اگلے روز میری آنکھ شور و غل کی وجہ سے کھلی۔ آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو گھر کے ہر فرد کو دہاڑیں مارتے ہوئے روتے پایا۔ اور مجھے یہ سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی کہ تایا کا انتقال ہو چکا ہے یعنی ان کی منو کامنا ایکدم پوری ہو چکی ہے۔

آج جب بھی کبھی مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے جسم میں کپکپی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ جس آدمی کا میں نے میک اپ کیا تھا وہ مادھو جولال نہیں کوئی اور تھا —— کیونکہ مادھو جولال کو خود بھی معلوم نہیں کہ اس نے تایا کو کوئی وردان دیا تھا —— ▲▲

تبصرہ کیلئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے

ادب

لیکن ــ جوگندر پال

______ علی احمد فاطمی

مسدود راہوں کے مسافر ــ رضوان احمد

______ علی احمد فاطمی

بے نام مسافت ــ کشور ناہید

______ عتیق احمد عتیق

اقرار ــ رؤف خیر

______ عتیق احمد عتیق

اوراق ــ وزیر آغا، سجاد نقوی

______ شبیر آصف

عکس آئینے کے ــ ہرچرن چاولہ

______ مشتبیر ہاشمی

کوئے ملامت ــ کرشن موہن

______ مشتبیر ہاشمی

"لیکن"

مصنف جوگندر پال

قیمت سولہ روپئے

صفحات دو سو ترپن (۲۵۳)

پبلشر اُردو پبلشر ــ نظیر آباد، لکھنؤ

اس امر سے سبھی اتفاق کریں گے کہ کم لکھنا لیکن اچھا لکھنا اور بہت اچھا لکھنا ہزار گنا بہتر ہے نسبتاً اس کے کہ زیادہ لکھا جائے اور کم اچھا لکھا جائے۔ نجانے جوگندر پال جیسے ماہر افسانہ نگار سے ان دنوں یہ کس نے کہہ دیا کہ زیادہ لکھنا ادب میں زندہ رہنے کا واحد راستہ ہے۔ پچھلے دنوں وہ باقاعدہ اپنے عہدے سے چھٹی لے کر اورنگ آباد سے دہلی آکر قلع بند ہو کر قلم اور کاغذ سے چپک کر پابندی سے تھوک کے حساب سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُردو کے ہر اچھے اور بُرے رسالے میں ہر سائز کے افسانے چھپوا رہے ہیں۔ کسی رسالے میں طویل افسانہ ہے کسی میں بالکل مختصر (منی کہانی) کہ دو سطر میں بات کہہ دی۔ گذشتہ سال شاید ہی کوئی ایسا رسالہ بچ رہا جس میں جوگندر پال نہ چھپے ہوں۔ چاہے وہ رسالہ شمال کا ہو یا جنوب کا بس اُردو زبان کا ہونا شرط ہے۔

بُری طرح سے چھپے تو خوب آمدنی ہوئی اور اسی آمدنی سے انہیں افسانوں کی بھیڑ میں سے بیس افسانے منتخب کر کے ایک مجموعہ "لیکن" کے نام سے چھاپ دیا۔ دوسرا تیار ہو رہا ہوگا۔ اس کے بعد اور آئے گا، اس کے بعد پھر اور آئے گا کیونکہ افسانے بہت اتنے زیادہ ہیں۔ اس طرح سے وہ ایک درجن سے زیادہ افسانوی مجموعے کے مالک ہو جائیں گے۔ جس کے پاس بارہ پندرہ مجموعے ہوں تو دیکھیں کیسے کوئی بڑا افسانہ نگار نہیں مانتا؟ جوگندر پال جس عہدے پر مامور ہیں جو آن و بان ہے وہی شان و شوکت ان کے مجموعے میں ہونی چاہیئے تھی لیکن ان کا یہ مجموعہ پچھلے تمام مجموعوں کے مقابلے میں سائز میں مزید چھوٹا ہے لیکن طباعت، کتابت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے پھیکا ہے۔

عام طور پر افسانہ نگار اپنے کسی ہٹ افسانے کے عنوان سے اپنے مجموعے کا نام جوڑ دیتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے خاص طور پر یہ رسم اپنائی ہے۔ چوں کہ ان کے عنوانات نادر قسم کے ہوتے ہیں۔ دلچسپ عنوانات ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا دلچسپ لبادہ اوڑھے ہوں تو سرسری نظر سے دیکھنے والا چونک ضرور پڑتا ہے اور چونکانا ہی ان کا اہم مقصد ہوتا ہے۔

چند نئے افسانہ نگاروں کے عنوانات ملاحظہ ہوں: —

پنجرے کا آدمی، گرتے ہوئے درخت، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، تتلی، روشنائی کی کشتیاں، الف لام میم، راستے اور کھڑکیاں — وغیرہ۔ تو آئیے سب سے پہلے ان کے عنوان پر ہی بات کریں۔ اس مجموعے کا نام "لیکن" ہے۔ بالکل نیا نام ہے لیکن اس میں اس نام کا کوئی افسانہ نہیں ہے۔ یہ انوکھی بات ہے۔ اس کا نام لیکن کیوں رکھا اس کی وضاحت کرتے ہیں آپ ملاحظہ کر لیجئے —

"عملِ تخلیق اسی لئے مہذب تر ہے کہ خود کار اثبات کو شک اور تجسس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی تحریک سے جنگل اور بستیوں کے روپ اختیار کرنے لگتے ہیں اور زندگی اپنی بہیم کثرت کے باوصف یہ ذہنی ہجوم کی تصویر پیش کرنے سے بچ جاتی ہے۔ شک کا احساس ہونے لگے تو ماضی کی جنت ضرور چھن جاتی ہے لیکن اس کی کربناک محرومی کے باعث مستقبل کی ایک اور مسرت آگیں جنت کے امکانات ابھرنے لگتے ہیں اور یوں ہمارے جینے مرنے کی دلچسپیوں میں انحطاط واقع نہیں ہوتا۔

تخلیق کار کو ازل سے ہی "لیکن" کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس کی پہلی ذمہ داری شاید یہ ہے کہ ہر دور میں باغی، بدگمان یا مہاجر زندگی کی بازآبادکاری کا ادراک مہیا کرتا رہے"[۲۵]

دل سوز ترین صفحات پر ان کے بیس افسانے کوٹے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ بھی کہانیاں ہیں۔ ان سطروں میں ہر افسانے کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا صرف ایسی ہی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ ہوگا جس سے اس مجموعے کا مختصر تعارف ہو سکے۔

کافی تلاش و جد و جہد کے بعد ان بیس افسانوں میں کوئی بھی افسانہ مجھے ایسا نہیں مل سکا جو اپنے اندر خاص انفرادیت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے افسانے معیاری نہیں بلکہ اچھے ہیں اور بہت اچھے ہیں۔ لیکن موضوع، کردار، مقصد کے اعتبار سے کوئی بھی افسانہ اپنی الگ الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ افسانہ نگار ہر افسانے کو شروع تو ایک ہی موضوع سے کرتا ہے لیکن اس کے ذہن میں، اتنی ساری فکریں ہیں۔ اس کی زندگی میں اتنی تلخیاں ہیں اور اس کے دماغ میں اس قدر منتشر خیالات ہیں کہ وہ کسی افسانے میں کسی طرح کا ربط نہیں دے پاتا۔ "محمود" "بادشاہ" "کتھا ایک بیپل کی" "طور" "بازیچۂ اطفال" "پاتال" وغیرہ اس مجموعے کے اچھے افسانے ہیں۔ ہر افسانہ بے ربط سا ہے لیکن پریشانیوں، کھوکھلے پن میں بھی تو کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ایک واقعہ دوسرے واقعات سے جڑا ہوا ہے۔ ایک تجربہ دوسرے تجربات میں پیوست ہے۔

"کتھا ایک بیپل کی" میں ان کا فن کافی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں اس افسانے میں بیپل علامت ہے قدیم تہذیب کی جس کے گھونسلے میں متعدد قسم کے پرندے رہتے ہیں۔ کبوتر بے ضرر اور پرانا و فرسودہ کوا بھی ہے۔ ظلم و جبر کا ناگ کوّے کو کھا جاتا ہے لیکن دیگر پرندوں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔ صرف بیپل دکھی ہوتا ہے وہ کوشش تو کرتا ہے کہ ناگ کو کچل دے لیکن وہ بے بس ہے اس میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ بنیادی طور پر ناگ کے بالکل برعکس ہے۔ بڑے آرام سے ناگ فرسودہ پرندوں کو نقصان پہنچاتا ہوا، ہنستا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بیپل دیکھتا رہتا ہے۔ اتنے بڑے نقصان کے بعد بیپل کے درخت کے پاس نئی تہذیب کا ایک نیا پودا زمین کو توڑ کر سر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تب بیپل اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"ذرا اور زور لگاؤ میرے ننھے دوست ورنہ ابد تک تمہارے سینے میں سانپ لوٹتے رہیں گے، شاباش —— اور زور لگاؤ —— مٹی سے باہر نکل کر تمہیں ظلم کا پیچھا کرنا ہے۔ دوڑ دوڑ کر جینا ہے، شاباش —— ابھی ایک جگہ پر اونچے

ہوتے گئے؟ تو بستی میں جا دھنسو گے ۔ قیامت تک زندہ درگور رہو گے ۔ مرے ہوگے لیکن تمہیں زندہ رہنا ہوگا ـــــ زندگی تمہاری سزا ہوگی ـــــ شاباش ـــــ!!

(کتھا ایک بیل کی ۔ ص ۱۲۶)

اس افسانے میں جوگندر پال کا فنی عروج یہ ہے جوان کے گہرے شعور و فکر کی بصیرت دیتا ہے ۔ نئی تہذیب و پرانی تہذیب کی ٹکر ۔ ظالم اور مظلوم کی لڑائی ۔ ظالم ناگ اور مظلوم بیل کی لڑائی اس نکتے کی طرف بہترین اشارہ کرتی ہے ۔ نیا اگتا ہوا پودا نئی تہذیب اور نئی قوم کی ترجمانی کر رہا ہے ۔

طور میں نفسیات و جنسیات کے باریک نکتے ہیں ۔ پامالی میں یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ساری دنیا میں کرفیو کا سا ماحول ہے ۔ انسان کے چلنے کی تشبیہ بھیلجھڑیوں کے چھوٹنے اور انسان کے قہقہوں کی تشبیہ پٹاخوں کے چھوٹنے سے دی گئی ہے جو دل کو لگتی ہے ۔

روز روز ہونے والے اخلاقی ڈرامے انسان کو کس قدر غیر فطری بنا دیتے ہیں یہ بات بازیچۂ اطفال میں کہی گئی ہے ۔ ایک دوسرے کو بلا وجہ متاثر کرنا ۔ بلا وجہ حیران ہونا ۔ ایک ذمّہ دار انسان دوسرے ذمّہ دار انسان کے ساتھ روزانہ کیسے کیسے خوبصورت ڈرامے کرتا رہتا ہے اس کی اچھی تصویر ہے ۔ ایمانداری سے بے ایمانی کرنا آج کا شیوہ بن چکا ہے ۔ رام گوپال اور مس آہینگر کے کردار کو پیش کر کے آج کے سماجی رشتوں کے کھوکھلے پن پر اچھا طنز کیا ہے ۔

اس طرف ، ابھی ابھی ، بیس قدمی ، جو ہے سو ہے ۔ بادشاہ ، بھوک پرنب ، اچھے علامتی افسانے ہیں ۔ اتنی اچھی اور اہم باتوں کے باوجود بھی ان میں سے کسی افسانہ میں کوئی الگ بات نہیں کی ۔ دوستوں سے بے تعلق ، اپنے فائدے کی بات ، عدم اعتمادی ، پریشانیاں غرض کہ اسی طرح کے بہت سے ہم معنی الفاظ آج کی زندگی کے اہم ترین عنصر بن گئے ہیں ۔ جس کی وجہ سے کسی خاص موضوع پہ بات نہیں کر پاتا ۔ سارے عناصر کی ایک ہلکی ہلکی کرن سبھی افسانوں میں شامل ہے ۔

افسانے کے بارے میں جو تعریف کی جاتی ہے اُس سے یہ افسانے بالکل برعکس ہیں اور ہونا بھی چاہیئے ۔ آج کا ہر انسان اس قدر اُلجھا اور کھوکھلا ہے کہ انہیں میں سے جو افسانہ نگار بن جاتے ہیں تو وہ براہ راست انہیں کیفیات اور احساسات کو اپنے افسانوں میں سمو دیتے ہیں ۔ افسانہ نگار ایک موضوع کو اٹھاتا تو انتہائی بے ربطی کے ساتھ سارے عناصر ایک دوسرے سے چپکتے چلے جاتے ہیں کہ قاری بے پناہ اُلجھ جاتا ہے ۔ اگر یہ قاری کی بھی وہی اُلجھنیں ہیں لیکن افسانہ نگار جس انداز سے پیش کرتا ہے اُس سے اس کی اُلجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ۔ افسانہ نگار افسانہ اسی لیے لکھتا ہے وہ آج کے دور کی عکاسی کرے اور دوسروں کو اس کا عکس دکھلائے ۔ ہو سکتا ہے وہ یہی کر رہے ہوں لیکن اپنے طرز کے اعتبار سے ترسیل کے معاملہ میں اکثر ناکام ہو جاتے ہیں ۔

یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ یہ ساری باتیں جوگندر پال محض ایک نئے ڈھنگ اور دکھاوے کے لیے نہیں کر رہے ہیں بلکہ جو محسوس کر رہے ہیں وہی کر رہے ہیں وہ افسانہ شروع کرنے سے پہلے ضرور ایک خاص قسم کے موضوع کو سوچ کر قلم اٹھاتے ہوں گے لیکن ذہن میں خیالات کی بھیڑ اور قلم کی تھرتھراہٹ سے سب گڈمڈ ہو جاتا ہے ۔ اور یہ امر فطری بھی لگنے لگتا ہے ۔

ان کے افسانوں میں عام قاری کو پیچیدگی ، اُلجھن اور گھٹن کا احساس ضرور ہوگا لیکن یہ اُلجھن انہوں نے اسی زندگی سے حاصل کی ہے ۔ جس کو سو ہو اپنے افسانے میں انڈیل دی ۔ اور اس طرح افسانہ نگار و قاری کی اُلجھن ایک طرح سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ۔ اور اسی منزل کو نئے افسانہ نگار اپنی کامیابی کی آخری منزل تصور کرتے ہیں لیکن زبان و ادب کے لیے اور نئے طالب علموں کے لیے یہ نقصان دہ ہے ۔

افسانہ جس نے کھیتوں ، میدانوں ، سڑکوں اور خوبصورت وادیوں میں جنم لیا ۔ عام قارئین کے دل کو بہلانے کے علاوہ سوچنے سمجھنے کی دعوت بھی دی لیکن آج کے نئے افسانے عوام سے مخصوصین تک محدود ہو گئے ہیں ۔ نئے تجربات ، نئی ٹیکنیک کا کوئی استقبال نہیں کرتا لیکن قارئین کی تعداد گھٹانے

ہوئے یہ افسانے مگر آج کے ادب میں ضرور شامل ہو سکیں گے لیکن ان کو وہی حضرات پڑھ سکیں گے جن کی ناکوں پر چشمہ ہوگا، بال پک چکے ہوں گے اور مطالعہ کے لئے ایک الگ پرسکون کمرہ ہوگا۔ عالمی ادب، سماجیات، نفسیات وغیرہ پر اچھی نظر ہوگی لیکن ایسے لوگ کتنے ہیں؟ چند جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان افسانے زیادہ زندگی نہیں پا سکتے۔ خواہ وہ کتنی ہی فن کاری کے نمونے ہوں۔ ہلکے پھلکے صاف ستھرے اور عوامی ادب میں ان کا مقام نہیں بن سکے گا۔

نئے افسانے بند کمرے میں پڑھے جانے والے اور ذہن کی گہرائیوں کو کھنگالنے اور تھکا دینے والے افسانے ہیں ــــ کم از کم لیکن کے مطالعہ کے بعد یہ بات میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ــــ۔

علی احمد فاطمی

مسدود راہوں کے مُسافر

(افسانوی مجموعہ)

از ــــ رضوان احمد

سب جانتے ہیں کہ "مسدود راہوں کے مسافر" کے خالق رضوان احمد وہی رضوان احمد ہیں جو پٹنہ سے ہفت روزہ عظیم آباد ایکسپریس نکالتے ہیں۔ عظیم آباد ایکسپریس ایک رسالہ کا نام ہے جبکہ یہ کسی ٹرین کا نام ہونا چاہیے تھا۔ اسی سے اس رسالے کی دلچسپی اور چٹپٹے پن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجھے بھی اتفاقاً عظیم آباد ایکسپریس دیکھنے کو مل جاتا ہے اور میں اس کو دلچسپی نئے پن کی وجہ سے ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ اب اسی نوجوان ایڈیٹر جو اب افسانہ نگار بھی ہے اس کا پہلا مجموعہ دیکھا تو سامنے چند بدصورت دائرے اور بیچ میں ایک خوبصورت تصویر دیکھ کر عظیم آباد ایکسپریس والی بات یاد آگئی۔ اور آفسانے پڑھنے لگا۔ خوبصورت گٹ اپ چمکدار کور اور اچھے دبیز کاغذ پر اچھی طرح سے لبریز تھو پڑا، اور دیکھ کر بے ساختہ طبیعت پھڑک اٹھی۔ اور جلدی سے پڑھنے بیٹھ گیا۔ ایک ــ دو ــ تین ــــ چار غرضیکہ ایک ہی نشست میں ۱۲۰ صفحات پر پھیلے گئے بارہ افسانے پڑھ گیا۔ سب کے سب پڑھنے کے بعد عظیم آباد ایکسپریس والے رضوان احمد اور ان افسانوں کے خالق رضوان احمد میں بڑا تضاد نظر آیا۔ کہاں وہ بھولا بھالا پیارا سا پرچہ اور کہاں مشکل اور بند کمرے میں پڑھے جانے والے نئے اور تجریدی افسانے۔ بس بات سمجھ میں آگئی۔ کہ عظیم آباد ایکسپریس تو عام لوگوں کے، عام فہم زبان کے ساتھ نکلتا ہے تاکہ پھلے پھولے۔ اور تجارت کرے اور یہ مجموعہ تو خالص پڑھے لکھے اور کتاب نہ خریدنے والے ادبی لوگوں کے لئے۔ کیوں کہ اب تو فیشن چل پڑا ہے کہ جتنے کم لوگ پڑھیں اور جتنا کم سمجھیں اس کے افسانے اتنے ہی اچھے اور معیاری ہیں۔ حالاں کہ ان افسانوں میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی افسانے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے رضوان احمد ابھی کمزور افسانہ نگار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رضوان احمد نے یہ افسانے سوچ کر مشاہدے و مطالعے میں ڈوب کر لکھے ہیں۔ ان کے موضوع اور ان کی طرز تحریر سے ان کی فکر جھلکتی ہے۔ "مسدود راہوں کے مسافر"، "گدھ"، "تاریک شب کے آخری لمحے" وغیرہ میں اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ پہلا افسانہ "لرزتی دیواروں کے سائے" ماضی پرستوں کے لیے اچھا طنز ہے۔ موجودہ دور کی مشینی زندگی سے گھبرا کر جب افسانہ نگار ماضی کی طرف واپس جاتا ہے تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ ماضی میں بھی وہی خوفناک مناظر ملتے ہیں جو حال میں ہیں۔ تیسرا افسانہ "خشک سمندر کی مچھلیاں" میں دکھایا گیا ہے کہ ایک انسان ایک جانور دونوں اپنی اپنی زندگی سے تنگ آکر سکون کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ لیکن دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے یعنی آتم سمرپن۔

غرض اس طرح تمام افسانوں کے موضوعات خالص موجودہ دور کی زندگی کے موضوعات ہیں اور ان کو پیش کرنے کا ڈھنگ بھی جدید سے جدید تر ہے۔ جو نئے طالب علموں کے لیے بے رس اور بے کیف بھی ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ یہ مناسب نہیں ہے لیکن لکھنے والا

سوچتا ہے جب وقت خطرناک ہے۔ انسان پریشان ہے۔ حالات منتشر ہیں۔ موضوع پیچیدہ ہے ہر شے میں اک تبدیلی ہے تو اسی وجہ سے ایسے کربناک موضوعات کو پیش کرنے کا ڈھنگ بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ اس بات میں کچھ تو صداقت ہے، اور کچھ حماقت۔ اور بعض افسانہ نگار یہ حماقت محض فیشن کے طور پر کر رہے ہیں اور گڑھے میں گر رہے ہیں۔ لیکن رضوان احمد نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی اس میں جابجا ہندی کے اچھے الفاظ کا استعمال ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کی جگہ پر آسانی سے اُردو کے الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے لیکن اگر یہ استعمال ہندی اور اُردو کو ہم آہنگ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں تو میں اس قدم کے لیے رضوان احمد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

رضوان احمد نوجوان فنکار ہیں۔ مجموعہ یقیناً خوبصورت ہے لیکن ابھی ان کو اپنے فن کی خوبصورتی کے لیے تھوڑی اور محنت کرنی پڑے گی۔ اپنے خیال اور قلم کے کچے پن کو دور کر کے افسانہ نگاری کے فن کی روح میں گھسنا پڑے گا۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ رضوان احمد کا قلم برابر لکھتا رہے گا۔ اور وہ آئندہ زیادہ اچھے افسانوں اور اس سے زیادہ خوبصورت کتاب سے اہلِ ادب کو نوازیں گے۔

(علی احمد فاطمی)

"بے نام مسافت"

مصنفہ — کشور ناہید

قیمت — پانچ روپے

ناشر — مکتبۂ چلن، سمن آباد، لاہور

ایک شاعرہ اور وہ بھی اتنی ذہین، اتنی طباع اور ایسی قادر الکلام کہ سفیرانِ "بے نام مسافت" کی ہیر تین اپنی آخری حدوں کو چھو لیں۔ نیز ان کی اس تصنیف میں شامل نظمیں پڑھنے والے کشور ناہید کو وہ حق بھی دیدیں، اور پورا پورا حق۔ جیسا کہ انہوں نے خود ہی کہا ہے اور مدعی بھی ہیں کہ — "لاتعلق سے لوگ عمر بھر شعر کہتے رہے ہیں، جو جس سے بن پڑا اُس نے کہا، مجھ سے یہ نہیں ہو پایا — شعر اور سوا محور کو ایک کر دینا تو ممکن ہوا لیکن اتنا ضرور ہے کہ لاتعلقی کا خنک رویّہ کہیں بار نہ پا سکا، ذاتی واردات کا غیر ذاتی انداز میں اظہار کا مسلک بھی کچھ اتنا نہ بھایا، اسی مزے کی تلاش رہی کہ ذاتی واردات کا معروضی اظہار بھی ذاتی ہو۔"

اور اس میں شک نہیں کہ ان کی نظم نگاری کا انداز، اسلوب اور ڈھانچہ بہت ہی رچا ہوا اور انفرادی ہے۔ ساتھ ہی فکری اُپج اور طرزِ ادا اگر تمام تر ذاتی نہیں ہے تو کسی بھی جہت اور اعتبار سے مستعار بھی نہیں ہے گویا وہ اپنے دعوے میں بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مختصر نظم پیش کر رہا ہوں، جو حسن و اثر آفرینی کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

دِل نہیں مانگوں
دِل جو گیا، پھر کس نے پایا
وعدہ نہ چاہوں
وعدہ، رات کے ساتھ ہی ڈوبا
ساتھ نہ چاہوں
ساتھ تو سائے کا بھی جھوٹا
حق نہ جتاؤں
جیز پرائی پر حق کس کا
بھول نہ پاؤں
ہر دکھ، جی کے روگ سے اچھا
کب تک پورے چاند کو پوجوں
کب تک اپنے ہاتھ کو دیکھوں

(سنیاس)

محولہ بالا نظم کے علاوہ کشور ناہید نے اپنی دیگر نظموں کے ذریعہ جن موضوعات کو بھی چھوا ہے انہیں جاوداں بنا دیا ہے۔ اور ایسے بھرپور انداز میں ان کی ترجمانی کی ہے کہ ان کا گوشہ گوشہ نت نئی اور رنگا رنگ خوبیوں کا مرقع بن کر رہ گیا ہے۔

برہان کا یہ نظریہ کہ انسان کی انسان سے لوٹ کھسوٹ کی اس دنیا میں خواب اور ابتسام میں" مسخ ہو جاتی ہیں ، یہ تو درست ہے لیکن ادب' زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کے پھیلاؤ کا کام اگر بے لوث طریقہ پر جاری رکھا جائے اور محض اپنی ذات کو مرکز کائنات گردانتے ہوئے سب کچھ اپنے ہی دامن میں نہ سمیٹا جائے بلکہ خود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ دوسرے بھی ہمارے خلوص بے پایاں سے مستفیض ہو سکیں تو "خواب اور ابتسام میں" کبھی مسخ نہ ہوں ۔ یہی وہ تدبیر ہے جس سے خواب اور ابتسام میں اپنی پاکیزگی بھی برقرار رکھ سکتی ہیں نیز " زندگی میں نظم اور نظم میں زندگی " کو استوار بھی کیا جا سکتا ہے ورنہ اللہ اللہ خیر صلاّ ۔

(عتیق احمد عتیق)

اقراء

مجموعۂ کلام ___ رؤف خیر

قیمت ___ دس روپے

پبلشر ـ گل ز پبلیکیشنز ۴۴۶ پرانی حویلی ۔ حیدرآباد

• جب ملک گردش میں ہیں سات آسمان " سب کچھ ممکن ہے " البتہ بعض چیزیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جنہیں ممکن بنا دینے میں ایک عہد درکار ہوتا ہے ۔ سراج و ولی کے بعد مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی سے لے کر اریب و وقار خلیل تک حیدرآباد کی ادبی تاریخ کا عہد بہ عہد مطالعہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ دبستانِ دہلی و لکھنؤ اور علیگڈھ اسکول کی طرح اس زمین کے فنکاروں نے بھی اپنا ایک علیحدہ اسکول بنوا کر ہی دم لیا حیدرآبادی اکابرین ادب کا یہ ایک بڑا اور قابلِ ستائش کارنامہ ہے ۔ ساتھ ہی خورشید احمد جامی ، ڈاکٹر وحید اختر ، و شاذ تمکنت صاحبان اور ان کے ہمعصروں نے اس قدیم علمی و ادبی مرکز کی تجدید تو کچھ اس ڈھنگ سے کی ہے کہ وہ بہت ہی ماڈرن ہو کر رہ گیا ہے ۔ انہیں جیالوں میں ایک روشن نام ہمیں رؤف خیر کا بھی نظر آتا ہے ۔ جس نے اپنے قصرِ شعری کی تعمیری ساخت کو بہت ہی انوکھے انداز سے پیش کرنے کی اور وہ بھی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے ' ہاں ' اس کے بعض حصے کو وہ ابھی اتنا رنگ و روغن نہیں دے سکے ہیں کہ وہ سرتا سر رنگ و نور کا مرقع بن کر رہ جائے ۔ اس سے یہ نہ تصور کر لیا جائے کہ وہ ایک اچھے اور منجھے ہوئے معمار نہیں ہیں ، بلکہ ان کی توجہ کو دراصل اس طرف مبذول کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے چمنستانِ شعری کے ان گوشوں کو بھی جو ابھی کچھ پھیکے اور سیٹھے رہ گئے ہیں ، کچھ اس حد تک نکھار لیں کہ کاغذ پہ کھلائے ہوئے لفظوں کے یہ تر و تازہ پھول جس کی نظر میں بھی مہکیں ' اس کے بے آب و گیا صحرائے دل کو بھی چمن زار بنا دیں ۔ خدا کرے کہ عام ڈگر سے ہٹ کر ان کی فکری سمت رووہ کی یہ عادت انہیں ان نئی منزلوں سے ہمکنار کر دے ' جن کی جستجو میں جی جان سے وہ سرگرداں ہیں ۔

ان کے شعری گلدستہ کا ایک رنگا رنگ اور مہکتا ہوا ورق ملاحظہ فرمائیے تاکہ آپ بھی اقراء کے صفحات پر پھیلے اور بکھرے ہوئے سلسلۂ افکار کی ایک نظر کڑیاں بھی ملا سکیں اور نتیجہ میں ان کے لوح و قلم کے سدرۃ المنتہیٰ کی سیر بھی کر سکیں ۔

جنوں کے ہاتھ سے تھا یا خرد کی بات سے تھا
لہو لہو وہ کسی تازہ واردات سے تھا
سحر کو بادِ صبا نے مجھے بکھیر دیا
میں اپنی خاک سنبھالے ہوئے تو رات سے تھا
بچا ہوا ہے تو دھوپوں کی زد میں آ کے گرا
وہ برگِ سبز جو موسم کی باقیات سے تھا
ترا خیال ہے اک پیرہن تبسم یا مجھ کو
تجھے خبر بھی ہے کیا کیا میں اپنی ذات سے تھا
رؤف خیر ! تعلق شروع سے اپنا
جمالیات سے تھا عشق شعریات سے تھا

• افتراء میں غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں، سانیٹس اور ترائیلے بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ ادب کی ایک سے زائد دوسری اصناف پر بیک وقت طبع آزمائی سے بہتر یہ ہے کہ کسی ایک صنف پر اتنی دسترس حاصل کی جائے کہ فنکار کا اس کا اپنا ایک انفرادی لب و لہجہ بن کر رہ جائے اور وہ اپنے مخصوص رنگ و آہنگ سے دنیائے ادب میں جانا اور پہچانا جانے لگے۔ اور رؤف خیر کے لئے غزل گوئی کا یہ میدان ان کی دسترس سے کوئی دور نہیں۔

کتاب کا سرورق مصنف کے دستخطی نمونہ (رفیق) کا بہترین عکس ہے۔ جو نہایت سادہ ہوتے ہوئے بھی انتہائی پرُ کار بلکہ جس زاویئے سے بھی دیکھئے آرٹ کی تمامتر خوبیوں کا حامل ہے۔ کتابت و طباعت تو دیدہ زیب ہے ہی۔ (عتیق احمد عتیق)

"اوراق" لاہور

جدید نظم نمبر — مدیران: وزیر آغا، سجاد نقوی

مقام اشاعت — چوک اُردو بازار۔ لاہور

ہمارے یہاں اُردو کا ادبی رسالہ نکالنا بڑا Risky کام سمجھا جاتا ہے۔ اول تو ادبی رسالہ نکالنے کے متعلق کوئی سوچتا ہی نہیں اور اگر بالفرض محال کوئی ہمت کر بھی جائے تو اس کی صحیح الدماغی پر شک ہونے لگتا ہے۔ ایک سیاسی اسٹیج سے کسی لیڈر نے کہا تھا کہ اگر کسی سے بدلہ لینا ہو تو اُسے الیکشن میں کھڑا کر دیجئے۔ میرا خیال اس سے ذرا مختلف ہے کہ اگر کسی کو تباہ و برباد کرنا ہو تو اُس سے اُردو کا کوئی ادبی رسالہ نکلوا دیجئے۔ اول تو ہمارے یہاں اُردو کی کوئی چیز بھی خرید کر پڑھنے کا رواج نہیں ہے۔ چہ جائے کہ ادبی رسالہ ہو۔ ادیب و شاعروں بھی خرید کر پڑھنے کو خلاف مذہب سمجھتے ہیں۔ ان سے اگر بہت تعاون ہوا تو دو چار سالانہ خریداروں کو پھانس دیا۔ اس کے صلے میں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ ہر شمارے میں ان کی ایک آدھ تخلیق چھاپ دی جائے۔

پاکستان میں بھی کم و بیش ہمارے ہاں کی سی ہی صورتحال ہے۔ پتہ چلا ہے کہ سیاسی Encouragement کے باوجود وہاں بھی کوئی خالص ادبی رسالہ ہزار' دو ہزار سے زیادہ نہیں چھپتا۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر وزیر آغا نے "اوراق" کے جدید نظم کا ایک ضخیم نمبر نکال کر اپنا مخبوط الحواسی کا بڑا جامع ثبوت پیش کیا ہے۔ تقریباً چھ سو صفحات کے اس نمبر میں جدید نظم کے تسلسل اور ارتقا ء کا بھر پور جائزہ لیا گیا ہے۔ جدید نظم نمبر پیش کرنے کے مقصد کے تحت اداریہ میں لکھتے ہیں۔

"ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ جدید اُردو نظم نے اپنی بے پناہ وسعت اور پھیلاؤ کی دھن میں قاری سے ایک حد تک رشتہ منقطع کر لیا تھا اسے بحال کیا جائے"

یہ ضخیم نمبر پیش کر کے ہو سکتا ہے کہ "اوراق والوں" نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا ہو کہ جدید نظم نے قاری سے اپنا رشتہ بحال کر لیا ہے لیکن ایک عام قاری کی حیثیت سے میں ایسا نہیں سمجھتا۔

انسان شاعری اس لئے پڑھتا ہے کہ جو حظ یا لذت شعر یا نظم سے حاصل ہوتا ہے وہ نہ کسی دوسری صنف ادب سے ہو سکتا ہے نہ دیگر علوم سے وہ چیز جو انسان کو اچھا شعر یا اچھی نظم پڑھنے پر ملتی ہے اور ایک خاص قسم کے کیف سے دوچار کرتی ہے اسی میں شاعری کا مقصد، اس کا فن اور زندگی سے اس کا تعلق وغیرہ مضمر ہیں۔ اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو پھر جدید نظموں کے سلسلے میں کیا کہا جائے۔ کہ غیر معمولی ابہام سے بوجھل ہیں۔ پیچیدگی، الجھاؤ اور دقت پسندی اس کی خوبیاں ہیں۔ غیر ملکی ادب کے استعارات اور روایات وغیرہ کا استعمال فیشن سا بن گیا ہے۔ اس فیشن پریڈ میں شاعر یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس کا قاری غیر ملکی ادب سے واقف بھی ہے یا نہیں۔ یہ قاری کا بالکل فرض نہیں ہے کہ وہ جدید نظموں کو سمجھنے کے لیے غیر ملکی ادب کو کھنگالتا پھرے۔ اور بالفرض محال وہ اپنے آپ کو نظم سمجھنے پر آمادہ کر بھی لے تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ کامیاب بھی ہو گا۔ ایسی صورت میں "ریزے کا خداحیہ" کی تلاش کرنی ہوگی جہاں سے

اچھی طرح نظم سمجھ سکے گا۔

میں نظموں میں ابہام، علامت نگاری اور اشاریت پسندی کا منکر نہیں۔ میرے منکر ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہی تو کامیاب نظموں کی روح ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک قاری کی ذہنی سطح کا خیال رکھا نہ جائے گا اُس وقت تک قاری سے رشتہ استوار کرنے میں تخلیق کامیاب نہیں ہو سکتی۔

غالب کا بھی اس وقت تک اپنے قاری سے رشتہ استوار نہ ہوا تھا جب تک کہ انہوں نے مشکل پسندی کو خیر باد نہ کہہ دیا تھا۔ حالاں کہ اس کا انہیں بے حد قلق تھا۔ ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

انگریزی، فرانسیسی اور روسی وغیرہ میں جو شاعری ہو رہی ہے وہ اپنے قاری کی ذہنی سطح کے مطابق ہے لیکن اُردو ادب کا قاری ذہنی طور پر ابھی اتنا باشعور نہیں ہوا ہے کہ وہ جدید نظموں کی روح تک پہنچ سکے۔ خود وزیرآغا صاحب کی نظم "ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے" کے تجزیے میں بلراج کومل جیسے شخص نے قیاس سے کام لیا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کا ایک عام قاری اُسے سمجھ کر حظ اُٹھا سکے گا۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "حلقۂ اربابِ ذوق" کی تقریباً تمام نظمیں صرف ادیبوں اور نقادوں کے لیے ہی لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایسا کوئی فن کار نظر نہیں آتا جس نے عوام کے لیے کچھ لکھا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کہنے دیجیے کہ آج کتنے لوگ ہیں جنہیں میراجیؔ، ن۔م۔ راشدؔ یا مجید امجد کی نظمیں زبانی یاد ہیں۔ اس کے برخلاف آج بھی فیضؔ، ساحرؔ، سردارؔ اور مخدومؔ کی بے شمار نظمیں برصغیر ہند و پاک کے بے شمار لوگوں کے دلوں میں دھڑک رہی ہیں۔ جب تک عوامی اسلوب اپنایا نہیں جاتا تب تک قاری سے رشتے کی بحالی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آج جو جدید شاعری ہو رہی ہے وہ سو سال بعد عوامی اسلوب اختیار کر لے۔ ایسی صورت میں غالبؔ ہی کی طرح کہنا پڑے گا ؎

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

جس طرح کرنے اور باتیں بنانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی طرح نمبر نکالنے اور تبصرہ کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لائقِ تحسین و صد آفریں ہیں وہ لوگ جنہوں نے سنگلاخ چٹانوں سے "جوئے شیر" نکالی ہے۔ "اوراق" کا حسین اور ضخیم جدید نظم نمبر اُردو ادب کی ایک اہم دستاویز ہے۔ تیس ۳۰ نظموں کا جو تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اُس سے ادب کے قاری کو جدید نظمیں سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ "انتخاب" میں تقریباً تمام مشاہیرِ ادب کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں لیکن جوشؔ ملیح آبادی کی غیر موجودگی کھٹکتی ہے۔ حالاں کہ جوشؔ کا خاص طور پر اُردو نظم میں بڑا Contribution ہے۔ میراجیؔ کے "اقوالِ زریں" سے اوراق کی خالی جگہوں کو پُر کیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ کچھ دوسرے فن کاروں کو بھی اس میں شریک کر لیا جاتا۔

خوبصورت کتابت، عمدہ گٹ اپ اور معیاری کاغذ کے اس ضخیم نمبر کی قیمت ۱۵ روپے بہت ہی کم ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ بھارت کے بک اسٹالوں پر بھی یہ جدید نمبر دستیاب ہو سکتا۔

(مشتبہ آصف)

"عکس آئینے کے"

مصنف — ہرچرن چاولہ

قیمت — ۸ روپے

ملنے کا پتہ — ۳۱۴، کالکاجی۔ نئی دلی ۱۱۰۰۱۹

"عکس آئینے کے" ہرچرن چاولہ کے پندرہ ۱۵ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے جو ۱۹۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ نئے معاشرے میں فرد کے مقام، اُس کی نفسیات کی تحقیق اور اپنے آپ پہچاننے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ نیازؔ فتح پوری نے بہت پہلے لکھا تھا۔

"افسانہ نگاری اب صرف خیال سے لطف اندوز ہونے کا نام نہیں ہے

بلکہ وہ اب عملی زندگی کی چیز بن گئی ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا، لیکن اب معاملہ حقائق کا ہے، جس کے لئے خاک چھاننا ضروری ہے۔"

چاولہ صاحب کو بھی "دوسرے" سے لے کر "احساس کی زنجیریں" تک پہنچنے کے لئے آبلہ پائی کی منزل سے گزرنا پڑا ہے۔ احساسی عمل کے دوران انہوں نے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ان کے کرداروں کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ بھی کیا ہے۔ اُن کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کیا ہے۔ اور پھر ہر واقعہ اور ہر درد اُن کی آنکھوں کے بہترین اور حساس سپنوں سے گزرتا ہوا اپنی پوری شدت اور بھرپور محبت کے ساتھ اُن کے دل پر نقش ہوتا رہا جسے وہ قلم کی نوک پر لا کر صفحۂ قرطاس کے سپرد کرتے رہے۔

چاولہ صاحب کے یہاں سب سے پہلے ہماری ملاقات "دوسرے" سے ہوتی ہے۔ دوسرے جسے محرومیوں نے ایک عادی مجرم بنا دیا ہے۔ انسانی فطرت کی معصومیت کو "دوسرے" کے کردار میں اتنی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے کہ بے اختیار اُس پر فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

• انسانی لہو" انسان کی کمزوریوں اور آج کی تہذیب کے بخشے ہوئے ہولناک عذاب کی کہانی ہے جسے افسانہ نگار نے نئی تکنیک اور نئے انداز سے لکھا ہے۔ کہانی کے استعاراتی و علامتی انداز نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

• موت کا رقص" "بندیا میرے نام کی"، "ٹوٹا ہوا افق"، "لہریں اور کنارے"، "احساس کی زنجیریں"، اور "فاصلے" میں چاولہ صاحب کی گہری فنی واقفیت اور فنکارانہ مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں سماجی زندگی میں ہونے والے ہر قسم کے استحصال اور صنعتی زندگی کی تہذیبی قدروں پر بھرپور نشتر زنی کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی کے اُس احساس کی ترجمانی کی ہے۔ جسے سب محسوس کرتے ہیں۔

• دھلی کی آخری صدا" محبت اور نفرت کی کشاکش ایسی کہانی ہے جو دھلی کے ایک گرتے ہوئے کھنڈر سے ابھرتی ہے۔ اور پھر سارے آسمان پر چھا جاتی ہے تو کھل کر برس پڑتی ہے۔ اور پھر سارا منظر صاف ہو جاتا ہے۔

یہ افسانے اگرچہ بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کی روانی، برجستگی، اور کہانی کا تجسس قاری کے دامن کو آخر تک مضبوطی سے تھامے رہتا ہے۔ چاولہ صاحب کے افسانوں میں ایک بات جو قاری کو بار گزرتی ہے وہ ہے افسانوں کا روایتی انداز۔ یہ افسانے مرکزی تصور اور وحدت خیال کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔ جب کہ نیا افسانہ اپنے پرانے معیاروں کو کب کا توڑ چکا ہے۔ وہ اب بہت آگے پہنچ چکا ہے۔ اور اس جگہ پہنچ چکا ہے جہاں افسانے کے لیے مرکزی خیال کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ چاولہ صاحب ادب کی بدلتی ہوئی قدروں اور رفتار سے واقف ہیں۔ اگر وہ نئے انداز کو اعتدال اور توازن کے ساتھ اپناتے ہیں (جیسا کہ انہوں نے اپنے افسانے "انسانی لہو" میں استعاراتی و علامتی انداز کو بڑی خوبی سے برتا ہے) تو وہ اپنی منفرد آواز پیدا کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

(مشتیر ھاشمی)

"کوئے ملامت"

مصنف — کرشن موہن

ناشر — نیشنل اکاڈمی

قیمت — دس روپے

ملنے کا پتہ — انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی

کرشن موہن ایک درجن سے زائد کتابوں کے تخلیق کار ہیں۔ اُن کی ایک تصنیف "کوئے ملامت" اس وقت میری گفتگو کا موضوع ہے۔ کرشن کا "شبنم شبنم" سے "کوئے ملامت" تک کا سفر ادب میں نئے پن کی تلاش کا سفر رہا ہے۔ مروجہ موضوعات سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شاعری کا واحد موضوع صرف اور صرف جنس و جسم کو قرار دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں حسن و عشق، احساسِ جمال اور اس سے پیدا شدہ جذبات

سا اظہار انہوں نے بڑی بے باکی بلکہ بڑی بے حجابی سے کیا ہے۔ اور دراصل اسی اظہارِ بے حجابی نے انہیں ملامتیوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

"بکوئے ملامت" کا آغاز کتاب کے گرد پوش پر محمود سعیدی کی ایک مختصر سی تحریر سے ہوتا ہے جسے آپ چاہیں تو تبصرہ بھی کہہ لیں۔ جس میں انہوں نے کرشن کی شاعری کی فضا کو نہ صرف طلسماتی بلکہ "تزکیۂ نفس" اور "تطہیرِ فکر" کے نئے علاقوں کی بازیافت بھی قرار دیا ہے۔ لیکن جب ہم کرشن کے ساتھ کچھ دور چلتے ہیں تو نہ ہی ہم "طلسم خانۂ حیرت" تک پہنچتے ہیں اور نہ ہی ہمیں "تزکیۂ نفس اور تطہیرِ فکر" کی کوئی منزل ہاتھ آتی ہے۔ بالکل اسی کی طرح کمار پاشی نے بھی اپنے پیش لفظ میں کرشن موہن کو "وشوامتر کی آتما" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ مذاق انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ نہ صرف کرشن موہن بلکہ وشوامتر کی آتما کے ساتھ بھی کیا ہے۔ کیوں کہ ادب کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اتنا تو وہ بھی جانتے ہی ہوں گے کہ "وشوامتر" ظلم و زیادتی کے خلاف حق و انصاف کے بے باکانہ اظہار کی علامت ہے۔ نہ کہ انسان کے سفلی جذبات کے بے حجابانہ اظہار کی۔

کرشن کو چاہے جو بات کرنی ہو۔ ان کا چاہے کوئی موضوع ہو۔ وہ بات ان کے یہاں عورت کے لب و رخسار سے چلے گی اور اس کے پستانوں سے ہوتی ہوئی گزرے گی۔ دیکھیے صفحہ ۱۵ کی نظم "تیل کے لیے دُعا"

"ایک جزیرے میں کچھ ایسی عورتیں پائی گئیں
جن کے جسموں پہ تھے پستان جا بجا
پشت، بانہوں، پیٹ اور رانوں کے پستانوں سے بھی
ان کے بچے رات دن پیتے تھے دودھ
اپنی دھرتی پر بجائے دودھ کے — تیل کے چشمے ہی پھوٹیں جا بجا
اے حجابوں کے خدا۔

اس طرح "بادام"، "ہمسفر"، "نیرو اور اس کی موسیقی"، "بتی میلہ"، "اخلاص"، "مشغلے" اور "کیبرے" قارئین کے حیوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں قرار دی جائیں گی۔ کیوں کہ انہوں نے ان موضوعات کے تعلق سے انسانی جبلتوں اور ان کے اندرونی رشتوں کی کھوج لگانے کی بجائے صرف جنسی جذبات کو ان کی پہلی ہی سطح پر دیکھا ہے۔ اگر وہ ان جذبات و احساسات کے محرکات تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو شاید وہ ان نظموں کی تخلیق کا جواز پیش کر سکتے تھے۔

بکوئے ملامت کی اکثر نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ اور ان نظموں کا بنیادی خیال بھی اتنا اہم نہیں ہے کہ قاری چونک پڑے۔ مثلاً صفحہ ۲۵ کی یہ نظم — "استعارے" ؎

فرانسیسی حسینائیں۔ کبھی پیتل کی انگیائیں پہنتی تھیں۔
اُتاری جاتی تھیں — صرف سونے سے پہلے جب یہ انگیائیں
تو ان کو سُرخ کوئلوں سے بھر کر
اپنی چارپائی کے سرہانے کھونٹیوں سے باندھ دیتی تھیں
وہ ایسے اپنے بستر گرم رکھتی تھیں
اسی کارن کہا کرتے تھے لوگ انگیاؤں کو ہیٹر
اسی باعث کہا کرتے تھے پستانوں کو انگارے ـــــ ..

یا پھر صفحہ نمبر ۵ "ایک دور افتادہ ٹاپو میں" صفحہ ۴۵ "قلوپطرہ کی موت" صفحہ ۵۳ "شرطِ شادی" ان نظموں میں انہوں نے مغرب کے مختلف مقامات کی جنسی اور دیومالائی قسم کی حکایات کو نظم کیا ہے۔ اور ان نظموں کے ذریعہ انہوں نے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اُس کی کم از کم اس دور کے ادب کو کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ یہ نظمیں نہ تو قاری کے لطیف ترین جذبات کو آسودہ کرتی ہیں۔ اور نہ ہی وہ خوبصورت الفاظ کا شیش گرہ ہے۔

"عوامی مسخرہ"، "بے فکری"، "تین ردِعمل"، "ساگر کے نیچے" وغیرہ نظمیں کرشن کی خوبصورت نظمیں ہیں۔ جو الفاظ کی تکرار، مصرعوں کی بناوٹ، الجھاؤ اور تیزی کی وجہ سے وہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ جو شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

"بکوئے ملامت" کے آخری صفحات میں غزلوں کا بھی ایک حصہ ہے۔

نظموں کی طرح غزلوں میں بھی انہوں نے نفسیاتی باریک بینی اور مختلف جذبات کا تجزیاتی جائزہ لینے سے گریز کیا ہے۔ اسی لیے کہیں کہیں اُن کی غزلیں اُکتا دینے والی عمومیت کا شکار ہو گئی ہیں۔ مثلاً ؎

تیرگی چھٹ گئی، ہر طرف روشنی بٹ گئی!
رات اس نے جو کپڑے اُتارے تو پو پھٹ گئی
"کام" سورج بنا، اور "تیپنے" چمکنے لگا
گرم راتوں میں دن ڈھل گیا، سرد شب کٹ گئی
توڑ دو! یہ لاج کا بندھن
وصل شب ہے، تن بدن کھولو
رسیلی رُت ہے نشیلی، یہ روٹھنا کب تک
شب وصال ہے سپر ڈال دے، رجھا مجھ کو ـــــ وغیرہ

یہ اور اسی قسم کے بے شمار اشعار اُن کے "اعصاب پر عورت کے سوار" ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال نظموں کے مقابلہ میں ان کے یہاں غزلوں کا معیار بہتر ہے۔ بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ؎

چند روزہ حیات کی خاطر
آدمی روز روز مرتا ہے!
بعد میں اپنی حماقت پہ بھی پچھتا لینا
پہلے ہر شخص سے تقدیر کا رونا رو لے
من میں بسے ہیں۔ رات دن ساجن
گرچہ آنکھوں سے ہو گئے اوجھل
کام کی افراط، دفتر کے ہنگاموں میں بھی
تری یاد آئے، توجہ میری بٹتی جائے ہے

کرشن کے یہاں "رد قبول" "محنت (موضوعات میں)" کا فقدان ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے دل و دماغ میں جنسی جذبات کے تعلق سے ملنے والے ہر خیال کو نظم کر دیتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر ان کی نظمیں اظہار کے بھرپور تاثر سے عاری ہوتی ہیں۔

کرشن جی نے سماجی رشتوں اور رابطوں کو نظرانداز کرتے ہوئے، زندگی کے کڑے حقائق سے نبرد آزما ہونے کی بجائے حسینوں کے لب و رخسار اور ان کے پستانوں میں گم ہو گئے۔ حالات کی ابتری، اور پوری دنیا میں ہر سطح پر ہونے والے استحصال (انفرادی اور اجتماعی) جو انسانی زندگی کو کھوکھلا کر رہا ہے انہیں متاثر نہیں کرتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب تک اپنے گردو پیش کے سلگتے ہوئے مسائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے حسین عورتوں کے جسموں کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں گے۔

"کوئے ملامت" کا یہ سفر کرشن کی اعصاب زدگی، جنسی نامرادی اور انسانی پستی کا شرمناک المیہ ہے ــــ ..

(شبیر ہاشمی)

ارتکاز

- سہیل عظیم آبادی
- عبدالقیوم ابدالی
- رشید امجد
- محسن بھوپالی
- رونق گیاوی
- عشرت ظہیر
- مجید ساقی
- شمیم اختر شمیم
- رحمٰن عباسی
- سعید احمد قادری
- سعید اختر

● سہیل عظیم آبادی ——— پٹنہ

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ ملا۔ خوب ہے۔ خوب رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ مبارکباد۔

تخلیق کا وہ شمارہ، جس پر اپنی رائے کا اظہار احمد داؤد نے کیا ہے میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن پاکستان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے وہاں لکھنے والوں کا ایک حلقہ اُردو ادب کی تطہیر کے لیے کوشاں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے بھی۔ یعنی قیام پاکستان سے پہلے ہی متحدہ ہندوستان میں یہ ذہن پیدا ہو گیا تھا۔ حسن عسکری مرحوم نے بہت سے لوگوں سے خط و کتابت بھی کی تھی لیکن متحدہ ہندوستان میں ان کی کوششیں بارآور نہیں ہو سکیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد وہاں ایسی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ خاص کر وہ لوگ جو جماعتِ اسلامی سے متاثر ہیں ایسی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ انہیں سستی شہرت اور مقبولیت مل سکتی ہے لیکن اُردو ادب کا انجام کیا ہوگا اسے یہ لوگ نہیں سوچتے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسے لوگوں سے اُلجھنے کی ضرورت بالکل نہیں۔ وقت کی بربادی ہے۔ کوئی ان لوگوں کو سمجھا نہیں سکتا۔ کیونکہ اس قسم کی آوازیں دیدہ و دانستہ اور کچھ بوجھ کر اور مصلحتوں کی بنا پر اٹھائی جاتی ہیں۔ آج اگر پاکستان سے ایسی آواز اٹھ رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہاں جنرل ضیاء الحق کی وساطت سے جماعتِ اسلامی کی حکومت ہے۔ اس کا مداوا صرف یہ ہے کہ ترقی پسند عناصر سرگرمِ عمل ہوں اور زندگی کی حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ روشن کریں۔ بحثوں میں اُلجھنا وقت خراب کرنا ہے۔

● عبدالقیوم ابدالی ——— رانچی

ایک طویل انتظار کے بعد "ہم زبان" کا چوتھا شمارہ کل ملا۔ آپ کا اداریہ جس شاندار مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ خدا کرے وہ ہمارے جدید افسانہ نگاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرے۔ مضامین میں ڈاکٹر عقیل صاحب کا مضمون نئی معنویت لئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے سلجھے ہوئے نقادوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کا ہر مشورہ ترقی پسندوں کے لئے قابلِ قبول ہی نہیں بلکہ نشانِ راہ کے مترادف ہوتا ہے۔ بزرگ شاعر اختر انصاری اور متین مالیگانوی کی غزلیں آج کے درد و کرب بھری زندگی کا عکس ہی نہیں بلکہ اُن سے نپٹنے اور ان سے گزر جانے کی ہمت بھی عطا کرتی ہیں۔ نظمیں بھی بے انتہا دلکش اور پیاری ہیں۔ افسانوں میں جوگندر پال اور اقبال متین کے افسانے دورِ حاضرہ کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ رضوان احمد کی کہانی ایک نئے منزل کی نشانِ راہ نظر آتی ہے لیکن اس کا بے رس پن کھٹکتا ہے۔

مجموعی طور سے "ہم زبان" کا یہ شمارہ اپنی روایت کو اسی طرح بحال رکھنے کے قابل ہے۔

خدا کرے آپ اسے اسی طرح نکالتے رہیں۔۔

● رشید امجد ـــــ راولپنڈی (پاکستان)

آپ کی محبتوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ ہمیشہ مجھے یاد رکھتے ہیں۔ "ہم زبان" کے دو شمارے (۳-۴) مل گئے تھے۔ اس خیال میں رہا کہ کوئی کہانی ہو جائے تو بھیجوں اور رسالے کے بارے میں بھی لکھوں، مگر ادھر ایک سال سے عجیب کیفیت ہے میں نے اسی دوران جو کہانیاں لکھی ہیں وہ خود مجھے عجیب لگتی ہیں، انسان خود کو خارجی حالات سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔

● محسن بھوپالی ـــــ کراچی (پاکستان)

"ہم زبان" کا سرورق کرشن جی کی نثر کے پس منظر میں اور بھی جاذبِ نظر بلکہ جالبِ نظر ہو گیا ہے۔

اقبال کے سلسلے میں ریاض صدیقی اور رونق زیدی کے مقالے بہت اہم ہیں۔ کیا یہ رونق زیدی وہی ہیں جو میرٹھ سے "روشنی" نکالتے تھیں (یا نکالتی ہیں؟) سید عارف نے یہ شعر عجیب سلیقے سے کہا ہے۔ اس میں کرب کی چمک بھی ہے اور حوصلے کی دھنک بھی ـــ ع

اک لمحہ سانس چین کی لینے دے زندگی!
مجھ سے ہی بار بار ہزاروں سوال کیوں ـــــ ..

● رونق گیاوی ـــــ جھریا

شمارہ ہٰذا میں رونق زیدی، سید محمد عقیل کے مضامین بطور خاص پسند آئے۔ ریاض صدیقی کا "اقبال اور خواجہ حسن نظامی" معلوماتی ہے۔ تصوفانہ عقیدے پر خواجہ حسن نظامی سے اقبال کا اختلاف نئے گوشے اُجاگر کرتا ہے۔ نظم اور غزل کے حصے میں پرکاش فکری، رؤف خیر، محسن بھوپالی، فاروق شفق، منیر فاطمی، احمد تنویر اور رئیس مالیگانوی کا چیزیں تاثراتی ہیں۔ افسانے میں اقبال متین، رضوان احمد، سلمٰی فردوس نقاش متاثر کرتے ہیں۔

پاکستانی رسالہ "تخلیق" کے مدیر کی ہرا عینک سے ہر شے کو دیکھنے کی خواہش خواہ وہ ادب، سیاست، تہذیب، ثقافت کچھ بھی ہو قابلِ مذمت ہے۔ ایسے پاکستانی جن سنگھی پرچے میں آخر بھارتی ادبا و شعراء کو چھپنے کی مجبوری کیا ہے؟ اپنے ہی ملک سے امریکہ کی دلالی کرنے والے مدیران کا ملکی قلمکاروں سے جو حسنِ سلوک ہے اس سے زیادہ عبرتناک ہے۔ ممالکِ غیر سے آئی ہوئی پان کی پیک بھی ان کے لئے گاڑھا لہو کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر بھجری تلیا سے آئی معیاری تخلیق پر فوری صوبائی اور علاقائی حد بندی کا خیال غالب آتا ہے۔ پھر عدم اشاعت کے سو بہانے تلاشتے ہیں۔ اچھا ہوا آپ نے احمد داؤد کے خط کو من وعن شائع کیا ورنہ پتہ نہیں "تخلیق" میں یہ خط کس صورت میں شائع ہوتا ـــــ ..

● عشرت ظہیر ـــــ گیا

لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب "ہم زبان" نہیں نکلے گا تو آپ نے شائع فرما دیا۔

اقبال متین اور جوگندر پال کے افسانوں کی شمولیت اہم ہے۔ اور آپ کے لگن کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

سرورق ـــ نثر کا چہرہ ـــ کے تحت کرشن چندر کی ایسی عبارت کو جو احساس سے تعلق رکھتی ہے، آپ نے رنگوں اور برش کے ذریعہ نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے ـــ ..

● مجید ساقی ـــــ ہبلی

چوتھا شمارہ بہ دست ہوا۔ تاخیر بہت زیادہ کھل گئی لیکن آخری صفحہ پر اداراتی نوٹ نے دلاسہ دیا۔

سرورق پر اس بار نثر کا چہرہ بہت خوبصورت اور معنی خیز رہا۔ نثری حصے میں جوگندر پال، اقبال متین اور شبیر ہاشمی نے متاثر کیا۔ حصۂ نظم میں محسن بھوپالی، رؤف خیر، سید عارف، بدر جمیل، اظہار اثر، الیاس نظر، اسماعیل راز اور حیدر راحت وغیرہ کی تخلیقات اچھی رہیں۔

● شمیم اختر شمیم ـــــ روڈ کیلا

کاتب صاحب سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ میری غزل کے ساتھ

اُنھوں نے میرا نام شمیم اختر شمیم کی جگہ پر شمیم احمد شمیم لکھ دیا ہے۔ اگلے شمارے میں اس کی تصحیح فرمادیں ۔۔۔۔

● رحمٰن عباسی ۔۔۔ بارہ بنکی

پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کی شمولیت سے پرچہ میں نکھار آگیا ہے۔ سارے مضامین پسند آئے۔ جناب سید محمد عقیل کا مضمون "اقبال کے شاہین کا ایک مطالعہ" بہت پسند آیا۔ شعری حصہ میں اختر انصاری، پرکاش فکری، اقبال متین، محسن بھوپالی، رؤف خیر، فاروق شفق اور تفصیلی مطالعہ کے تحت رئیس مالیگانوی کی غزلیں اچھی ہیں۔ اظہار اثر اور اسلم عمادی کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔ جوگندر پال اور رضوان احمد کے افسانے حاصلِ شمارہ ہیں ۔۔۔ ..

● سعید احمد قادری ۔۔۔ گیا (بہار)

"ہم زبان" کے تازہ شمارہ کا ٹائٹل اپنی روایت کے مطابق بے پناہ معنویت، گہرائی اور گیرائی لئے ہوئے ہے۔ کرشن چندر کی حسن نثر کو آپ نے اتنا خوبصورت چہرہ بخشا ہے یہ صرف آپ کا حصہ ہے۔

اس کے علاوہ زیرِ نظر شمارہ کے تمام مضامین معیاری اور دعوتِ فکر دینے والے ہیں۔ افسانے میں جوگندر پال اور رضوان احمد کے افسانے خاص طور پر پسند آئے ۔۔۔

● سعید اختر ۔۔۔ جمشید پور

"ہم زبان" کا چوتھا شمارہ نظر سے گذرا۔ ریاض احمد صدیقی کا مضمون "اقبال اور خواجہ حسن نظامی اور انجم اعظمی کا مضمون ۔۔۔ "عہدِ جدید اور فن" بہت ہی جاندار ہیں۔ افسانوں میں جوگندر پال، رضوان احمد، عرفان عارف اور شبیر ہاشمی کے افسانے متاثر کرتے ہیں۔ اس شمارہ کی اہم خصوصیت آپ کا غضبناک اداریہ ہے ۔۔۔ میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا تو معترف تھا ہی اب معتقد ہو گیا ہوں ۔۔۔ ..

اشتہار

یہ وہ صفحہ ہے جسے لکھتے وقت مدیر تمام موضوعات
اور ہر طرح کے خسارے سے بالاتر ہو جاتا ہے؟

ایک سال گزر گیا اور اس ایک سال کے عرصہ میں "ہم زبان" کو خسارے سے اتنی دلچسپی ہو گئی ہے کہ اس نے بلا خوف مدیر دوسرے سال کا بھی ٹھیکہ لے لیا۔ شاید اس نے جان لیا ہے جب تک خساروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نہ چلے کوئی معیاری رسالہ لہرا ہی نہیں سکتا۔ آخر زندہ رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی سہارا تو چاہیے نا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہی سہی۔

خوشی کی بات ہے کہ ہم زبان کو شروع ہی سے ہند و پاک کے سبھی معروف لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں اسے پڑھنے والے موجود ہیں۔ اس ایک سال کے عرصہ میں ہی اس نے معیاری رسائل کی صف میں اپنا مقام بھی حاصل کر لیا ہے لیکن وہ روایت شکنی ابھی تک حاصل نہیں ہوئی کہ یہ ماہ بہ ماہ شائع ہو۔ اگر ایسا ہو تو دنیا سے انتظار کی برکت ہی اُٹھ جائے گی۔

سابقہ شماروں میں دو عنوانات دیئے گئے تھے۔ (۱) "ناقابلِ فراموش لمحہ" اور (۲) "میرے لکھنے کا سبب" عنوان نمبر ۱ کے تحت تو سارے مضامین آئے جو یقیناً عنوان کی زد سے باہر تھے یعنی "قابلِ فراموش" تھے۔ لیکن عنوان نمبر ۲ پر کسی بھی ادیب نے کچھ نہیں لکھا اس سے یہ سوال اُبھرتا ہے "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے / آخر اس درد کی دوا کیا ہے / سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں / ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟"
ظاہر ہے یہ سب بے سبب تو نہیں۔

گزشتہ شمارے میں ایک زبردست غلطی ہوئی ہے۔ مکتوبات "ارتکاز" کی بجائے "احتساب" کے عنوان کے تحت چھپ گئے۔ اس سے اگرچہ کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن مدیر کی غفلت پر خوشی ضرور ہوتی ہے کہ حامد کی پگڑی محمود کے سر تو گئی۔

افسانے اور مضامین زیادہ سے زیادہ بھیجئے۔ دوسری زبانوں کے تراجم بھی بھیجئے، نظمیں بھی بھیجئے۔ لیکن غزلوں کو ذرا ٹھہر جانے دیجئے۔ اِدھر تو جو بھی لفافہ چاک کیا جاتا ہے اس میں چند غزلیں منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہیں۔ اگرچہ یہ صنف ہمیں پسند ہیں لیکن ——— کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

تازہ شمارے میں تبصرے کافی صفحات پر قابض ہو گئے ہیں۔ تبصرہ جا ہے جتنے اہم ہوں لیکن تخلیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی صاحبِ کتاب کو خسارے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ شمارے سے احتساب کے صفحات حد درجہ تنگ کئے جا رہے ہیں۔
زیرِ نظر شمارے سے متعلق آپ کی رائے اور مشورے کا انتظار۔

(مدیر)



۶

ماہنامہ

مالیگاؤں

ہم زبان

مجلسِ مشاورت

عتیق احمد عتیق

رئیس مالیگانوی

عرفان عارف

شبیر ہاشمی

اکبر مرزا

ایڈیٹر

سلطان سبحانی

جلد ۲ شمارہ ۵ • اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۷۸ء • تاریخِ اشاعت : ۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء • کتابت : اکبر مرزا
طباعت : سردار پریس مالیگاؤں • قیمت : دو روپئے پچاس پیسے • زرِ سالانہ : بیس روپئے • پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر سلطان سبحانی
مینیجر : شاہ نواب • خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ "ہم زبان" نشاط بک سینٹر، قدوائی روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

امتزاج

اختلاف

اُردو تنقید تخلیق کے حسن و قبح کا جائزہ لینے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے سے زیادہ تنقید نگار کی زبردست صلاحیت، قابلیت، شخصیت، قد و قامت اور بزرگی کو پہچاننے کا ذریعہ بن رہی ہے ......
تنقید نگار کے سامنے تخلیق کے معیار کا مسئلہ کم اور خود کو تخلیقی فن کار کی حیثیت سے پیش کرنے کا مسئلہ زیادہ رہتا ہے ۔ نظریۂ تنقید سے اُسے صرف اتنی دلچسپی ہے کہ گھوم پھر کر اسی کو شکار کرتا رہے ۔ وہ تخلیق کی بجائے فن کار ہی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے زیر کرتا ہے ۔ وہ خود کو دنیا کی ہزاروں کتابوں میں گھرا ہوا ظاہر کرتا ہے اور اپنے بھاری مطالعہ کو منوانے کی قوت صرف کرتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کا جائزہ لیتے وقت اس کے ہر تیسرے جملہ سے ایک مغربی مفکر کا قول نمودار ہو جاتا ہے ۔ وہ جائزہ لینا چاہتا ہے اُردو ادب کا مگر سیر کر ڈالتا ہے انگریزی اور فرانسیسی ادب کی ۔ ظاہر ہوتا ہے انگریزی اور فرانسیسی ادب کو کھنگالے بغیر اُردو ادب کا جائزہ لینا ممکن نہیں ۔ اس کی ہر تنقید مغربی نقاد کے قول سے شروع ہو کر مغربی نقاد کے قول پر ہی ختم ہوتی ہے ۔ چوں کہ وہ اُردو کے سرمائے سے مایوس اور غیر ملکی زبانوں کے ادبی سرمائے سے مرعوب ہے اس لیے اُردو ادب کو مغربی دانشوروں کی آنکھ سے دیکھتا ہے ۔ ان سے متفق تو وہ ہر ہر قدم پر ہوتا ہے مگر کسی بھی مسئلہ پر ان سے اختلاف کرنے کی اس میں ذرا بھی جرأت نہیں رہتی، اگرچہ مشرق کا مزاج ہی جدا ہے ۔ وہ اُردو ادب کا تقابل دُنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے ادب سے نہیں کر سکتا مگر کسی بھی دوسری زبان کے غیر ترقی یافتہ ادب کو اُردو ادب کے مقابل ضرور لے آتا ہے ۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مغربی نقادوں کے حوالوں کو اوّلیت دیئے بغیر تنقید مکمّل نہیں ہو پاتی، یا ان کی کتابوں میں سے اقتباسات اور ارشادات گھسیٹے بغیر تنقیدی بصیرت مشکوک رہتی ہے یا تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا تو پھر فن پارے کی شناخت ؟

ظاہر ہے یہ سوال باقی ہی رہ جاتا ہے ۔ اس سوال کا جواب صرف تنقید نگار کی خود نمائی کے پاس ہے ▲▲

نشاط شاہدوی

بادل کا گیت

دھرتی!
تیری پیاس پرانی
کیوں آنچل کو تھامے
میں ساگر کی آنکھ کا سپنا موجوں کا سنگیت
جل پریوں کا بوجھل نغمہ آنسو بھرا اک گیت
تیری چاہت ہاتھ پسارے
وادی وادی مجھے پکارے
تو سینے کے گھاؤ دکھائے میرا درد نہ جانے
تیرے بت پر پھول کھلاتے بیتے کئی زمانے
پھر بھی تجھ کی پیاسی پلکے
کیوں تیری سنسان
کس نے چھینی کس نے لوٹی
چہروں کی مسکان
کتنے نیناں چھم چھم برسیں
کتنے ہردے پیار کو ترسیں
جب یہ سوکھے جسم بنیں گے خوشیوں سے رتنار
تب چونکے گا تب جاگے گا میرا سویا پیار
تیرے پتھریلے سینے میں پھول کھلانے آؤں گا
اور ہریالی بن کر تیری باہوں میں سو جاؤں گا

احمد ظفر (پاکستان)

کوئی موسم ہمارا نہیں ہے

اے کاش کبھی دروازۂ گل
چپ چاپ کھلے
ہم اس سے ملیں
وہ ہم سے ملے

وہ دستِ حنائی آنکھوں پر
مبہم سی شفق
آواز تو دے
وہ ساز تو دے
وہ ساز جسے
دمساز کہیں

اے آبلہ پا
حسرت کے امیں
اس دل کا نگیں
پتھر کی طرح
پتھر ہی رہا

معبد میں صنم
آذر کی قسم
چاہت کا وسیلہ بن نہ سکا
ہم جس کی پرستش کرتے ہیں

آنکھوں میں لہو تا حدِ افق
کیوں وجہ شکستِ دل بھی ہے
وہ چہرۂ گل
یہ کس نے کہا
سینے پہ ستم کی سِل بھی ہے

دروازۂ گل
کھلتا ہے مگر
کھلتا بھی نہیں
جیسے وہ شناسا چہرۂ گل
ملتا ہے ہمیں ہر شام و سحر
ملتا بھی نہیں ۔

زبان کے

ترقی پسند تحریک اور میں

مجنوں گورکھپوری
(پاکستان)

ترقی پسند تحریک جس کا نام ہے۔ یعنی اصطلاحی طور پر ہم جسے ترقی پسند تحریک کہتے ہیں ۱۹۳۵ء میں اس کی ابتدا ہوئی۔ میری تحریروں میں ان نوجوانوں نے کچھ ایسے میلانات پائے جو ان کے مفید مطلب تھے اس لیے انھوں نے مجھے بھی اپنی انجمن اور اپنی تحریک میں شامل رکھا اور مجھے اطلاع دیتے رہے کہ میں ممبر چن لیا گیا۔ مجھے چوں کہ نوجوانوں سے ہمیشہ امیدیں وابستہ رہی ہیں کچھ ان سے پوری ہوتی رہیں اور کچھ پوری ہونے سے رہ گئیں۔ بہرحال میں ہمیشہ ان لوگوں کا حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ اور میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا مگر جہاں مجھے کسی غلط موڑ یا کسی غلط میلان کا احساس ہوتا کہ میں ٹوکتا بھی رہا لیکن یہ کہنا کہ میں ترقی پسند تحریک کا بنایا ہوا ترقی پسند ہوں' یہ شاید درست نہیں ہوگا۔ لڑکپن سے میرے کتابی مطالعہ' میرے گرد وپیش کے مشاہدات نے' میرے تجربات و معمولات نے مجھے ذہنی طور پر انقلابی بنا دیا تھا۔ اگرچہ میں ایک سربرآوردہ زمیندار خاندان میں پیدا ہوا اور جاگیردارانہ روایات میں پرورش پائی لیکن مجھے جو علم ملا اس نے مجھے کم عمری ہی میں غور و فکر کی طرف مائل کر دیا' عوام اور بالخصوص وہ جماعت جو کسان کہلاتی ہے یا جو کھیت کی مزدوری کر کے پیٹ بھرے' جو آسامی یا رعایا کہلاتی ہے۔ ان کی زندگی پر میں غور کرتا تھا تو مجھے اس نظام سے بغاوت ہوئی۔ اپنے اس سیاسی شعور اور باغیانہ بلکہ انقلابی مزاج ہی کے باوصف فراق سے ۲۵-۱۹۲۴ء میں خصوصی مراسم قائم ہوئے۔ ہم نے مارکس کا مطالعہ کیا۔ انگلز کی تحریروں کا مطالعہ کیا' پھر لینن کی تحریروں کا مطالعہ کیا اور دوسرے کئی انقلابی مفکروں کی تحریروں کا مطالعہ کیا۔ ہم ان کے افکار و خیالات سے ابتدا ہی سے متاثر تھے اور جب ہم نے ان کا بھرپور مطالعہ کیا تو بے اختیار ان کی آواز پر لبیک کہنے کو جی چاہا' تو ہم نے ان کا اثر قبول کیا' اور یہی سبب ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نوجوان ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ وہ سب ہمارے پاس آئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب باقاعدہ انجمن قائم ہوئی اور تحریک شروع ہوئی تو سب سے پہلے (اس کے بانی اور محرک' مثلاً سجاد ظہیر وغیرہ کو چھوڑ کر) جس کو APPROACH کیا گیا وہ میں تھا اور فراق' تھے۔ اس زمانے میں جواہر لال نہرو بھی روس کے انقلاب کے قائل تھے اور RUSSIAN REVOLUTION پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی' چھوٹی سی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اشرف مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن سب سے زیادہ انہماک کے ساتھ جو کام کر رہے تھے وہ الہ آباد میں ڈاکٹر زیڈ احمد اور ان کی بیوی ہاجرہ اور لکھنؤ میں ڈاکٹر رشید جہاں تھیں'

ادب اور فن کے فروغ پر یقین رکھتے تھے۔ یہ لوگ خاموش مگر دھن کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں نہ صرف شامل رہے بلکہ اس کے سپاہی رہے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر عبدالعلیم تھے جو بعد میں اسلامک اسٹڈیز کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہم کو اپنے ساتھ رکھا اس لیے ضروری سمجھا کہ ڈاکٹر ظہیر حسین رائے پوری کے بعد میں نے سب سے زیادہ انقلاب اور تاریخی تصور کی بنا پر زندگی اور ادب سے بحث کی اور اس کی تاریخی سمتیں متعین کیں۔

۱۹۳۶ء تک ترقی پسند تحریک بغیر کسی اندرونی نفاق یا اختلاف کے ایک خاص پروگرام کے تحت کام کرتی رہی۔ اور وہ پروگرام یہ تھا کہ MASSES اور CLASSES میں جو تصادم ہے اس کو واضح کیا جائے۔ عوام میں اور برگزیدہ طبقے کے درمیان اعلیٰ طبقے میں اور ادنیٰ طبقے میں جو یا مال زندگی بسر کرنے والے ہیں ان کے درمیان جو بُعد ہے اُس کی وضاحت کی جائے کہ ایسا کیوں ہے ؟ اس کے اقتصادی اور معاشرتی اسباب کا جائزہ لیا جائے ــــــ یہ نعرہ کہ انقلاب زندہ باد اور ہر شخص کو اُس کی ضرورت کے مطابق آسائشیں مہیا ہوں' یہ ان کا پروگرام تھا۔ اس کے لیے وہ اقتصادی محاذ پہ اور ادبی محاذ پر کام کر رہے تھے۔ اس وقت تک یہ ایک واضح تصور تھا اور ایک واضح پروگرام سامنے تھا۔ لیکن دیکھتے دیکھتے قریب قریب یہی نعرہ ہر جماعت لگانے لگی۔ یہاں تک کہ جنگ چھڑ گئی' یورپ کی جنگ عظیم! اس وقت سے یہ لوگ پھر کچھ زمین ٹٹولنے لگے ــــــ نیا راستہ ڈھونڈنے لگے ــــــ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ لوگ آنکھ بند کر کے باہری میلانات اور بیرونی پروگرام پر نظر رکھتے تھے۔ اور آنکھ بند کر کے اسی کا نعرہ لگاتے تھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے ــــــ ایک حد تک یہ ٹھیک ہے کہ باہر سے یا کہیں سے بھی جو صالح اور صحت مند میلانات آتے ہیں' ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے مگر ان کو اپنی تاریخ' اپنی روایات' اپنے جغرافیہ اور اپنے معاشرہ کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ ــــــــــ مگر ان میں بہت سے لوگ آنکھ بند کر کے بیرونی اثرات سے متاثر تھے اور باہر سے جو SLOGAN (نعرہ) ان کو دیا جاتا اسی پر عمل کرتے تھے۔ اس سے فائدہ بھی ہوا لیکن یہ نقصان بھی ہوا کہ جب ۱۹۴۵ء کی جنگ ختم ہوئی' ۱۹۴۶ء میں نیا الیکشن ہوا تو اس وقت ان کے پاس کوئی نیا پروگرام نہیں تھا۔ وہ تحریک کو زندہ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ جس مقصد کو لیکر چلے تھے' ہر چھوٹی بڑی جماعت نے کم و بیش وہی مقصد غلط یا صحیح وظیفہ لب کے طور پر یہی اختیار کر لیا تھا۔ مثلاً روٹی روٹی سب کرتے تھے' روٹی روٹی کا نعرہ ٹھیک ہے' روٹی تو ہماری پہلی ضرورت ہے ــ لیکن روٹی سب سے آخری ضرورت تو ہے نہیں۔ جب گھر پر کھانا مل جائے گا اور ملنے لگے گا یا اس کے اسباب مہیا ہونے لگیں گے تو پھر اس کے بعد کیا کرنا ہے ؟ اس بات پر جب وہ لوگ غور و خوض کرنے لگے تو آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے ــ چنانچہ برصغیر میں آپ دیکھتے ہیں کہ کئی گروہ بن گئے تھے۔ ایک تو LEFTIST ـ STRONG LEFTIST بائیں بازو والے اور وہ بھی سختی کے ساتھ روسی' آنکھ بند کر کے روسی نظام یا سوشلسٹ نظام کے قائل ــ کچھ لوگ اس میں ترمیم یا اصلاح چاہتے تھے۔ اپنے ملکی حالات اور معاشرے کے لحاظ سے' غرض نیا پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے یہ تحریک متاثر ہوئی ــ تحریک تو اب بھی زندہ ہے لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکی ــ پھر یہ ہوا کہ اُدھر ہندوستان میں کئی لوگ کانگریس میں شامل ہونے لگے' پارلیمنٹ میں جانے لگے تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گرمی' وہ حوصلہ مندی اور وہ دھن باقی نہیں رہی۔ اِدھر پاکستان میں ایک عرصے تک اس تحریک کو تقریباً دبا ڈالا گیا۔ بلکہ مکمل BAN کر دیا گیا۔ مگر اب حالات دوسرے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک انجمن پھر قائم ہو گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے پاس بھی کوئی نیا اور واضح پروگرام نہیں ہے۔ اور جب تک کوئی پروگرام نہیں ہوگا یہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہی پرانا ایک راگ ہم اب نہیں گا سکتے۔ ہر راگ کا ایک وقت ہوتا ہے' اس کا وقت گزر گیا۔ وہی روٹی' وہی کپڑا' وہی سب کی خوشحالی' وہی سب کا بھلا' جمہور کا بھلا' پبلک کا بھلا' یہی نعرہ سب لگانے لگے ہیں۔ کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو نعرہ نہ لگاتی ہو' مگر سب نے اب اس قسم کی نعرہ بازی کو ترقی پسندی یا انقلاب کا نام

دے دیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب انقلاب کا نام لیتے ہوئے لوگوں کی زبان تھرتھراتی تھی۔ اشتراکیت کا نام لیتے ہوئے زبان تھرتھراتی تھی۔ جمہوریت کا نام لیتے ہوئے لوگ کانپتے تھے، مگر اب صورتحال یہ ہے کہ جو چاہتا ہے کسی تحریک یا نعرہ کو انقلاب کا نام دے دیتا ہے —

"جدیدیت" کے نام سے ایک نئی نام نہاد تحریک چل پڑی ہے جس پر میں نے علی گڑھ میں کافی لکھا ہے، تقریریں کی ہیں، یہاں بھی تحریریں کی ہیں، یہاں میرا ایک مضمون چھپا ہے کہ جدیدیت کسی ایک میلان کا نام نہیں ہے۔ کوئی شعور کی رو پر زور دے رہا ہے کوئی EXISTENSIALISM (وجودیت) پر زور دے رہا ہے۔ کوئی فرائڈ کے لاشعور کو اپنائے ہوئے ہے، غرض کہ بہت سے میلانات ہیں۔ جن کو مجموعی طور پر ہم جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔ مگر یہ کوئی ایک تحریک نہیں ہے، نہ ایک میلان کا نام ہے۔ تو ایسے کئی میلانات جب بروئے کار آنے لگے تو ان کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کچھ ماند پڑ گئی ہے۔ یعنی جہاں اور اسباب ہیں ترقی پسند تحریک کے ماند پڑنے کے، ایک سبب یہ بھی ہے۔ تحریک اب بھی جاری ہے، مری نہیں۔ مگر ماند پڑ گئی ہے۔ اتنی ACTIVE نہیں ہے، اگر کہیں ایکٹو نظر بھی آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نیا پروگرام نہیں دے پا رہی ہے۔ منشور جو تھا وہی چل رہا ہے۔ حالاں کہ روس ہی کو دیکھو اس نے لینن کے زمانے سے کتنی کروٹیں لی ہیں۔ IRON CURTAIN (آہنی پردہ) تو وہاں خیر اب بھی ہے لیکن ایک زمانہ تھا جب وہ POLITICAL ANTHEM ہو کر کہ زندگی بسر کر رہا تھا، چاروں طرف سے وہ — CAPITALISTS ممالک سے گھرا ہوا تھا۔ CAPITAL دنیا میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد استالین نے کئی FIVE YEAR PLANS تیار کر کے اس میں نئی جان ڈالی۔ اس کو آگے بڑھایا، اتنا آگے بڑھایا کہ ۱۹۴۵ء کی جنگ میں وہ اگر شریک نہ ہوتا تو جیت نہ ہوتی۔ چنانچہ جب تک وہ جرمنی کے ساتھ رہا تو یہ لوگ پٹتے رہے تھے۔ وہ تو جرمنی نے ان کے ساتھ دغا کی اور پھر ANGLO RUSSIAN ALLIANCE ہوا اور امریکہ آیا تو جہاں تک جنگ جیتنے کا سوال ہے امریکہ سے اس وقت بھی روس کم طاقتور نہیں تھا۔ تو جنگ جو جیتی گئی ہے وہ امریکہ کی طاقت تو ایک طرف، لیکن یورپ میں اس وقت سب سے بڑی طاقت جو تھی وہ روس کی تھی۔ جس نے جنگ جتائی۔ —— لیکن استالن کے مرنے کے بعد دیکھو روس نے کتنی اور کروٹیں لیں۔ خروشچیف کے زمانے میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی گئی کہ PEACEFUL CO-EXISTENCE ہو یعنی CAPITIALISTS ممالک سے جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے تصادم نہ ہونے پائے۔ اپنا پروپیگنڈہ جاری رکھو وہ خود راستہ دیکھ لیں گے۔ بہرحال جلد یا بدیر کسی بھی لمحہ ان سے جھگڑا مول نہ لو۔ استالن کے زمانے میں اس قسم کے PEACEFUL EXISTENCE کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ مارکس نے یہ تعلیم دی۔ وہ تو صاف کہتا تھا کہ —— COLONIAL POLICY سے ہمارا جھگڑا ہے۔ امپیریلزم سے ہمارا جھگڑا ہے، FINANCE CAPITALISM سے ہمارا جھگڑا ہے۔ اور لینن بھی یہی کہتا تھا۔ استالن نے کسی کے ساتھ مفاہمت نہیں کی۔

کسی CAPITALIST ملک کے ساتھ مفاہمت نہیں کی۔ اس قسم کی مفاہمت کی ضرورت استالن کی موت کے بعد پیدا ہوئی۔ اور سب سے پہلے مفاہمت پر خروشچیف نے زور دیا اور آج تک وہ یہی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور روس میں نظریاتی طور پر بڑا اختلاف ہے مگر دونوں کبھی متصادم نہیں ہوتے —— تو ان کی پالیسی یعنی اشتراکی ممالک کی پالیسی بھی وہ تو ہے نہیں جو ابتدا میں تھی، تو اس طرح سے اگر یہ ترقی پسند انجمن والے —— ADJUST کرتے رہتے، زمانے کے ساتھ مطابقت کرتے جاتے اور نئے پروگرام بناتے جاتے یا حسب ضرورت اپنے پروگرام میں تبدیلیاں لاتے، حسب ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کو دیکھتے ہوئے، جس نظام میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم اپنے لیے ایک اسکیم بنائیں، پروگرام چاک آؤٹ کریں، مگر ایسا ابھی نہیں ہو رہا ہے تو اس لیے تنظیم کے طور پر بلکہ نام نہاد طور پر تحریک زندہ تو ہے، لیکن کوئی خاص —— CONTRIBUTION نہیں ہو رہا ہے۔ میں یہ بات برصغیر کی ترقی پسند انجمن سے متعلق کر رہا ہوں۔ —— آواز لگا ہوگا، ابھی

میں کہاں تک مارکسی میلان ہے۔ کہاں تک ترقی پسند میلان ہے۔ ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ ترقی پسند کی اصطلاح جو ہے اصل میں PROGRESSIVE کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تو ان لوگوں نے PROGRESSWE لفظ استعمال کیا بجائے یہ کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا گیا' ہندی میں کوئی دوسرا لفظ' ان کو کچھ نہیں سوجھا تو یہ ترقی پسند بن گئے۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین نام رکھ لیا۔ اس سے دو آدمیوں کو اختلاف تھا۔ ترقی پسند کا جو لفظ ہے نہایت ہی سپاٹ ہے اور PROSAIC بھی۔ دو آدمیوں کو اس سے اختلاف تھا۔ مجھے لفظ سے اختلاف تھا' حالاں کہ وہ بڑے سرگرم ترقی پسند تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن رکھا جائے۔ اور مجھے سرے سے اختلاف تھا کہ ترقی پسند کی جگہ پر "پیش قدم" کا لفظ یا "پیش رفت" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ میں کبھی کبھی استعمال کرتا تھا پیش قدم یا پیش رفت کا لفظ۔ ایران میں یا ان علاقوں میں جو سوویٹ مڈل ایسٹ میں واقع ہیں جہاں فارسی زبان رائج ہے وہاں "پیش قدم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو میرا اعتراض یہی تھا کہ ترقی پسندی سے بات نہیں بنتی ہے۔ اس لیے کہ ترقی پسند یا ناپسند کی چیز نہیں ہے۔ ترقی تو HISTORICAL INEVITIBILITY ہے۔ ایک ناگزیر تاریخی قوت ہے۔ ترقی ہونا چاہیے' اگر ترقی نہیں کرو گے تو پیچھے رہ جاؤ گے یا SIDE TRACK ہو کر رہ جاؤ گے' ختم ہو جاؤ گے۔ آزادی اور ترقی ضروری ہے۔ آزادی اس لیے چاہیے کہ ہم ترقی کر سکیں۔ تو ترقی کوئی پسند یا ناپسند کی چیز نہیں ہے۔ آج کل بھی میرا یہی کہنا ہے۔ مگر چوں کہ وہ اصطلاح رائج ہو گئی تو جیسے جمالیات کا لفظ میں نے قبول کر لیا' حالاں کہ جمالیات جو ہے وہ AESTHETICS کا صحیح ترجمہ نہیں ہے' یہی میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے' مگر چوں کہ وہ لفظ رائج ہو گیا ہے تو اسے قبول کر لیا' تو یہ ہے ہماری ترقی پسندی' ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا بے سکت ہو رہے ہیں۔ لیکن ہماری ایک جداگانہ لائن ہے فکر و نظر کی' ایک راستہ ہے اور ہمیں اس راستے سے اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔

آج کل کے نوجوانوں کا کیا ہے' کہنے کو تو سب کہتے ہیں لیکن میں نے کہا نا کہ آج کوئی پروگرام نہیں ہے' کیا کامیاب اور کیا ناکام! ــــ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آزاد نظمیں جو ہیں آپ انھیں کو اٹھا کر دیکھ لو' ان میں کس قدر انفرادیت ہے' ہر شخص ایک ذاتی موڈ کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا یہ منشا تو تھا نہیں ــــ کوئی لاشعور لیے ہوئے ہے کوئی STREAM OF CONCIOUSNESS لیے ہوئے ہے۔ کوئی کچھ لیے ہوئے ہے اور کوئی کچھ اپنائے ہوئے ہے۔ ترقی پسندی کا تقاضہ یہ تھا کہ جس جگہ بھی جو چیز ایسی ملے جس سے آگے بڑھنے میں مدد ملے اُسے اپنا لو' ــــ انفرادیت' نری انفرادیت یا قنوطیت جسے کہتے ہیں اس سے میں نے ابتدا ہی میں احتراز کیا۔ باولے تھے وہ لوگ کہ انفرادیت' انفرادیت کیا کرتے تھے۔ میں کہتا تھا اجتماعیت کی بات کرو ــــ میں نے کہا اجتماع جو ہوتا ہے' سوسائٹی جو ہوتی ہے یا سماج جو ہوتا ہے بہرحال افراد پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ افراد پہ مشتمل ہے تو افراد کی فردیت تو قائم رہے گی۔ اب رہ گیا کہ اس تربیت کے ساتھ غلو نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی شخصیت اپنی ذات میں اس طرح کھو جائے کہ دوسری ذاتوں کا' ان کی آزادی کا' ترقی کا کوئی خیال نہ رکھا جائے' تو یہ غلط ہے' یہ تو دیوانگی ہے۔ تو ضرورت سے زیادہ جب ایک زمانہ فردیت یا انفرادیت کے خلاف تھا تو اس وقت میں نے اختلاف کیا۔ میں نے کہا انفرادیت بھی رہے گی' اجتماعیت بھی رہے گی۔ IDEALISM بھی رہے گا اور مارکسزم بھی چلے گا۔ بھئی آخر آپ کا کوئی گول ہے نا: IDEAL ہے نا! نصب العین ہے کوئی؟ نصب العین اگر نہیں ہے تو آپ بیکار ہیں' آپ کی تحریر بے کار ہے۔ اگر کوئی مقصد ہے' کوئی نصب العین ہے' اسی کا نام IDEAL ہے تو اس کے لیے آپ کوشاں ہیں' اس کی سمت آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں' راستے میں جتنی رکاوٹیں ہیں ان سب کو آپ ختم کرتے جاتے ہیں تو یہ عمل ترقی پسندانہ عمل ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین اجلاس / کانفرنسیں

میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی کسی کانفرنس یا اجلاس میں کبھی شرکت نہیں کی۔ ایسی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اس لیے کہ کوئی جلسہ کلکتہ'

کون جانے دِلّی، کون مارا مارا پھرے۔ میں گھر میں بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ کیوں مارا مارا پھرتا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہر کانفرنس میں جب میرا چناؤ ہوا ہے تو غائبانہ مجھ کو چنا گیا اور مجھ کو اطلاع دے دی گئی۔ یہاں تک کہ آخری چناؤ جب ہوا۔ (اِدھر حال ہی میں کوئی چناؤ ہوا ہے تو اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا) سنہ ۱۹۵۵ء یا سنہ ۱۹۵۶ء میں جس میں کرشن چندر جنرل سکریٹری چنے گئے تھے۔ تو اس موقع پر ڈاکٹر علیم نے جو میرے دوست تھے اور بالدار[1] دونوں نے میرے چنے جانے کے خلاف آواز بلند کی۔ اور سختی کے ساتھ آواز بلند کی۔ ان کا یہ کہنا کہ ان کی ہمت بڑھانے سے یا انھیں عہدہ دینے سے کیا فائدہ' یہ کسی کانفرنس میں آتے نہیں ——— بات ٹھیک تھی' مگر پورا ونگ کھڑا ہوگیا کہ وہ آئیں یا نہ آئیں پہلے اس STATURE کا دوسرا آدمی آپ کوئی تجویز کریں تو ہم لوگ ان کی جگہ اس کو لے لیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اس اسٹیچر کا آدمی ملنا مشکل ہے تو سب نے ایک آواز ہو کر کہا کہ پھر ان کا رہنا ضروری ہے۔ ممکن ہو تو ہم ان سے درخواست کریں کہ آئندہ کانفرنس میں یہ ضرور آئیں۔ بہرحال میں چنا گیا۔ اس وقت میں جنرل باڈی کا ممبر چنا گیا۔ اردو کمیٹی جو تھی اس کا بھی ممبر چنا گیا۔ غرض کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب سے انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آئی ہے اُس تاریخ سے لے کر سنہ ۱۹۶۶ء تک اس کا ممبر رہا ہوں۔ گیا نہیں ہوں کسی جلسے یا کسی کانفرنس میں مگر ممبر ہمیشہ رہا ہوں۔

ترقی پسند ادبی رسائل و جرائد وغیرہ

جہاں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ پرچوں کا سوال ہے تو تحریک سے براہِ راست کسی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ الکار جو اُس زمانے میں بھوپال سے نکلتا تھا اور جو اپنی وجہ سے باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا، عوامی ادب کا ترجمان تھا۔ ترقی پسند مصنفین کا کوئی پرچہ نہیں تھا سوائے "نیا ادب" کے جو رسالہ انھوں نے لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔

یا کسی حد تک جوش کا ذاتی پرچہ جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ جوش نے سنہ ۱۹۲۵ء میں دِلّی سے جو کلیم جاری کیا تھا وہ ان سے چلا نہیں۔ وہ لکھنؤ چلے آئے اور کلیم اور نیا ادب ملا کر انھوں نے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا، اس میں سبط حسن تھے، علی سردار جعفری بھی شامل تھے۔ جوش سرغنہ بنے ہوئے تھے اور میرے مضامین ان کے پرچے میں نکلتے تھے۔ چنانچہ "نیا ادب" کیا ہے؟ یہ مضمون میرا اس میں نکلا تھا۔ ورنہ خصوصیت کے ساتھ جا بجا آپ کو مختلف رسائل میں ایسے مضامین ملیں گے جو ترقی پسندی لیے ہوئے ہیں اور ان کو ترقی پسندوں نے WFL COME کیا ہے۔ میرے مضامین زیادہ تر نگار میں چھپتے رہے۔ ہزار داستان میں میری نظمیں غزلیں چھپتی رہیں۔ جو لاہور سے نکلتا تھا میرے مضامین اور اشعار جو بھی رہے ہوں' اس زمانے میں وہ ایک میلان لیے ہوئے تھے' ان میں تبدیلی نہیں آئی یہاں تک کہ جب میں ریڈیو پر بولتا تھا تو حکومت برطانیہ، برطانوی سامراج کے خلاف اس میں کافی مواد ہوتا تھا۔ اس طرح جب ادب' زندگی' اور مباریات وغیرہ پر لوگ مضامین دیکھتے تھے تو لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ آپ کس طرح بول جاتے ہیں اور کوئی کچھ کرتا نہیں ہے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ جہاں انھوں نے کہا کہ کوئی لفظ بدل دیجیے' کوئی جملہ کاٹ دیجیے تو میں کہتا کہ یہ بند کیجیے' اُس وقت ایسا نہیں کہ وہ پارٹیشن یا شیشے کے پیچھے میں سوئچ پر انگلی رکھ کر بیٹھے ہوں۔ میں کہتا تھا کہ آپ چپ چاپ یہاں بیٹھیے تب میں تقریر کروں گا۔ تو اس طرح میں تقریر کیا جاتا تھا۔ ریڈیو پر کچھ ہمارے ہمدرد اور ہم خیال تھے اور بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ بطرس یہ اس وقت اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔ وہ لوگوں کو بلا کر کہتے تھے کہ یہ مجنوں صاحب کی کوئی تقریر سنے گا کہ مجنوں بانی کا گانا سُنے گا۔ اور جب مجنوں صاحب کی تقریر سنے گا تو ظاہر ہے ان باتوں کو انگیز سمجھتا تھا کہ کس قدر معقول اور عقل ہیں تو ان پر کوئی گرفت کی جا سکتی ہے' نہ جیل بھیجا جا سکتا ہے اور نہ اس پر بازپرس ہوگی۔

---

[1] بنگلہ زبان کا مشہور ادیب

میرے بڑا طرح دار آدمی تھا، بڑا آزاد خیال آدمی تھا۔

ہاں! تو الگ سے کوئی رسالہ ایسا نہیں تھا، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثلاً نیا آدم ایک ایسے آدمی تھے جو ہندوستان کے نوجوانوں کو WEL COME کرتے تھے، ان کے مضامین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، چھاپتے تھے۔ کسی زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین خاص کر آتش پر انھوں نے بالاقساط شائع کیے۔ اس زمانے میں خلیل اپنے کو ترقی پسند کہتے تھے اور کمیونسٹ MINDED سمجھتے تھے، مگر شاید جیل خانہ بھیج دیے گئے۔ جیل کی اذیت برداشت کرنا مشکل کام ہے، اس کے بعد سے انھوں نے توبہ کرلی، لیکن انھوں نے جو پی، ایچ، ڈی میں اپنا مقالہ لکھا ہے ترقی پسند تحریک پر، میں اُن کا ممنون تھا، وہ تو معقول اور مدلل کتاب ہے اور WELLDOCUMENTED حوالہ اور اقتباسات سے بھرپور ہے۔

جہاں تک اور پرچوں کا سوال ہے مثلاً نقوش، تو نقوش کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترقی پسند ہے یا غیر ترقی پسند۔ یہ تو ہر طرح کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تنہائی پر میرا افسانہ تھا جسے کمل نہیں کر سکا، اس میں رومانیت تھی اور بس اُسے انھوں نے چھاپا اور مضامین بھی چھپتے رہے اس میں۔ فراق کے مضامین بھی چھپے، میری ایک غزل بھی چھپی جو بہت خطرناک حد تک ترقی پسند ہے "نعرہ لگانے والی"۔

پرکاش پنڈت نے شاہراہ نکالا تھا جو ترقی پسند پرچہ تھا مگر وہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا، اور بھی کئی رسالے تھے ——

یہاں پاکستان میں آج کل کئی پرچے نکل رہے ہیں۔ سیپ نکل رہا ہے، [illegible] رہا ہے۔ نیا دور نکل رہا ہے، احمد ندیم قاسمی فنون نکال رہے ہیں، اور بہت سے رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر میں ان رسالوں کو رسالہ نہیں سمجھتا۔ وہ بھی کوئی رسالہ ہے جو ہر ماہ نکلے، ہر تیسرے مہینے آپ ایک کتاب نکال لیے، ایک مضمون نکال لیے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ تیسرے مہینے، چھٹے مہینے یا سال بھر بعد کوئی پرچہ نکلے۔ ہاں افکار ہے، پابندی سے نکلتا ہے۔ پاکستانی ادب تھا جس میں میرا نام بھی دے دیا تھا انھوں نے۔ دے کیا دیا، میں نے خود کہا تھا کہ تمھارا رسالہ دیکھ کر مجھے اپنا "ایمان" یاد آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں اس کے اس کے ادارے میں رہوں تو سبط حسن لے اڑے مجھے، میرا ایک مضمون بھی چھپا تھا اس میں، مشتاق احمد یوسفی پر۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ جب یہ رسالہ ماہوار سے سہ ماہی ہوگا، اس دن سے میں ساری دلچسپی ہٹا دوں گا، میں سہ ماہی وباہی کا قائل نہیں۔ نقوش پہلے سہ ماہی، ششماہی میں نکلتا تھا، اب طفیل سال میں ایک گیندے کی طرح ایک پرچہ نکال دیتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ فنون ہی کو دیکھیے، میں نے ڈاکٹر عبدالقیوم پر ایک مضمون لکھا تھا، چار مہینے انتظار کرنا پڑا مجھے۔

ترقی پسند شعراء کے بارے میں

تم کہتے ہو کہ جب بھی لوگ اردو کے ترقی پسند شعراء یا جدید شعراء کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو بات فیض سے آگے نہیں بڑھتی۔ تو بھئی میں کس کس کے بارے میں لکھوں؟ —— نظم سے نثر تک، میرا ایک مضمون چھپا ہے اُسے پڑھ ڈالیے۔ یہ دور اتنا پیچیدہ اور الجھا ہوا دور ہے، دنیا MANY SIDED ہوگئی ہے۔ اب دو مصرعوں میں بات بنتی نہیں ہے، ویسے ہماری تھوڑی سی کاہلی ہے، نظم چوں کہ جلد ختم کر لیتے ہیں، فرصت اب ہے نہیں اس لیے شاعری کی طرف غالب رجحان ہے ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ادب کا غالب حصہ کسی بھی زبان میں نثر میں پیش کیا جا رہا ہے، نہ کہ نظم میں۔ تو نثر جو ہے وہ —— DIGRESSIVE ہے، پیچیدگیوں کو سلجھا کر مفصل بات کرنی چاہیے نہ کہ پیچیدگیوں کو اور پیچیدہ تر بنانے کی بات کی جائے۔ خوامخواہ SYMBOLS وضع کرنے کا اب زمانہ نہیں رہا۔ یہ درست ہے کہ SYMBOLS میں بھی ایک کیفیت ہے، لیکن نثر کو اتنی SYMBOLIC نہیں بنا سکتے ورنہ SYMBOLISM کا سہارا لیکر ہم بہت کچھ سمجھا سکتے ہیں مگر MIND جو ہے وہ روز بروز COMPLEX ہوتا جا رہا ہے، تہ دار ہوتا جاتا ہے، ہمارا ذہن، ہماری طرزِ فکر اور ہمارا

پیچ در پیچ ہوتا جا رہا ہے اور اس کا احاطہ نظم نہیں کر سکتی۔ دوسرے ہماری شاعری کا یہ حال ہے کہ ـــــ THERE ARE AS MANY TENDENCIES AND TRENDS AS THERE ARE POETS

اتنے میلانات ہیں، اتنی سمتیں ہیں، جتنے کہ INDIVIDUAL POETS فرداً فرداً شاعر ہیں۔ آپ اگر GROUPING کرنا چاہیں تو ن۔م۔ راشد اور ضیا جالندھری ہیں۔ میں نے ان دو کا نام خاص طور سے لیا ہے اس لیے کہ آزاد نظمیں لکھتے ہیں۔ لیکن ان کو آپ ایک ساتھ گروپ نہیں کر سکتے، صرف اس لحاظ سے ایک ساتھ گروپ کیے جا سکتے ہیں کہ اگر ہم آزاد نظم کی رفتار دکھانا چاہیں یا ایک مجموعہ سے دوسروں کو اندازہ دینا چاہیں کہ دیکھیے ہمارے یہاں آزاد نظموں کے تحت ایسی نظمیں لکھی گئی ہیں تو ٹھیک ہے لیکن ہر نظم انفرادی مثال ہے۔ جیسے ترقی پسند تحریک تھی، یا شعور کی ایک تحریک، یا لاشعور کا میلان ہے، یا شعور کی رد کا میلان ہے اور وجودیت کا میلان ہے۔ تو کسی ایک تحریک یا میلان کے تحت تو نظم نہیں لکھی جا سکتی۔ یا مارکسی میلان پر ہر نظم نہیں لکھی جا رہی ہے۔ لیکن ہماری شاعری کا ایک بڑا حصہ ترقی پسند میلانات کا حامل ہے۔ اور اب بھی اس حصار میں بیٹھ کر کئی شاعر نئے کامیاب تجربے کر رہے ہیں۔ مثلاً احمد قاسمی تو تھے، اب بھی ہیں، کسی حد تک فیض بھی ہیں، لیکن فیض میں رومانیت زیادہ انقلابیت کم ہے۔ میں ان پر مضمون لکھتے لکھتے رک گیا اس لیے کہ ایک جگہ مجھے الجھن ہوئی، جب تک میں فیض سے باتیں نہ کر لوں "آگے نہیں بڑھوں گا۔" میں دس صفحے لکھ چکا ہوں اور نہیں لکھ سکا۔ ارادہ ہے میرا ان پر لکھنے کا، ان پر لکھ لوں تو احمد ندیم قاسمی پر لکھوں گا۔ قاسمی کے بعد نئے لوگوں میں احمد فراز ہے، حمایت علی شاعر ہے، مدنی ہے۔ عزیز حامد مدنی پر لکھنے کا ارادہ ہے میرا، استاد ہے وہ تو۔ ان کا وشتی امکان میرے پاس ہے۔ وہ آج سے نہیں سن ۱۹۴۷ء سے میرے پاس پڑا ہوا ہے۔ اور بھی کئی شاعر ہیں ان پر لکھا جانا چاہیے مگر میں کتنا لکھوں گا۔

آپ لوگ فرمائش کرتے ہیں مگر آپ لوگ خود کتنا لکھتے ہیں؟ ـ بھئی مجھ سے جو کچھ ہوتا رہا وہ میں کرتا رہا۔ کتنا چاہتے ہیں لوگ؟ میں کوئی تاریخ تو مرتب نہیں کر رہا ہوں۔ اور تاریخ بھی مرتب کروں گا تو ایک ایک پیراگراف سب پر لکھ دوں گا۔ ایک ایک سطر بھی بہت ہے جو لکھ چکا ہوں۔ جوش پر لکھ دیا، لکھ دیا، اس کے بعد سے میں نے نہیں لکھا جوش پر۔ مسلسل اس پر زور دیتا رہا ہوں کہ جوش کو انقلاب سے کوئی واسطہ نہیں ـــ

ہم عصر نقاد

نقادوں میں کئی ہیں، ان کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ خورشید الاسلام ہیں وہاں، خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں۔ یہاں مجتبیٰ حسین ہیں۔ ممتاز حسین ہیں عبادت بریلوی ہیں وہ ـــ DOCUMENTRY تنقید لکھتے ہیں۔ محققانہ تنقید جس کو کہتے ہیں، تو عبادت بریلوی ہیں۔ ڈاکٹر حنیف فوق ہیں اور کیا نام ہے ان کا جو اسلام آباد میں ہیں، نظیر صدیقی۔ ان میں ضرورت سے زیادہ خودی کا پندار ہے، وہ ایک بچپن ہے، ناتراشیدگی ہے، یہ ہیں اور بہت ہیں۔ وہاں ظ۔ انصاری بھی ہیں، وہ مجھ سے علی گڑھ آ کر مل چکے ہیں، ترجمہ اچھا کر لیتے ہیں مگر تنقید ان کی بس ـــ بات یہ ہے کہ وہ جرنلسٹ ٹائپ کے ہیں، ان کی عبارت کچھ ایسی ہو جاتی ہے، ہاں! وہ بڑے ترقی پسند ہیں۔ اُدھر ہندوستان میں اور بہت لوگ ہیں، یہاں بھی کئی اور اچھے نقاد ہیں، کس کس کا ذکر کروں، اِدھر کئی نوجوان اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔ انجم اعظمی ہیں، محمد علی صدیقی ہیں، میں ان سے بڑا ٹھیک مطمئن ہوں ـــ

(تحریر و ترتیب: احمد رئیس) ▲▲

مطالعۂ ادب میں تحلیلِ نفسی کا کردار

سلیم اختر
(پاکستان)

"صرف فرائیڈ کی نفسیات ہی انسانی ذہن کے باضابطہ مطالعہ کی ایک باضابطہ کوشش ہے۔ ژرف نگاہی اور پیچیدہ نظامِ فکر کے ساتھ اس میں جو دلچسپی اور المیاتی قوت ملتی ہے اس کی بناء پر صدیوں سے ادب میں منتشران نفسیاتی بصیرتوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ممتاز اور نمایاں حیثیت اختیار کرجاتی ہے۔"

لائنل ٹرلنگ نے "فرائیڈ اور ادب" پر اپنے مشہور مقالہ کا آغاز ان سطور سے کیا ہے[1] اور آج انھیں تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کیوں کہ فرائیڈ کی نفسیات نے تخلیقِ ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے بارے میں جس گہری بصیرت کا اظہار کیا اسے جدید نفسیات کا ایک درخشندہ باب قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول ارنسٹ جونز ——

"بعض لوگوں کے ذہن میں یہ غلط خیال جڑ پکڑ چکا ہے کہ جمالیات اور تحلیلِ نفسی ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ حالاں کہ تحلیلِ نفسی کے لیے اس کی معروضی اہمیت ہے۔ اس غلط خیال کی بناء پر ایسے مریض جن میں جمالیاتی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ بالعموم مریضانہ قسم کا یہ شدید خوف ظاہر کرتے ہیں کہ شاید تحلیلِ نفسی کے علاج سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں ضائع ہوجائیں گی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تحلیلِ نفسی نے فنونِ لطیفہ کے مقابلہ میں فن کار کی نفسیات کے لحاظ سے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ... افراد کی تحلیلِ نفسی سے یہ واضح ہوچکا ہے کہ جمالیاتی صلاحیتیں اور فن کارانہ تحریکات لاشعور کے نہاں خانوں سے جنم لیتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود وجدان کے مطالعہ سے بھی یہی آشکار ہوتا ہے۔"[2]

تحلیلِ نفسی کے ادبی کردار کے مطالعہ سے بیشتر یہ امر واضح رہے کہ فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی بنیادی طور پر اعصابی خلل کے مریضوں کے لیے ایک طریقۂ علاج تھی۔ (اور اب بھی ہے) لیکن تصورِ لاشعور اور اڈیپس الجھاؤ ایسے نظریات اعصابی خلل میں مبتلا افراد کی الجھنوں کی تحلیل و تفہیم تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے بڑھ کر زندگی اور

---

[1] LIBERAL IMAGINATION (P.54)

[2] WHAT IS PSYCHOANALYSIS (P.15)

معاشرہ کا ایک نئے اور وسیع تر تناظر میں مطالعہ کا آغاز ہو پایا۔ جس طرح ادب اور زندگی میں گہرا ربط ہے اسی طرح ادب اور تنقیدی اصول اور ضوابط بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک بدلے اور دوسرا اس تبدیلی کے اثرات قبول نہ کرے۔

تحلیلِ نفسی اِنسانی شخصیت کے ابنارمل پہلوؤں کی تفہیم اور ان سے وابستہ متنوع لاشعوری محرکات کی تشریح کے لیے وقف کی گئی تھی۔ اس لیے انسانی شخصیت کے مطالعہ سے تخلیقی شخصیت کا مطالعہ کیسے خارج کیا جا سکتا تھا۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ فرائیڈ اور اُس کے شاگردوں اور مقلدین میں ابتدا ہی سے تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات کی تحلیل و تشریح کا رجحان قوی تر رہا ہے۔

آج نفسیاتی تنقید کو تنقید کے اہم ترین دبستانوں میں شمار کیا جاتا ہے اور تحلیلِ نفسی کی روشنی میں انتقادی فیصلے کرنے والے ناقدین کی کمی نہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے ناقدین بھی جنھوں نے ژونگ اور بعض دیگر نظریہ ساز ماہرینِ نفسیات کی تحریروں سے بھی بصیرت حاصل کی اس لیے یہ سمجھ لینا کہ نفسیاتی تنقید میں صرف فرائیڈ کا سکہ چلتا ہے غلط ہوگا۔ یہ درست ہے کہ نفسیاتی ناقدین کی اکثریت نے تحلیلِ نفسی اور اس سے وابستہ تصورات سے بطورِ خاص اثرات قبول کیے، یہی نہیں بلکہ تخلیقات کی پرکھ، شخصیات کے مطالعات آرا و میں بعض اوقات جو سنسنی خیزی ملتی ہے اور جسے بجا طور پر ہدفِ تنقید بھی بنایا جاتا ہے) وہ بھی زیادہ تر تحلیلِ نفسی کے باعث ہے۔ تاہم یہ نفسیات کے وسیع کل میں ایک جزو ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ جزو بعض ناقدین کی دانست میں جزوِ عظیم ہی نہیں بلکہ اصل کل بھی ہے۔

نفسیاتی تنقید اور بعض دیگر اسالیبِ نقد جیسے رومانی، جمالیاتی، تاثراتی وغیرہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ان سب نے ادبی مباحث اور مسائل سے جنم لیا جبکہ ان کے برعکس نفسیاتی تنقید (اس ضمن میں مارکسی تنقید کا نام بھی لیا جا سکتا ہے) نفسیات کے علم کی ضمنی پیداوار قرار دی جا سکتی ہے۔ فرائیڈ نے تحلیلِ نفسی کا نظریہ بطورِ خاص ادبی تنقید کے لیے نہ وضع کیا تھا نہ ہی اس نظریہ سے وابستہ مقاصد میں ادبی تنقید سرِ فہرست رہی۔ دراصل بعض نظریات اتنی آفاقیت ہوتی ہے کہ اپنے عصر کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ لاشعور کا تصور بھی ایسا ہی عالمگیر تصور ثابت ہوا۔ لاشعور انسانی شخصیت کے پیچیدہ عوامل و محرکات کی تفہیم کا ایک ذریعہ تھا اس لیے ہر وہ چیز جس کا انسانی شخصیت سے دور کا بھی تعلق تھا۔ لاشعور کے تصور سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور ادب تو ہے ہی انسانی شخصیت کا اظہار، علاوہ اس سے کیوں نہ متاثر ہو ــــ نفسیات کے زیرِ اثر ادب کی پرکھ کے جن معاییر نے جنم لیا انھوں نے نفسیاتی تنقید کا نام پایا اگر مختصر ترین الفاظ میں نفسیاتی تنقید کی تعریف مقصود ہو تو اسے ادبی شخصیات اور تخلیقات میں لاشعوری عوامل و محرکات کی کارفرمائیوں کا مطالعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جبکہ رینی ویلک اور آسٹن وارن کے مطابق اس کے مقاصد یہ قرار پائیں گے ــ "انفرادی اور فعالی حیثیت میں ادیب کا نفسیاتی مطالعہ، تخلیقی عمل کا مطالعہ، ادبی تخلیقات میں ملنے والے نفسیاتی مواد و امثال کا مطالعہ، اور قارئین پر ادب کے اثرات کا مطالعہ"[2]

تحلیلِ نفسی کی روشنی میں تخلیق کاروں اور تخلیقات کے جو تجزیاتی مطالعے کیے جاتے رہے ہیں ادبی تنقید میں اب بھی

لے فرائیڈ کی سترویں سالگرہ کے موقع پر اس کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں جب ایک مقرر نے اسے "لاشعور دریافت کرنے والے" کا خطاب دیا تو اپنی جوابی تقریر میں فرائیڈ نے یہ کہہ کر خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مجھ سے قبل شاعر اور فلاسفر لاشعور سے آگاہ [illegible] علمی انداز میں اس کی تشریح کر کے اس کے علمی مطالعہ کو ممکن بنایا ـــــ

ے THEORY OF LITERATURE (P. 8)

"ان کی حیثیت کچھ مشکوک سی رہی ہے ۔ حالانکہ اس ضمن میں بہت کچھ لکھا بھی گیا ۔ لیکن بعض کی رائے میں نہ صرف یہ کہ تحلیلِ نفسی کا ادب پر اطلاق نزاعی ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ مسئلہ ہمیشہ نزاعی ہی رہے گا ۔

اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض احباب نے خود فرائیڈ کے اپنے شعوری احساس سے بھی قبل یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ تخلیقات کی تفہیم و تحسین کے لیے فرائیڈ کی تحریریں نیا معیار مہیا کر سکتی ہیں ۔

چنانچہ ارنسٹ کرس کے بقول جب ۱۸۹۵ء میں ڈاکٹر بریور BREUER کے اشتراک سے فرائیڈ کی اولین تصنیف (STUDIES IN HYSTERIA) طبع ہوئی تو تبصرہ نگاروں نے اس کے بارے میں کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہ کیا ۔ طبی جرائد کا رویہ بھی کچھ نیم گرم سا تھا ۔ کم از کم کسی نے اس تصنیف میں ایک جدید نظریہ کا سراغ نہ لگایا تھا ۔ صرف ایک تبصرہ نگار ایسا تھا جس نے اس کتاب میں نئے امکانات کی نشان دہی کی تھی ۔ یہ تبصرہ کسی طبی یا سائنٹیفک جریدہ میں نہیں بلکہ ایک روزنامہ میں طبع ہوا تھا ۔ تبصرہ نگار الفریڈ فان برگر شاعر، ادبی مورخ اور ڈرامہ کا نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ وی آنا میں "امپیریل تھیٹر" کا ڈائرکٹر بھی تھا ۔ گو اس نے بہت کچھ لکھا لیکن ارنسٹ کرس کے الفاظ میں اس کا "یہ تبصرہ اس کی عام تحریروں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک زندہ رہے گا" ۔ برگر نے مصنفین (فرائیڈ اور بریور) کی طویل نفسی سرگذشتوں کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھا کہ "ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فرد کے ذہن میں تجربات اور یادیں کیسے جگہ پاتی ہیں" ۔ اس نے مزید لکھا ـــــ "ان سے ایک مبہم سی توقع بندھتی ہے کہ شاید ایک روز فرد کی شخصیت کے نہاں خانوں میں مستور اسرار سے پردہ اٹھانا ممکن ہو سکے ۔ ویسے جہاں تک اس نظریئے کا تعلق ہے تو یہ اس نفسیات کے علاوہ اور کچھ نہیں جس سے شعراء کام لیتے رہے ہیں :

اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا ۔ "کہ ان مصنفین سے قبل شکسپیر نہ صرف ایسے ہی خیالات کا اظہار کر چکا تھا بلکہ اس نے "لیڈی میکبتھ" کے کردار کی نفسی ساخت اور اس کی تباہی میں بھی وہی اصول پیشِ نظر رکھے تھے جن کی طرف مؤلفین نے اشارہ کیا ہے" ۔ برگر کے بموجب لیڈی میکبتھ ڈنکن کے قتل اور بانکو کے بھوت کی وجہ سے جس شدید الجھن اور دہشت میں مبتلا تھی اس کے تلخ احساس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ جس بیماری میں مبتلا ہوتی ہے اسے بآسانی دفاعی اعصابی خلل قرار دیا جا سکتا ہے[1] ۔

یہ اور اس نوع کی دیگر مثالوں سے برگر نے اس امکان کی طرف توجہ دلائی کہ بریور اور فرائیڈ نے ہسٹریا کے مطالعے کے لیے جو اصول پیش کیے ہیں ان کی امداد سے انسانوی کرداروں کے افعال و اعمال کی وضاحت ممکن ہو سکتی ہے ۔ یوں برگر پہلا شخص بنتا ہے جس نے ان امکانات کی نشاندہی کی جو بعد میں تحلیلِ نفسی وسیع تحقیقات کا ایک مستقل باب ثابت ہوئے ۔

یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ فرائیڈ کی اولین دریافت سے جو کہ ابھی غیر یقینی سی تھی ۔ سب سے پہلے ادبی امکانات کی توقع کرنے والا شخص ایک ادیب تھا ، سائنس دان نہ تھا[2] ۔

مگر یہ اتنا تعجب خیز نہ ہونا چاہیے کہ سائنس دان کے مقابلے میں ادیب میں "وجدانی جست" کی کہیں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے ۔ ابتدا میں جو چیز غیر واضح ، مبہم اور محض ایک امکان تھی تحلیلِ نفسی کے تصورات کے خدوخال نکھرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی نمایاں سے نمایاں تر ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ گیا کہ نارمن ہالینڈ نے اپنے ایک مقالہ ـــــ

[1] شکسپیر کا حوالہ اور لیڈی میکبتھ کا تجزیہ بہت معنی خیز ہے ۔ کیونکہ تحلیلِ نفسی میں غالباً سب سے زیادہ شکسپیر ہی کے ڈراموں کا مطالعہ کیا گیا ہے بلکہ احساسِ جرم کی نفسیات میں لیڈی میکبتھ نصابی مثال ایسی حیثیت اختیار کر چکی ہے ۔

[2] PSYCHOANALYTIC EXPLORATIONS IN ART (P.265)

(مطبوعہ ۱۹۳۱ء) "THE NEXT NEW CRITICISM"

میں ہم عصر تنقید میں تحلیلِ نفسی سے زیادہ امداد نہ لینے پر ان الفاظ میں اظہارِ تعجب پر مجبور ہو جاتا ہے ـــــ

"اس صدی کی ذہنی کاوشوں کی تاریخ مدوّن کرنے پر سب سے بڑا معمّہ یہ ہوگا کہ مقاصد اور طریقۂ کار میں اتنی مشابہت کے باوجود نئی تنقید اور تحلیلِ نفسی کیسے ایک دوسرے سے غیر متعلق رہے"

تحلیلِ نفسی نے جب ادب و نقد میں راہ پائی تو ناقدین کو نئی راہیں سجھائیں ۔ اور اندازِ نظر میں تنوع پیدا کرنے کے ساتھ موضوعات میں بوقلمونی پیدا کی ۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض مقالات انتہا پسندی، غلو اور اندھی نفسیات پرستی کی بنا پر یک طرفہ یک نگاہ اور بعض امور میں تو گمراہ کن بھی محسوس ہوتے ہیں ۔ بعض ایسے اہلِ قلم بھی مل جاتے ہیں جن کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے ۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو۔ چنانچہ کلاڈیا مورلیسن نے ضرورت سے زیادہ نفسیاتی ناقدین پر یوں طنز کیا ہے ـــــ

"اگر ایک ناول کا ہیرو یہ خواب دیکھتا ہے کہ ایک گھوڑا اس کے تعاقب میں ہے تو شاید کوئی ایسا نقاد ہو جو اس خواب کی تشریح کیے بغیر اسے چھوڑ دے بلکہ وہ تو اس کا تعاقب کرتے کرتے ہیرو اور اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار کے لاشعور تک پہنچ کر ہی دم لے گا ۔ اس انداز پر انگریزی اور امریکی ادب کی بیشتر اہم اور بعض صورتوں میں غیر اہم شخصیات کی پوسٹ مارٹم کے انداز پر تحلیلِ نفسی کی جا چکی ہے ۔ بلکہ اس ضمن میں ایڈگر ایلن پو کی مثال فوراً ذہن میں آتی ہے ہم ان کی تحریروں کے لاشعوری معانی" سے اس حد تک آگاہ کیے جا چکے ہیں کہ اب تو ان کی دوستی کے لیے ان کے شعوری معانی کو سمجھانا ایک الگ تنقیدی مسئلہ بن چکا ہے "

اس طرح اے' لے' رو یک نے اپنے ایک مقالے ـــــ

"PSYCHOLOGY OF POST FREUDIAN LITERATURE"

میں بھی ادب میں تحلیلِ نفسی کے استعمال میں بے اعتدالیوں پر ان الفاظ میں احتجاج کیا ہے ـــــ

"گہرائی میں جانے والی نفسیات کا یہ عجیب اور متناقض پہلو ہے کہ ادب میں اس نے عام اور روزمرہ کی چیزوں کو کبھی بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا ۔ کوئی بھی ماہرِ نفسیات زندگی میں عام اور معمولی سمجھی جانے والی چیز کو قابلِ توجہ نہ سمجھے گا...... یہ بھی تعجب خیز ہے کہ ان ماہرِ نفسیات کے لیے نفسیاتی ناول میں کسی طرح کی بھی کشش نہیں ہوتی کیوں کہ ان کے لیے یہ ضرورت سے زیادہ شفاف ہوتا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تخلیقات حقیقت سے جتنی زیادہ دور ہوں گی ۔ ماہرینِ نفسیات کے لیے وہ اتنی ہی افادہ بخش ثابت ہوں گی کہ ان کی تحلیل ہی سے اس کی مہارت کا اظہار ہو سکتا ہے "

اس ضمن میں یہ سوال بھی کیا ہے ـــــ

"کیا ٹالسٹائی کے مقابلہ میں دوستوفسکی محض اس لیے زیادہ عظیم ہے کہ اس کی تحریروں میں جن جذبات کی عکاسی ہوتی ہے ان سے فرائڈ کے اڈیپس نظریہ کی توثیق ہو جاتی ہے "

اس نوع کی تنقیدی کاوشوں کو انھوں نے ادبی کج روی ـــــ (LITERY PERVERSION) قرار دیتے ہیں کہ بات کے نام بھی گنوائے ۔ ادبی تخلیقات کے مطالعہ میں تحلیلِ نفسی کے کردار کے متوازن جائزہ کے لحاظ سے ولیم جے گرفن کا یہ مقالہ مشہور مقالہ قابلِ مطالعہ ہے ـــــ THE USES AND ANUSES

ل "HIDDEN PATTERNS" (P.1)

OF PSYCHO ANALYSIS IN THE STUDY OF LITERATURE
گرفن نے بھی یک طرفہ جنسی مطالعات کی مذمت کی ہے ۔

افراط و تفریط کی ایسی مثالیں ہر نظریہ کے اطلاق میں مل سکتی ہیں۔ اور ان سے اس نظریہ کی تردید یا تکذیب نہیں ہوتی ۔ انھیں زیادہ سے زیادہ غلو یا غلط استعمال کی مثالیں قرار دیا جا سکتا ہے ۔ بہر یہ حقیقت بھی کسی طرح سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ارنسٹ جونز، ہربرٹ ریڈ، لائنل ٹرلنگ، بانس ساش، ایڈمنڈ ولسن، کینتھ برک اور ماڈ باڈکن وغیرہ کی صورت میں ایسے نام نظر آتے ہیں جنھیں تنقید کے نفسیاتی دبستان میں قد آور شخصیات کا درجہ حاصل ہے ۔ اسی طرح نفسیات کے مختلف رجحانات کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرائیڈ کے خیالات نے عمومی طور اور تحلیل نفسی نے خصوصی طور پر ادب و نقد پر جو اثر انداز کی اس میں ابھی تک کمی نہیں ہوئی چنانچہ ناقدین ادب کے ساتھ ساتھ ماہرین نفسیات بھی ادبی تخلیقات اور تخلیقی شخصیات پر اس کے اطلاق میں تنوع کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں ۔

اس ضمن میں کلاڈیا مورلین کا یہ بیان بھی معنی خیز ہے جس کے بموجب "گو اب فرائیڈ کے نظریات کا پہلے کی مانند زور شور تو نہیں رہا لیکن تنقید میں نہ صرف یہ کہ ابھی تک اس کا سکہ[1] چل رہا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے تو اس کی نشاۃ الثانیہ ہو رہی ہے ۔"

فرائیڈ کے اثرات کی گہرائی کا اندازہ لگانا ہو تو ۱۹۴۵ء میں مطبوعہ جیسے ایف ہوفمین کی تالیف "FREUDIANISMS THE LITERARY MIND" کا مطالعہ بھی سود مند رہے گا ۔

جہاں تک فرائیڈ کے دوسرے دو عظیم معاصرین یعنی الفریڈ ایڈلر اور کارل ژونگ کے نفسیاتی تصورات کے ادب و نقد پر اطلاق کا تعلق ہے ۔ تو ایڈلر کے نظریات نے سب سے کم اثرات ڈالے اور اہم ناقدین میں سے صرف ہربرٹ ریڈ کا نام نظر آتا ہے جس نے سنجیدگی سے احساس کمتری کے تصور سے اپنے تنقیدی فیصلوں میں امداد لی ۔ اس کے مقابلہ میں ژونگ کے اثرات آہستہ آہستہ مگر مستقلاً ادب و نقد میں نفوذ کرتے جا رہے ہیں ۔ فرائیڈ سے باغی ناقدین میں ژونگ کی طرف جھکاؤ کا رجحان قوی تر ہوتا جا رہا ہے ۔ چنانچہ اجتماعی لاشعور اور نخستمثال (ARCHE TYPE) کی روشنی میں تنقید کرنے والوں نے اپنی انفرادیت اس حد تک تسلیم کروالی ہے کہ ولبر سکاٹ نے فرائیڈین تنقید سے ممیز کرنے کے لیے اپنی تالیف (FIVE APPROACHES OF LITERARY CRITICISM) میں (ARCHETYPAL CRITICISM) کے عنوان سے جداگانہ باب مختص کیا ۔ ▲▲

---

۱ NEW OUT LOOKS IN PSYCHO ANALYSIS (P.424)

ادب اور قاری

منظر امکانی
(پاکستان)

ادیب اور غیر ادیب کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو لوگ لکھتے ہیں۔ وہ ادیب ہیں اور جو نہیں لکھتے وہ غیر ادیب، یہ بات شاید آپ کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ چونکہ اگر ہر لکھنے والے ادیب تسلیم کر لیا جائے تو بات ڈاک خانے کے سامنے بیٹھے ہوئے منشی سے آگے پہنچ جائے گی — جبکہ ادیب کے لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو لافانی شاہکار کرتا ہے۔ جسے وقت اور انقلاب بھی نہیں مٹا سکتے۔ مگر ایک لمحے ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ لافانی شاہکار تخلیق کرنے والے تو گنتی کے چند ہی ہوتے ہیں مگر ان برساتی کیڑوں کو کیا نام دیا جائے جو ایک آدھ افسانہ یا نظم لکھ کر نہ تو چین سے روٹی کھاتے ہیں اور نہ لافانی شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے ان محرکات پر غور کرنا ہوگا جو آدمی کو لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ کوئی کلیہ بنایا نہیں جا سکتا۔ چونکہ تمام ادیبوں کے بارے میں ایک تو تفاصیل معلوم نہیں، جس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ دوسرے جن ادیبوں سے مدد ملتی ہے ان میں اس قدر تضاد ہے کہ مسئلہ مزید الجھ جاتا ہے۔ مثلاً ورڈزورتھ فنی تخلیق کو تقویت اور تسکین کا ذائقہ کہتا ہے جبکہ بودلیئر تخلیق کا کام قرض خواہوں کے خوف سے کرتا ہے۔ غالب ستائش اور صلے کی تمنا کیے بغیر مضامین خیال غیب سے منگواتے رہے۔ اور مجنوں گورکھپوری ایمرسن کے قانونِ تلافی (LAW OF COMPPENSATION) کی بدولت صاحبِ قلم ہوئے۔ فرائیڈ اور اس کے مقلدین کا خیال ہے کہ جب کوئی جبلت براہِ راست تسکین نہیں پاتی تو وہ تسکین کے دوسرے ذرائع اختیار کرتی ہے۔ اور فنی تخلیق بھی اسی طرح کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ فنی تخلیق کے بارے میں اس نقطۂ نظر پر مزید غور کرنے سے پہلے ان عوامل پر نظر ڈال لیتے چلیں جن کی بدولت جبلت اپنی تسکین کے لیے دوسرے ذرائع استعمال کرتی ہے۔ یہاں پہلی صورت جو سامنے آتی ہے وہ خود آدمی کی شخصیت ہے۔ جو ظاہری اور باطنی فرق اور اختلاف رکھتی ہے۔ عام آدمی اس فرق اور اختلاف کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ اور اسے یہ دو رنگی گراں نہیں گزرتی۔ مگر فنکار کو اس دو رنگی کے علاوہ ایک اور مسئلہ پیش آتا ہے جو اس کے اندر ایک جنگ کی صورت جاری رہتا ہے۔ اس اندرونی کشمکش کو (CULTURE EGO) اور (DRIVE EGO)

کی جگہ کہہ لیجئے۔ جس میں فن کار جس چیز کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اسے سماجی اقدار بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فن کار اپنے اظہار کے لیے مختلف علامات کا سہارا لیتا ہے۔ بعض اوقات فن کار اس کیفیت میں خود سے سمجھوتہ کر لیتا ہے یعنی اظہار کے ایسے مسلکوں کے بجائے اس روش کو اختیار کر لیتا ہے جو سماجی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہو۔ فن کار کی یہ کوشش فنی تخلیق میں جو صورت اختیار کر لیتی ہے وہ اندر سے باہر کی طرف نہیں ہوتی بلکہ یہاں باہر سے اندر کی طرف رخ ہوتا ہے۔ اس عمل میں فن کار کا بنیادی مقصد سماجی حیثیت حاصل کرنا ہوتا ہے جس کی بعض صورتیں سماجی اقدار کی پابندی کے علاوہ حاکمِ وقت کی نظروں میں مقام حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ اس انداز کی کوشش ان قصائد میں ملتی ہے جو دوسروں کو خوش کرنے کے لیے لکھے گئے ہوں جبکہ ہماری شاعری کا بیشتر حصہ مشاعروں میں داد پانے کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ ایک زمانے میں شاعر کی عظمت کا دارومدار مشاعرے کی کامیابی پر تھا۔ یہاں میں جگر مرادآبادی کی مثال پیش کروں گا جن کی شاعرانہ عظمت کو بنانے میں شاعری سے کہیں زیادہ مشاعرے کا کمال ہے۔ جگر مرادآبادی کے بارے میں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے انہیں صرف مشاعرے کا شاعر نہیں کہا بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان کی شاعری ہماری روایت کی تو ایک اچھی مثال ہے مگر ان کی شہرت کا ذریعہ مشاعرہ ہے۔ میری اس بات کو وہ لوگ زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے جنہوں نے جگر مرادآبادی کو مشاعرے میں سنا ہے۔ جہاں حسرتؔ، یگانہؔ، اصغر اور فانی وغیرہ جیسے لوگ عام کے معیار پر نہیں اترتے تھے۔ حالاں کہ آج جب ہم جگر مرادآبادی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اپنی اچھی شاعری کے باوجود اتنے بڑے شاعر نہیں لگتے کہ انہیں حسرتؔ، یگانہؔ، اصغر اور فانی سے بڑا شاعر کہا جائے۔

معاف کیجئے گا۔ میں عرض شخصیت کے ظاہری اور باطنی فرق اور اختلاف کے بارے میں کر رہا تھا لیکن بات کہیں اور پہنچ گئی۔ خیر آدمی کا فرق اور اختلاف ہی ایک اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس سے چشم پوشی عام آدمی کے لیے تو سود مند ہو سکتی ہے مگر فن کار کا تو لازمی فریضہ ہے کہ خود آگاہی اور اپنی شخصیت کے سارے عناصر کو ایک مرکز پر لائے۔ مگر خود آگاہی اور شخصیت کے تمام عناصر کو ایک مرکز پر لانا اس قدر آسان نہیں ہے کہ جس طرح جدیدیت کے مارے ہوئے ایک شاعر کے حوالے سے پوری جدید شاعری کو سمجھ لیا جائے۔ بلکہ یہاں فن کار کا اپنے لاشعور سے آنکھیں ملانا کس قدر مشکل اور کربناک مرحلہ ہے اس کا تجزیہ ان لوگوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں مگر اپنے لاشعور سے آنکھیں نہیں ملاتے۔ میں نے اپنے ایک مضمون "شکیبؔ جلالی" میں اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی تھی جس پر مشہور نقاد انور سدیدؔ نے میرا شجرۂ نسب سلیم احمد سے ملا کر جب اپنے لاشعور کو پڑھا تو غالب کی محبوبہ "چاندنی" کو چھپا پایا۔ جس کا اظہار انورؔ سدید نے گذشتہ دنوں غزل میں یوں کیا ؎

دفعتاً دیکھا تو انورؔ ہو گیا مبہوت سا
چاند پس منظر میں تھا اور پیش منظر چاندنی

لاشعور سے آنکھیں ملانا اس لیے بھی مشکل اور کربناک ہے کہ جو کرب لاشعوری تھا اسے شعوری کرب بنانا پڑتا ہے۔ یعنی لاشعوری کرب کو شعور میں لا کر اسے شعوری طور پر دبانا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ کرب جو لاشعور میں پڑا تھا شعوری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جسے فن کار کو شعوری کوشش سے روکنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے مگر اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فن کار اپنے کرب سے واقف ہو کر خوف زدہ نہیں رہتا۔ فرائیڈ نے تو عام آدمی کے لیے ذہنی صحت مندی کا ذریعہ اسی لاشعوری علم کو بتایا ہے۔

لاشعور سے آگاہی دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ "وہ کیا ہے" یہاں فن کار کو یہ درس نہیں ملتا کہ "وہ کیا نظر آتا ہے" یا "اسے کیا ہونا چاہیئے"۔ جب فن کار اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ "وہ کیا ہے" تو اس کی تخلیقات میں انفرادیت ابھر آتی ہے جس میں اجتماعیت کا وہ

کو کھلا پن نہیں ہوتا جس کا اظہار ترقی پسند یا کسی فکر سے متاثر ہو کر کرتے ہیں بلکہ یہاں فن کار ایک ایسی آواز محسوس ہوتا ہے جس میں رنگ و نسل کے ظاہری فرق نہیں ملتے۔ انسان اپنی ابتدائی شکل میں دوسرے لوگوں کی طرح احساسات و جذبات رکھتا ہے ان احساسات و جذبات کی یکسانیت کی بدولت خطۂ زمین کے فن کاروں کی تخلیقات میں ایسا اثر اور قوت پیدا ہوتی ہے جو صرف فن کار کی زندگی اور زمانے تک کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات اس وقت تک باقی رہتے ہیں جب وہ زبان باقی رہتی ہے۔ اس طرح کسی فن پارے کی عظمت انہی لوگوں تک محدود نہیں ہوتی جن کی زبان میں فن پارہ موجود ہو بلکہ اس کا تاثر ان لوگوں پر بھی اسی شدت سے ہوتا ہے جو فن کار کی زبان کو سمجھ لیتے ہیں۔ میر نے اسی فن کارانہ عظمت کو سمجھنے کے بعد دعویٰ کیا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

جب فن کار اپنی شخصیت کے تمام عناصر کو ایک مرکز پر لے آتا ہے تو اس کا تخلیقی عمل تسکین کا خواہش مند نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ فن کار فنی تخلیق کو تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ لاشعور سے آگاہی ایسا کرب ہے جسے شعوری کرب بنانا پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فن کار میں عزم و ہمت نہ ہو تو وہ کرک گارد اور نطشے کی طرح ہو جاتا ہے جن میں لاشعور سے آنکھیں ملانے کی قوت تو تھی لیکن اسے شعوری صورت میں روکنا ممکن نہ تھا جس کی وجہ سے یہ فلسفی "کس طرح دیکھ رہا ہوں" کے بجائے "کیا دیکھ رہا ہوں" کی منطقی بحث میں اُلجھ گئے۔

خیر چھوڑیے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ جن پر مجھ ایسے کم علم کا کوئی فیصلہ بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ اس کا بہت تو محمد حسن عسکری صاحب جیسی شخصیت میں ہے جو مدتوں ترقی پسندوں سے نبرد آزما رہے اور جب خاموش ہوئے تو ڈاکٹر احسن فاروقی جیسے لوگوں کو میدان ہاتھ آ گیا۔

یہاں شاید آپ مجھے یاد دلائیں گے کہ مضمون کی ابتدا میں میں ان محرکات کی تلاش میں چلا تھا جو آدمی کو فنی تخلیق پر مجبور کرتے ہیں۔ مگر ابھی تک اصل موضوع سے اُردو کے پروفیسروں کی طرح غائب ہوں۔ دراصل فنی تخلیق پر مجبور کرنے والے محرکات کا جواب تو ہر دوسرے آدمی سے مل سکتا ہے۔ (عام خیال یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر دوسرا آدمی شاعر یا ادیب ہے) مگر بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ لوگ ایک آدھ نظم یا افسانے کے بعد عمر بھر ادب کے گلے کی چھچھوندر کیوں بن جاتے ہیں؟ ادب کی پیشانی پر یہ بدنما داغ اس وجہ سے زیادہ نظر آتے ہیں کہ ادب کو تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کا بڑا مسئلہ جوانی کے گھٹے ہوئے جنسی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جن سے کچھ لکھ لکھا لیتے ہیں اور جب کچھ نہیں رہتا تو کسی ادبی انجمن کا قیام یا کسی ہوٹل کے کونے کو آباد کرنا ادب سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک الگ اسلوب اختیار کرنا تو بڑی بات ہے دوسروں کے اسلوب کو بھی صحیح طور پر اختیار نہیں کرتے۔ ان فن کاروں میں بھی عام لوگوں کی طرح شخصیت کے فرق اور اختلاف کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اسی چشم پوشی میں یہ اپنے آپ سے رشتہ توڑ کر مختلف حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ آدمی کی اسی ٹوٹ پھوٹ کو سلیم احمد نے کسرت کیا ہے۔ مظفر وارثی نے کس قدر سچائی سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ؎

کر دیے ہیں زندگی نے مختلف حصے مرے
مجھ سے ملنا ہے اگر بٹ کر کئی حصوں میں آ

ان ادیبوں (اپنا کوئی اسلوب نہ بنانے والے) کے بعد ایسے فن کار دکھائی دیتے ہیں جو اسلوب کے سلسلے میں آئے دن نت نئے تماشے دکھاتے ہیں۔ یہ مداری پن دراصل دوسروں کی شہرت کے زیر اثر اختیار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات دوسروں کی اولاد معلوم ہوتی ہے۔ ان فن کاروں کے بارے میں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ نت نئے تماشے دکھانے میں بعض اوقات ان کی انفرادیت بھی اُبھر آتی ہے۔ جس کی بدولت یہ آسمہ

نظم یا افسانہ قابلِ ذکر بن جاتا ہے مگر یہ کیفیت وقتی اثر رکھتی ہے۔

اس آغاز کے فن کاروں کے علاوہ ایسے فن کار دکھائی دیتے ہیں جن میں انفرادیت کا جوہر ہوتا ہے اور ان کا اسلوب بھی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے انہیں کافی دیر تک یاد بھی رکھا جاتا ہے۔ گمان کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ اُبھرتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ فن کار مختلف تجربات کو ادب قرار دیتے ہیں۔ دراصل یہ فن کار لاشعوری عمل ذہنی صحت مندی کے لیے ضروری ہے اور یہ سلسلہ تا حیات قائم رکھے بغیر فن کار اعلیٰ تخلیق نہیں کر سکتا۔ لاشعوری عمل سے غفلت اور آگہی کو بھولی کا جذبہ انہیں ناکارہ بنا دیتا ہے۔ جس کی بدولت وہ GOOD NAME پر سفر کرتے ہیں۔ خود کو دہرانے کی باتیں اور ابتذالیت میں جو فرق ہے اسے بھلاتے ہوئے ایسے فن کاروں کی طرف آئیے جو ادب کو تبلیغی ذریعہ کہہ کر اس سے وابستگی پیدا کرتے ہیں۔ ادب کی اساس نظریے پر قائم ہو تو لاشعور سے آگاہی کا عمل موت سے زیادہ بھیانک لگتا ہے۔ ایسے فن کاروں میں نہ تو اپنے لاشعور کو پہچاننے کا جذبہ ہوتا ہے اور نہ ہمت بلکہ ان بیچاروں کی تو اوپر والی منزل ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے فرمانبردار اولاد کی طرح دوسروں کے بتلائے ہوئے راستے پر عمر بھر چلتے ہیں اور کبھی کبھار استاد ظہیر کی طرح مرنے کا اعزاز بھی اسی سرزمین پر پا لیتے ہیں۔ اس قسم کا تبلیغی ادب انہیں جیسے مزاج کے لوگوں میں پسندیدگی کی منزل تک آتا ہے۔ ادبی تاریخ یا ادب کے حصار پر ان فن کاروں کا پورا اثر نا مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری اور ممتاز حسین جیسے ناقدین تو تسلیم کرتے ہیں مگر آفاقی ادب اس سے مختلف ہوتا ہے۔ اب تو روس والے بھی ادب کے معاملے میں بدل گئے ہیں۔

فنی تخلیق میں کچھ فن کار ایسے بھی ملتے ہیں جن پر بڑے فن کاروں کا اثر مشرقی عورتوں کے آسیب کی طرح چھایا رہتا ہے۔ ایسے فن کار تبلیغی ادب پیدا کرنے والوں کی طرح عقل کے اندھے نہیں ہوتے مگر ان کی اپنی شخصیت اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ اپنے پسندیدہ فن کاروں کی پیروی میں اتباع تک پہنچ جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی صلاحیت دوسروں کا عطیہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسے فن کار خود کو اس شدید اثر سے الگ بھی کرنا چاہتے ہیں مگر یہ اثر ان پر شیخ سدو کی طرح ہمیشہ سوار رہتا ہے۔ ان کی تخلیقات کس قسم کا ادب ہیں اس کا فیصلہ تو آپ خود فتح محمد ملک اور انور سدید کی تحریریں پڑھ کر کر لیں گے۔ چوں کہ میری معتوبی کا عرصہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔

ادب میں کثرتیت کے دیگر زاویوں کا سراغ مولانا ماہر القادری پہ چھوڑتے ہوئے ان فن کاروں کی طرف آئیے جو لافانی شاہکار تخلیق کرتے ہیں اور جنہیں پورے آدمی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ "پورے آدمی" کے بارے میں میں نے ابتداء میں عرض کیا ہے کہ وہ شخصیت کے فرق اور اختلاف سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ خود آگاہی اور شخصیت کے تمام عناصر کو ایک مرکز پر لانا فن کار کا بنیادی فریضہ ہے۔ "پورا آدمی" اپنے لاشعور سے عمر بھر برد آزما رہتا ہے۔ اس کا اسلوب ہمسائے سے مانگا ہوا نہیں ہوتا کہ کھو جانے کا خدشہ رہے۔ "پورا آدمی" اپنے عہد کی معاشرتی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کے فن پارے انفرادیت میں ڈیکارٹ اور اجتماعیت میں مارکس کے فلسفے کی طرح ایک ہی رُخ ظاہر نہیں کرتے بلکہ انفرادیت میں بھرپور اجتماعی احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔

ادب میں "پورے آدمی" کا مسئلہ جس قدر دشوار ہے اسی طرح اس ادب سے بھرپور آگاہی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کی طرح پڑھنے والوں کی اکثریت تسکین کے جذبے کی خاطر اس طرف آتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض اوقات لافانی شاہکار بھی اسی تسکین کی بدولت پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے ادب کا جو معیار قائم ہوا ہے اسے غالب پرستی کہہ لیجیے یا اقبال اکیڈمی فرق کچھ بھی نہیں پڑتا۔ فیشن اور عام رجحان سے متاثر ہو کر پڑھنے والے قارئین زیر بحث نہ لائیں تو ایک طبقہ ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو کچھ نہ کچھ پڑھتا ہے اور ان میں کسی حد تک تسکین حاصل کرنے کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ یہ قارئین بھی شخصیت کے فرق اور اختلاف سے قطعی بے نیاز ہوتے ہیں۔ لہٰذا ادب کو

اس حقیقت تک قبول کرتے ہیں جہاں وہ خود ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایسے پڑھنے والے ہیں جو فن پارے سے تسکین کے بجائے "خود آگاہی" چاہتے ہیں۔ یہ فن پارے سے اپنے وجود کو ایک مرکز پر لاتے ہیں۔ قارئین کی یہ کوشش اور جذبہ خوداں کے لیے ایک اچھی علامت ہے۔ چونکہ وہ فن کار کے تعلق سے لاشعور کے عمل تک آنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے ان سے آئندہ امید یں وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ وہ لاشعوری عمل کو صحیح معنوں میں برت سکیں گے۔ مگر قارئین کا وہ طبقہ انتہائی خطرناک ہے جو فن پارے کی بنیادی کیفیت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ان کی یہ کوشش شعور سے لاشعور کی طرف ہوتی ہے جو نفسیات کے معالج ہوتے ہیں۔ ایسے پڑھنے والے فن کار کے بنیادی نقطے پر پہنچ کر اس قسم کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ جو فن کار فن پارے کی تخلیق کے بعد محسوس کرتا ہے۔ انسان احساسات و جذبات کے اعتبار سے مختلف نہیں ہوتے لہٰذا جب قاری فن کار کے کرب کو پانے کے بعد واپس ہوتا ہے تو اس کا حال بھی فن کار جیسا ہوتا ہے۔ وہ بھی فن کار کی طرح لاشعور کو شعور میں بلاشعوری طور پر رکھتا ہے۔ قاری کا یہ عمل فن کار جیسا کربناک ہوتا ہے لہٰذا ایسا قاری تخلیقی عمل کے بغیر ہی تخلیقی عمل کی اذیتوں کا شکار ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ قاری اور فن کار کے لیے تکلیف دہ ضرور ہے مگر اپنے آپ کو پانا کس قدر ضروری ہے اسے غالب نے ہستی کے فریب کا ذریعہ بنایا تھا۔ اور بیدم وارثی نے یہ کہا ہے

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

آج کل قارئین کس قدر ادب دوست ہیں اس کا اندازہ تو چند ادبی رسالوں سے لگایا جاسکتا ہے جنہیں اس قدر مشکلات کے باوجود کچھ سرپھرے چلا رہے ہیں۔ جہاں تک ادب میں پورے آدمی کا مسئلہ ہے تو اس کے لیے "پورا قاری" ہونا بھی ضروری ہے۔ میں اپنے بارے میں بخوبی واقف ہوں اسلئے خالی جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ آپ بھی سوچیے شاید کچھ قاری کی تلاش کے بعد ادب میں پورے آدمی کا مسئلہ باقی نہ رہے۔ ▲▲▲

اردو ڈراما

رونق زیدی
شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ (یو پی)

عالمی ادب میں ڈراما ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ڈرامے کی ابتدا یونان میں مذہبی تبلیغ اور تفریح کی غرض سے ہوئی۔ یونانی لوگ دیوی دیوتاؤں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ شروع میں ڈائونیسس (DIONYSUS) دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ اس کی شان میں گیت لکھتے، گاتے اور اس کے سامنے رقص کرتے۔ بس وہی ڈرامہ کی ابتدائی شکل تھی۔ یونانی ڈرامہ نگاروں نے ہومر (HOMER) اور دوسری لوک کہانیوں سے MATTER لیکر ڈرامے لکھے تھے۔ یونان کا پہلا ڈرامہ نگار تھیسپس (THESPIS) تھا۔ اُس نے اپنے ڈرامہ کو سب سے پہلے ایتھنز (ETHENS) میں پیش کیا۔ اس کے ڈرامہ میں ایک ہی کردار ہوتا تھا۔ اس کو وہ خود ہی اسٹیج کرتا۔

ہندوستان میں بھی ہندی دیومالا کی اساس اور شاہی تفریح کی غرض سے سنسکرت ڈراموں کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں ڈرامہ نگاروں کی زبان بڑی مشکل ہوتی تھی۔ کالی داس اور بھبوتی پرساد نے سہل اور سادہ زبان میں ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ مکالمے نثر اور نظم دونوں ہی ہوتے تھے۔ فنّی اعتبار سے کالی داس کے ڈرامے اعلیٰ درجہ کے ڈراموں میں شمار کیے جاتے تھے۔

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو ڈرامہ کافی بعد میں آیا۔ اردو ڈرامہ کا آغاز ایک مرہٹی تھیٹریکل کمپنی "دی ہندو ڈرامیٹک کور" سے ہوا۔ یہ سفری کمپنی تھی۔ اس کے ٹوٹ جانے کے بعد "پارسی ڈرامیٹک کور" نے اس کی جگہ لے لی۔ چند گجراتی ڈرامے دکھانے کے بعد اردو ڈرامے لکھنے شروع کر دیے۔ عیسائی پادری اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے حضرت عیسیٰ کی زندگی کے واقعات ڈرامے کے روپ میں پیش کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے مطابق "عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے تماشے کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا" پھر انگریزوں نے سنہ ۱۷۵۰ء میں تھیٹر کی بنیاد ڈالی۔

اردو تھیٹر کی ترقی میں پارسیوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا ڈرامہ ۸ فروری سنہ ۱۸۵۳ء کو "نیم حکیم اور قتل عام" دکھایا۔ پھر فارسی، انگریزی، اور عربی کی کہانیوں، قصوں کو تاریخ کے واقعات سے اخذ کر کے ڈرامے

لکھے ۔ پارسیوں کا ذوقِ ڈرامہ نگاری اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اپنے اوپر کفر کے فتوے عائد ہو جانے کے باوجود بھی ان کی دلچسپی قائم رہی ۔ انھوں نے شاہنامہ سے رستم و سہراب کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ۔ بمبئی میں اُردو تھیٹر کی ترقی میں پارسیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں نے بڑا حصّہ لیا ۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں فنونِ لطیفہ، شعر و نغمہ اور رقص و سرود اپنے عروج پر تھا ۔ بھانڈوں کی محفلیں جمتی تھیں ۔ واجد علی شاہ خود ڈرامہ تیار کرتے تھے ۔ اُردو میں سب سے پہلا ڈراما "رادھا اور کنہیا" واجد علی شاہ نے ہی لکھا ہے ۔ اس کے علاوہ واجد علی شاہ نے تین ڈرامے اور لکھے ہیں ۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی کے خیال میں واجد علی شاہ ہی اُردو کے پہلے ڈراما نگار ہیں ۔

رادھا اور کنہیا ڈرامے کی تیاری میں کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا ۔ قیمتی موتیوں کو پیس کر بدن پر ملا جاتا تھا ۔ کئی مہینے تک اُستادوں نے اداکاری کی ٹریننگ دی ۔ پہلی مرتبہ ۱۸۴۳ء میں شاہی دربار میں اس کو اسٹیج کیا گیا ۔ دیکھنے والوں پر محویت طاری تھی ۔ "رادھا کنہیا" کرشن کی کہانی ہے ۔ رادھا اور کنہیا اس کے خاص کردار ہیں ۔ صحرا ایک غم زدہ عورت ہے ۔ اس نے جوگ لے لیا ہے ۔ غربت اس کا خادم ہے ۔ صحرا غربت سے اپنی افسردگی کی وجہ بتاتی ہے کہ اس نے بہت دن سے رادھا کنہیا کا رقص نہیں دیکھا اس لیے غم زدہ ہے ۔ غربت عفریت کی مدد سے ناچ کراتا ہے ۔ جس میں کچھ پریاں شریک ہوتی ہیں ۔ اس ڈرامے کے کردار سیدھے سادے ہیں ۔ اس قصّہ پر کرشن لیلا کا اثر ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ نے انھیں لیلاؤں سے متاثر ہو کر یہ ڈراما لکھا تھا ۔

اس کے بعد امانت لکھنوی نے ایک منظوم ڈراما اندر سبھا لکھا ۔ امانت ایک اچھے شاعر بھی تھے ۔ قافیہ بندی سے انھوں نے ڈرامے میں حسن اور ترنّم پیدا کر دیا ۔ اندر سبھا میں رقص کی خصوصیات بھی ملتی ہیں ۔ ڈرامے میں ہر پری گاتی ہے لہٰذا اس کو اوپیرا بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس ڈرامے کا پلاٹ بہت معمولی ہے ۔ پھر بھی اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں کیا گیا ۔ ۱۸۹۲ء میں اس کا جرمنی میں بھی ترجمہ کیا گیا ۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اس کے چالیس مختلف نسخے موجود ہیں ۔ اندر سبھا کی شہرت کو دیکھ کر مداری لال نے بھی اسی نام سے ڈراما لکھا ۔ مگر وہ امانت سے بہتر نہ لکھ سکے ۔ اور بھی کئی ڈراما نگاروں نے امانت سے متاثر ہو کر اندر سبھائیں لکھیں لیکن انھیں بھی وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو امانت کو حاصل تھی ۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۵ء تک اُردو ڈراما اور اسٹیج کافی ترقی کرتا رہا مگر زبان و بیان کے لحاظ سے کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی ۔ اس دور کے ڈراما نگاروں میں سب سے پہلا نام رونق بنارسی کا ہے ۔ جو خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کے مقبول ترین ڈرامہ نگار تھے ۔ ان کے ڈراموں میں بے نظیر بدر منیر، لیلیٰ مجنوں، انجام الفت، حاتم بن طے، عاشق کا خون، فسانۂ عجائب عرف جان عالم انجمن آرا، خواب گاہ کا عشق، نقشِ سلیمانی، فریب فتنہ، گھڑی میں گھڑیال، وغیرہ ڈرامے کافی مشہور ہیں ۔

ظریف نے بھی ڈرامے لکھے مگر ان کے ڈرامے زیادہ شہرت نہ پا سکے ۔ طالب بنارسی اپنے ہم عصر ڈرامہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں ۔ وہ راسخ دہلوی کے شاگرد تھے ۔ ڈاکٹر عبد العلیم کا خیال ہے کہ طالب نے ۱۸۸۴ء سے ڈرامے لکھنے شروع کیے اور ۱۹۱۱ء تک لکھتے رہے ۔ گوپی چند، نگاہ غفلت، ہریش چندر، وکرم ولاس، دلیر دل شیر، نیل و نہار مشہور ڈرامے ہیں ۔

مہدی حسن "احسن لکھنوی"، عبد اللطیف شاد، پنڈت نرائن

پرشاد بیتاب، سید عباس علی عباس، محمد مراد علی لکھنوی نے تجارتی کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے۔ آغا حشر کشمیری اس زمانے کے مشہور اور مقبول ڈراما نگار کہلائے۔ انھوں نے "شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی" کی بنیاد ڈالی۔ آغا حشر نے تقریباً ۳۲ سے ۳۳ سال تک ڈرامے لکھے۔ شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا۔

پروفیسر آل احمد سرور کے خیال میں ــــ "آغا حشر نے اپنی ساری زندگی ڈرامے کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے ذریعہ سے انھوں نے روپیہ بھی کمایا۔ اور شہرت بھی حاصل کی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ڈرامے کے فن کو بھی بلند کیا .... انھوں نے اپنا ربط براہِ راست عوام سے رکھا۔

اس دور میں آ کر قافیہ کا التزام بھی کم ہو گیا تھا۔ مکالموں میں گفتگو کا انداز پیدا ہو گیا۔ گانے بھی کم سے کم استعمال ہونے لگے۔ (رستم و سہراب میں صرف ایک ہی گانا ہے) آغا حشر نے ڈراما نگاری کو اوپر اٹھانے کی سعی کی۔ فنی اعتبار سے ان کے ڈراموں میں کچھ نکھار ضرور آ گیا تھا مگر ان کے ڈراموں میں ڈھیلا پن نظر آتا ہے۔ پلاٹ سپاٹ ہیں۔ کردار نگاری بھی اعلیٰ درجہ کی نہیں۔ پھر بھی اُردو ڈراما کو انھوں نے شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ آغا حشر کے علاوہ اس دور کے چند نام اور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ محمد عبد العزیز' ذاتی لکھنوی ــــ ذاتی کے ڈراموں کو بھی عوام نے کافی حد تک پسند کیا۔ آغا سید اصغر علی نظامی نے بھی اس دور میں ڈرامے لکھے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اخلاقی، نیم مذہبی و نیم سیاسی ڈرامے لکھے۔ بیوفوں کی ہتھکڑی' غازی صلاح الدین' اتفاق عرف قومی دلیر' حسن کا چاند' اصغر علی نظامی کے مشہور ڈرامے ہیں۔

میر غلام عباس نے بھی کافی عرصہ تک پارسی اور مرہٹی کمپنیوں کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے۔ ان کا طرزِ اسلوب عام فہم اور سادہ تھا۔ انھوں نے اخلاقی' اصلاحی' نیم سیاسی ہر رنگ میں ڈرامے لکھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے پہلا ڈراما نیرنگِ ستمگر لکھا۔ جسے عوام نے کافی پسند کیا۔ اس کے علاوہ نیرنگِ ناز، دکھیا دلہن' جاں نثار' زنجیر گوہر' نور جہاں جہاں آرا و' نور اسلام عرف نیرد' خزانہ دہن' نئی زندگی' کل کیا ہوگا' سیوک دھرم' سونے کی چڑیا' ایک ہی پیسہ وغیرہ ڈرامے مشہور ہوئے۔ غلام محی الدین نازاں دہلوی۔ محمد ابراہیم محشر انبالوی۔ ماسٹر رحمت علی۔ سید انور حسین آرزو۔ سید کاظم حسین نشتر لکھنوی منشی آرزو بدایونی۔ سید عشرت حسین نیر دہلوی نے بھی اس دور میں ڈرامے لکھے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مسائل کچھ حد تک حل ہونے شروع ہو گئے۔ بے روزگاروں کو روزگار ملنے لگا۔ لہٰذا غور و فکر کے انداز بدل گئے۔ ادبی اور سماجی زندگی کے طور طریقے بدل گئے۔ قدیم اور جدید میں ٹکراؤ شروع ہوا۔ اُردو ادب بھی ان اثرات سے دوچار ہوا۔ محمد حسین آزاد نے ادبی ڈراموں کی طرف اپنی توجہ کو منتقل کیا۔ تمثیلی ڈراما "اکبر" سے انھوں نے ادبی ڈراموں کا آغاز کیا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا۔ مگر محمد حسین آزاد کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے ڈرامے زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ محمد حسین آزاد کے علاوہ عبد الحلیم شرر نے بھی اصلاحی ڈرامے لکھے۔ شہید وفا کافی مقبول ہوا۔ اس کا پلاٹ سیدھا اور سپاٹ ہے۔ مگر کہانی میں ندرت ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے مرقع لیلیٰ مجنوں لکھا۔ مگر ان کے ڈرامے زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

پریم چند نے بھی فن ڈراما نگاری پر طبع آزمائی کی۔ انھوں نے تین ڈرامے لکھے۔ شب تار۔ کربلا اور روحانی شادی۔

بیسویں صدی میں تھیٹر کا زوال شروع ہو گیا۔ ادبی طبقوں کی توجہ فنونِ لطیفہ کی طرف پہنچ گئی۔ موسیقی' رقص و سرود کو ترقی دی جانے لگی۔ مگر جلد ہی دوسری عالمی جنگ رونما ہوئی جس سے پوری دنیا میں انقلاب آ گیا۔ ادب پر بھی اس کے اثرات پڑنا لازمی تھے۔ مغربی اثرات نے ہندوستانی ادیبوں کے ذہنی اور شعور بیدار کر دیے تھے۔

انھوں نے فرسودہ روایتوں کو توڑنے کی سعی کی اور جدید اسٹیج کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر نئے ڈرامے لکھے۔ حکیم احمد شجاع بھی جدید تقاضوں سے متاثر ہوئے۔ مگر ان کے ڈراموں پر آغا حشر کے طرز کی چھاپ ہے۔ امراؤ علی نے بھی پرانی روایتوں کو توڑنے میں مدد دی۔ لالہ کنور سین نے بھی جدید طرز ڈراموں سے متاثر ہو کر ایک ڈراما برہما نڈ لکھا جس میں ستاروں کی گردش کی داستان ہے۔ اس کے کردار آسمانی سیارے ہیں۔

اشتیاق حسین، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، فضل الرحمٰن، پروفیسر مجیب دور جدید کے نامور اور کامیاب ڈراما نگار ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین نے اردو ڈراموں کی گری ہوئی حالت دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ اردو میں اچھے ڈرامے لکھے جائیں۔ انھوں نے ابسن اور برنارڈ شا کے طرز کے ڈرامے لکھنے کی کوشش کی۔ ان کے ڈراموں میں گناہ کی دیوار اور نقش آخر مشہور ہیں۔ ادبی اعتبار سے اشتیاق حسین کے ڈرامے اہم ضرور ہیں مگر انھیں جدید طرز کا اسٹیج نہ مل سکا۔

محمد فضل الرحمٰن نے سماجی مسائل کو پیش نظر رکھ کر ڈرامے لکھے۔ بعض نقادوں کی نظر میں فضل الرحمٰن کے ڈرامے اسٹیج کی ضروریات کو پورا نہیں کرتے تھے یعنی تماشائیوں پر کوئی گہرا تاثر نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا ان کے ڈرامے زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے بھی فن ڈراما نگاری کو معیاری بنانے کی کوشش میں چند مختصر ڈرامے لکھے۔ جن میں پردۂ غفلت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں معاشرتی مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ پرانے زمیندار گھرانے کی حقیقی زندگی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔ عورتوں کا مزاج، ان کی تیزی، ان کے بات کرنے کا با محاورہ انداز اس میں نظر آتا ہے۔

فنی اعتبار سے پردۂ غفلت بہت کامیاب ڈراما ہے۔

امتیاز علی تاج اردو کے ماہر ڈراما نویس ہیں۔ انھوں نے پارسی کمپنیوں کے زمانۂ عروج میں کئی ڈرامے لکھے۔ انار کلی تاج کا فنی لحاظ سے بے مثال نیم تاریخی اور نیم رومانی ڈراما ہے۔ ڈرامے میں عشق و محبت کی دلچسپ تصویر پیش کر کے ڈرامے کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ تاج نے مغلیہ شان و شوکت اور شاہی زندگی کی عکاسی اس خوبصورت انداز سے کی ہے کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انار کلی میں خارجی اور داخلی دونوں اثرات ملتے ہیں۔ دل آرام، سلیم اور انار کلی تینوں کا ایک ٹکراؤ ہے۔ دل آرام سلیم پر دل و جان سے قربان ہے اور سلیم انار کلی پر فدا ہے۔ انار کلی بھی سلیم کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اس کی عزت کرتی ہے مگر اسے دل آرام سے کوئی بغض و حسد نہیں۔ دل آرام انار کلی کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی ہے لہٰذا اس کانٹے کو راستے سے نکال پھینکنے کے لیے مکر و فریب کی چالیں چلتی ہیں۔ محبت کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لیے جائز اور ناجائز حربوں کا استعمال کرتی ہے۔ دوسری طرف دل آرام، اکبر اور انار کلی ہیں۔ انار کلی کی وجہ سے محل میں دل آرام کی عزت اور وقار کم ہو گیا ہے۔ اکبر بھی انار کلی کے حسن کا گرفتار ہو گیا۔ دل آرام کا انار کلی سے حسد فطری رد عمل تھا۔ اِدھر اکبر، سلیم اور انار کلی میں تصادم ہے۔ اکبر سلیم کو بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف شہزادہ بنانا چاہتا ہے۔ وہ ایک ادنیٰ کنیز کے ساتھ سلیم کی محبت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود انار کلی کے حسن کا گرویدہ ہے۔ وہ بھی انار کلی کی توجہ اپنی طرف چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ انار کلی سے سلیم کی محبت کو پسند نہیں کرے گا۔

یہ تاج کے قلم کی خوبی ہی ہے کہ انھوں نے ان تینوں کی تثلیث کو دلچسپ پیرایۂ اظہار دے کر ڈراما تیار کیا۔

تاج انسانی نفسیات کے ماہر ہیں۔ انھوں نے کرداروں کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ان کی شخصیت نکھر گئی ہے۔ اکبر اور انار کلی کے کرداروں میں جو تصادم اور ٹکراؤ ہے وہی ڈرامے کا فنکارانہ خوبی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین انار کلی کو مسائلی ڈراما (PROBLEM PLAY) مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ——

"......... یہ ڈراما سلیم یا انار کلی کا المیہ نہیں بلکہ

اکبر کا ہے ۔ ایک باپ اور شہنشاہ کے درمیان کشمکش ہے ۔ جہان کے درمیان توازن برقرار رکھنے یا کوئی تیسرا راستہ نکالنے میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ یہ اس کی شکست ہے ' اس کا شاہانہ جلال انارکلی کو دیوار میں چنوا سکا لیکن بیٹے کے دل میں باپ کی حیثیت سے جگہ نہ بنا سکا ۔ آویزش کی یہی نوعیت اسے مثالی ڈراما بناتی ہے "۔

ڈرامے کا موضوع ایک کنیز کی شہزادے سے محبت ہے ۔ ایک طرف تو مغلیہ سلطنت کے ولی عہد سلیم کے سامنے ہندوستان کا تخت و تاج ہے دوسری طرف انارکلی کی محبت ۔ سلیم تخت و تاج سب کو ٹھکرا کر انسانی اتصال کا راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے ۔ سلیم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا اور اکبر انارکلی کو دیوار میں چنوا کر کامیاب ہو جاتا ہے ۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جب اچھی صلاحیت رکھنے والوں کو دبایا جاتا ہے ۔ ان کو ابھرنے اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے سے روکا جاتا ہے تو وہ ضرور سر اٹھاتے ہیں جس کا انجام عبرتناک ہوتا ہے ۔ یہی اس ڈرامے میں نظر آتا ہے ۔ دل آرام جو تمام خوبیوں کی مالک تھی ۔ جس کو دربار میں اونچا مقام حاصل تھا ۔ شاہی محل میں ہونے والے سبھی تنکشی رہی آرگنائز کرتی تھی ۔ اکبر نے اس کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا ۔ مگر اکبر کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی سلیم میں ہے تو اکبر ہی اس کو بلندی سے پستی کی طرف ڈھکیل دیتا ہے ۔ دل آرام کے لیے یہ ذلت قابل برداشت نہیں ۔ دل آرام ہی کیا دنیا کا کوئی انسان اس طرح کی ذلت برداشت نہیں کرے گا ۔ انارکلی جس کو دل آرام کی جگہ مقرر کیا گیا تھا وہ بھی بہت سی خوبیوں کی مالک تھی ۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اور فنکارانہ صلاحیتیں بھی اس میں موجود تھیں ۔ پھر محل میں منعقد ہونے والے تنکشی کے بارے میں دل آرام سے صلاح و مشورہ کرتی تھی ۔ غرض جب جب اچھی صلاحیتیں رکھنے والوں کو دبایا گیا ہنگامہ یقیناً برپا ہوا اور ہوتا رہے گا ۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ دل آرام کو اس کے منصب سے کیوں علاحدہ کیا گیا ۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اکبر کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی ۔ وہ دل آرام جس پر اکبر کی نظر عنایت تھی وہ سلیم کو چاہتی تھی ۔ سلیم کی توجہ اور مہر دیکھ کر اکبر کے دل میں رقابت کی چنگاریاں سلگنے لگیں ۔ رقابت کے بڑھتے شعلوں نے مجبور کیا ۔ دل آرام کو اس کے عہدے سے علیحدہ کرنے کے لیے اور پھر انارکلی کو اس منصب پر پہنچا دیا ۔۔۔ تو پھر وہی ہوا جو دل آرام کے ساتھ ۔ یعنی انارکلی کی سلیم سے محبت ۔ اکبر پھر اسی رقابت کی آگ میں سلگنے لگا ۔ محبت میں ہر طرف ناکامی کے بعد اس کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں ۔ تو وہ ہر اس حربہ کو استعمال کرتا ہے جس سے اس کو ذہنی سکون حاصل ہو ۔ لہٰذا انارکلی کو دیوار میں چنوانے کا حکم دے دیتا ہے ۔

انارکلی اپنے دور کا مقبول ترین ڈراما ہے ۔ امتیاز علی تاج کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ پھر بھی اس میں کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں ۔ تاج نے اسٹیج کی ضرورتوں پر خاص توجہ نہیں دی ۔ مکالمے اس حد تک طویل ہو گئے ہیں کہ ان کی طوالت گراں گزرتی ہے ۔ مناظر بھی بہت لمبے لمبے ہیں ۔ اس سے عمل کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے اور ناظرین دیکھتے دیکھتے بور ہونے لگتے ۔ ڈراما کی ساری خوبی ختم ہو جاتی ہے ۔ بہرکیف پوری طرح کامیاب نہ سہی اس حد تک تو کامیاب ہے کہ ناظرین پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے ۔ قصہ روایت پر مبنی ہونے کے باوجود بھی اس میں اتنی سچائی اور حقیقت نظر آتی ہے کہ دیکھنے والے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہی تاج کے قلم کا کمال ہے ۔

ڈراما کی تاریخ میں دوسرا اہم نام محمد مجیب کا ہے ۔ وہ فن ڈراما نگاری میں ایک نیا موڑ لاتے ہیں ۔ انھوں نے حقیقت نگاری کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے ڈراموں میں زندگی کی سچی تصویریں کھینچیں ۔ اصلاح اور تربیت کے سلسلے میں " حبہ خاتون ' خانہ جنگی ' انجام ' کھیتی ' دوسری شام " اردو کے اہم ڈرامے ہیں ۔ ان ڈراموں میں انھوں نے

اسٹیج کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ "انجام" کھیتی" اور "دوسری شام" سماجی ڈرامے کہے جاسکتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کے کسی نہ کسی رُخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان ڈراموں میں فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ "خانہ جنگی" حبہ خاتون اور آزمائش" تاریخی ڈرامے ہیں۔ خانہ جنگی ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا۔ اس میں نفاق کی برائیوں اور خانہ جنگی کی تباہیوں کا انجام دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے کا اصل موضوع دو فرقوں کے مختلف اقدار کی کشمکش ہے۔ ایک طرف دارا اور سرمد ہیں جو ہندو مسلم اتحاد، روشن خیالی اور بے تعصبی کی مثال ہیں۔ شیخ سرمد کی شخصیت روحانی پیشوا اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی اور اصول پرستی کا نمونہ ہے۔ دوسری طرف اورنگ زیب اور اس کے دربار کے علماء ہیں جن کے شرعی احکام سے تمام لوگ متاثر ہیں۔

خانہ جنگی میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ شاہجہاں جب ضعیف ہوگیا تو اس نے چاہا کہ اس کے بیٹے آپس میں جنگ نہ کریں۔ تینوں چھوٹے بیٹے مختلف صوبوں کے مختار ہوجائیں اور مرکزی حکومت یعنی دہلی کے تخت پر اس کا بڑا بیٹا دارا حکومت کرے۔ لیکن اورنگ زیب اس تقسیم کو ناقص قرار دیتا ہے اور دہلی کے تخت کے لیے اعلانِ جنگ کردیتا ہے۔ دارا میں اگرچہ کچھ عالمانہ خوبیاں ہیں اور روحانی طور پر وہ فراخ دل واقع ہوا ہے مگر اس میں سیاست داں کا تدبر اور حکمت عملی نہیں ہے۔ جب زندگی خانوں میں تقسیم ہوکر جُز میں کل کو دیکھنا چاہتی ہے تو آپس میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے کیوں کہ ہر شعبہ یہ سمجھتا ہے کہ باقی سب ناقص اور غلط راستہ ہیں۔

دارا جذباتی اور ایماندار آدمی ہے۔ ایماندار اور صاف گو جذباتی اور مصلحت سے بے نیاز لوگ اچھے عالم یا اچھے فن کار تو ہوسکتے ہیں لیکن کامیاب بادشاہ یا سیاسی لیڈر ہرگز نہیں ——— اگر سیاست میں کامیابی کے لیے جھوٹ، منافقت اور مصلحت ضروری ہے تو ہمیں یہ کہنے میں ہچکچانا نہیں چاہیے کہ آج تک حکومت اور سیاست غلط بنیادوں پر کامیاب ہوتی چلی آرہی ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ایمانداری کی وجہ سے ناکام ہوتے ہیں۔ ان کی ناکامی پر بھی ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ایک نہ ایک دن سیاست کو بھی انسانیت کے اعلیٰ معیار پر پورا اترنا پڑے گا۔

اس ڈرامے کی کامیابی اس کے اچھے پلاٹ، موضوع اور مکالموں کی وجہ سے ہے۔ اسٹیج کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے جنگ اور قتل کے مناظر کو سامنے پیش نہیں کیا گیا بلکہ کرداروں کے مکالموں سے ان کی خبر دی گئی ہے۔ بعض جگہ مکالموں میں بڑی ادبیت اور تہہ داری ہے۔ جس سے ڈرامے کی ادبی شان نکھر گئی ہے۔

عبدالماجد دریابادی بھی طرزِ قدیم سے بیزار تھے۔ وہ بھی فن ڈراما نگاری میں اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بھی قدیم روایت سے انحراف کرکے "زود پشیماں" ڈراما لکھا۔ حالاں کہ یہ ڈراما عوام میں مقبول نہ ہوسکا۔ مگر پڑھے لکھے اعلیٰ طبقے نے اس کو پسند کیا۔ مولانا شرر کا کہنا ہے ———

"....... یہ اُردو میں ایک نیا ڈراما ہے۔ جو ایک فلسفیانہ دماغ والے فاضل و قابل نوجوان کے قلم سے نکل کر اس پبلک کے سامنے پیش ہوتا ہے جس کا بہت ہی محدود حصہ اس مذاق سے آشنا ہے۔ اس کا پلاٹ "رومیو اینڈ جولیٹ" کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اگرچہ اس سے بالکل جدا ہے۔"

ان ڈراما نگاروں نے اُردو ڈرامے کو حقیقت پسند اسٹیج تک پہنچا دیا۔ اور ایسے مناظر پیش کیے کہ ناظرین کو حقیقت کا دھوکہ ہونے لگا۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اسٹیج پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے وہ بعض انسانوں کی زندگی کا حصہ ہے اس دور کے ڈراما نگاروں نے معاشرتی، اصلاحی اور سماجی مسائل کو مدنظر رکھا۔ اپٹا اور پرتھوی تھیٹر نے بھی اسٹیج کی اچھی روایتوں کو مضبوط کیا۔ اُردو ڈرامے اور اردو تھیٹر میں پرتھوی راج کپور کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

پرتھوی راج نے شمالی مغربی ہندوستان کی دیہاتی روایتوں کو سامنے رکھ کر "دیوار" اور "پٹھان" جیسے کامیاب ڈرامے لکھے۔ اور ملک کے ہر حصّہ میں انھیں اسٹیج کیا گیا۔ یہ دونوں ڈرامے فرقہ واریت کے خلاف ہیں۔ "دیوار" میں دو بھائیوں کی کہانی پیش کی ہے۔ "پٹھان" میں اس مشینی دور سے مقابلہ کر کے پرانے طرز کی زندگی کو بہتر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا اُردو میں بول بالا تھا۔ ادب اور فن کے رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے کچھ فن کاروں نے سیاسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ڈرامے لکھنے کی کوشش کی اور ان ادیبوں کی سعی انڈین پیپلس تھیٹر کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، سردار جعفری اور بعض دوسرے ادیبوں کی تخلیقات نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر ڈرامے لکھے۔ خواجہ احمد عباس کا "میں کون ہوں" عصمت چغتائی کا "دھانی بانکپن" سردار جعفری کا "یہ کس کا خون ہے" ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے ڈرامے ہیں۔

یہ ڈرامے حقیقت پسندی کا اچھا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ تھیٹر کو عوام سے قریب لے آئے۔ اس تحریک نے ان تھیٹروں کو جنم دیا جنھوں نے حبیب تنویر، ابراہیم القاضی اور شمع زیدی کی سرکردگی میں نئے نئے ڈھنگ کے ڈرامے عوام کے سامنے پیش کیے۔

کرشن چندر یوں تو افسانہ نگار اور ناول نگار رہیں۔ مگر انھوں نے اس میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے ایک ایکٹ کے ڈراموں کا مجموعہ "دروازہ" شائع ہو چکا ہے۔ کرشن چندر کے ڈراموں کا اصل موضوع سماج ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں سرمایہ داروں کی تنگ نظری اور نفع خوری جیسی برائیوں کو کھلے عام پیش کیا ہے۔ ان کے ڈراموں میں "سرائے کے باہر" "قاہرہ کی ایک شام" مشہور ڈرامے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے بھی کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیاں" شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈراموں میں زندگی کی کشمکش اور تصادم نظر آتا ہے۔ مکالموں میں روانی اور چستی ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے ان کے ڈرامے کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

قدسیہ زیدی کا نام بھی اُردو ڈرامہ نگاری میں خاصا اہم ہے۔ انھوں نے بعض ملکی اور غیر ملکی ڈراموں کو اُردو قالب میں ڈھال دیا ہے۔ "کھڑیا کھر۔ خالد کی خالہ۔ شکنتلا" ڈراموں کو انھوں نے اُردو میں پیش کیا ہے جو کافی مقبول ہوئے۔ ہندوستانی تھیٹر کے نام سے انھوں نے دہلی میں ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ جس میں حبیب تنویر کا عملی تعاون بھی حاصل تھا۔ اس تھیٹر میں تعلیم حاصل کر کے قدسیہ زیدی کی بیٹی شمع زیدی نے تھیٹر کی دنیا میں اپنا اہم مقام بنا لیا۔ شمع زیدی نے برخت کے مشہور ڈرامے کو "کھریا کی لکیر" کے نام سے پیش کر کے کافی شہرت حاصل کی۔

کرتار سنگھ دُگل نے بھی ایک ایکٹ کا ڈراما "دیا بجھ گیا" لکھ کر اُردو ڈراما کی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ اس ڈرامے میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات پیدا کیے گئے ہیں۔ دیوکی سرن شرما، صالحہ عابد حسین، اقبال مجید، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، عنایت اللہ، جاوید اقبال، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان لوگوں نے ریڈیو کے لیے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے بھی کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں "کروٹ، ماچس کی ڈبیا، اخوار، خودکشی، نیلی رگیں، تین موٹی عورتیں، قلوپطرہ کی موت" وغیرہ نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔

احمد ندیم قاسمی کے ڈراموں میں "دارا شکوہ، ساحل اور سمندر، مثنوی گلزارِ نسیم" وغیرہ فنی اعتبار سے کامیاب ڈرامے ہیں۔
راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں میں "خواجہ سرا اور نقل مکانی" بہترین ڈرامے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ شوکت تھانوی

حفیظ جاوید، اسلم ملک، محمد منشا یاد، لطیف الرحمٰن، اصغر بٹ، عمار صدیقی، ابو سعید قریشی، ممتاز مفتی، محمد حسین، مجتبیٰ حسین، قیوم نظر نے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔

اُردو ڈراما نگاری پر مجموعی طور پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان سوا سو سالوں میں اُردو ڈرامے نے بہت سی رکاوٹوں کے باوجود اچھی خاصی ترقی کی ہے۔ اُردو ڈراما نے اپنی ایک روایت بھی بنائی ہے۔ اور نئے نئے تجربے کر کے نئی سمتیں بھی تلاش کی ہیں۔ طلسماتی کہانیوں، قصوں کی فضا سے نکل کر حقیقت کی طرف بڑھ کر انسانی مسائل کو اپنایا — زندگی کے دکھ درد کی حقیقی ترجمانی کی گئی۔ اور مسائل کا حل بھی تلاش کیا گیا —

▲▲

ظہور نظر

پاکستان

شہر کے رستوں پہ بوٹے دشت سے لاکر لگا
راہ پر مجھ کو لگانا ہے تو بہکا کر لگا

کتنا برہم، کتنا سرکش، کس قدر باغی ہوں میں
اس کا اندازہ مجھے زنجیر پہنا کر لگا

دیکھنے ہوں مہ دشانِ شہر گرائے شہریار!
بابِ زنداں پر مری تصویر بنوا کر لگا

دہشتِ زنداں میں گونجی اِک عجب اُمید سی
سر کسی قیدی کا جب دیوار سے جاکر لگا

جب کے جنگل میں پتھر مار کر پتھر پہ اُٹھ!
آگ اس جنگل میں برگِ خوف سلگا کر لگا

سوز ہے کس راگ کا تیرے لہو میں موج زن
گنگنانے سے نہ کھل پائے گا، سُر گا کر لگا

کتنی پیاسی، کس قدر ویران ہے کشتِ حیات
اس کا اندازہ رلٰن کا ابر برسا کر لگا

شامِ تنہائی میں بزمِ رفتگاں کے درمیاں
کیا کہوں کیا آج اپنے آپ کو پاکر لگا

کتنے سادہ، کس قدر اچھے وہاں کے لوگ تھے
یہ پتہ مجھ کو فریبِ دوستی کھا کر لگا

جیسے وہ شب آخری شب ہو وصال و ہجر کی
صبح دم وہ یوں مرے سینے سے گھبرا کر لگا

کتنے سادہ، کس قدر اچھے وہاں کے لوگ تھے
یہ پتہ مجھ کو تمہارے شہر سے جاکر لگا

بھیڑ میں جیسے کوئی گھبرا کے ٹکرا جائے ہے
یوں نہ لگ سینے سے، مجھ کو ساتھ لپٹا کر لگا

منتظر قزاق تھے شب کے جزیرے میں نظر
جب سرِ ساحل سفینہ صبح کا آکر لگا

رئیسؔ مالیگانوی

بزمِ جمال، مومن پورہ۔ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

وہ کوچۂ قاتل کہ ستمگر سے نکالوں
جو چاٹ چکا خوں لبِ خنجر سے نکالوں

آئینے یہ آئینہ میں پتھر سے نکالوں
چہرے نئے اب ذہن کے پیکر سے نکالوں

ہاتھوں کی لکیروں میں تھی اِک آنکھ مچولی
ڈوبا ہے مقدر تو سمندر سے نکالوں

اِک عمر کا حاصل ہیں یہ جلتے ہوئے آنسو!
اے وقت! انہیں ٹوٹتی گاگر سے نکالوں

لائے گی مری شیشہ گری رنگ ابھی اور
تصویر تری ہر نئے پتھر سے نکالوں

پامال شگوفے جہاں مٹی میں مِلے ہیں
رس رنگ کے آسیب گُل تر سے نکالوں

جو سوختہ جاں توڑ کے بیٹھے ہیں اُمیدیں
اِس سخت سفر میں اُنہیں دزدر سے نکالوں

لہراتی ہوئی رات ستاروں میں سمٹ جائے
ایسے میں کوئی چاند میں کیوں گھر سے نکالوں

ٹھوکر کبھی دہلیز کے پتھر سے لگی تھی
اب جان بھی کیا میں اسی پتھر سے نکالوں

کاغذ پہ بکھر جائیں گے الفاظ و معانی
مضمون انوکھا نئے دفتر سے نکالوں

اِس بات پہ احباب رئیسؔ آج بضد ہیں
سرمایۂ افکار کو بھی گھر سے نکالوں

فضائے مہر و مروّت کے درمیاں ٹوٹی
اِس ایک عمر کی اُمید بھی کہاں ٹوٹی

بِکھر گئے کئی جذبے حرارتوں کے لئے
کہاں وہ سرد رُتوں کی کڑی کماں ٹوٹی

تراشتا رہا تا عمر لفظ کے پیکر
کہاں میں جاؤں گا لے کر یہ انگلیاں ٹوٹی

اِنہیں جلے ہوئے اوراق میں سما جاؤ
ہے دِل جلوں کی حکایت جہاں تہاں ٹوٹی

خلش کے ساتھ یہ اندیشۂ خلش کیسا؟
کہ ناخنوں کی کماں زیرِ آسماں ٹوٹی

یہ خامکار اداؤں کی برچھیاں ہی نہ تھیں
خود اپنی سوچ پہ ہی برقِ بے اماں ٹوٹی

تلاش کرتے رہے ہم انہیں مکانوں کو
جہاں پہنچ کے اُجالوں کی داستاں ٹوٹی

ہزار اونچے پہاڑوں کی برف پگھلی ہے
نشیب میں بھی مگر سقفِ آشیاں ٹوٹی

ترس رہی تھی نمو کے لئے جو ساری عمر
وہ ایک شاخِ شجر آج ناگہاں ٹوٹی

وہ میرا سایہ تھا جو میرے ساتھ ساتھ چلا
وہ حادثہ تھا کہ جب شرطِ امتحاں ٹوٹی

ہوائیں زور کہاں مارتیں رئیسؔ اتنا
نصیب ان کا کہ کل شاخِ آشیاں ٹوٹی

نوبہار صابر

مڑیہ آشرم ـ رگھو ماجرا پٹیالہ ـ ۱۴۷۰۰۱

پھول کب تک اپنے حسن و رنگ پر اترائے گا؟
شام ڈھلنے تک بکھر کر خاک میں مل جائے گا

شہر سے لب بستہ گذرے گا تو کیا ہاتھ آئے گا؟
تو صدا دے گا تو دروازہ کوئی کھل جائے گا

میں تو خوشبو ہوں مجھے کیا جادہ و منزل سے کام
کیا خبر جھونکا ہوا کا کس نگر لے جائے گا

کون ڈوبا؟ کون اترا پار؟ اس سے بے نیاز
وقت کا دریا تو اپنی رَو میں بہتا جائے گا

اب یہ تجھ پر ہے دُعا دے یا اسے دشنام دے
گنبدِ دوراں تو تیری ہی صدا لوٹائے گا

ایک ایسا سانحہ گذرا کہ سب کچھ لُٹ گیا
شہرِ دل کی رونقیں اب کون واپس لائے گا؟

آندھیوں کی زد میں صابر شعلۂ شمعِ حیات
دیکھیے کب تک فصیلِ وقت پر لہرائے گا

زرد رو، خشک، اکھڑتے پتے
پے بہ پے شاخ سے جھڑتے پتے

خود میں دم تھا نہ شجر پشت پناہ
کس کے بوتے پہ اکڑتے پتے

سامنا مل کے ہوا کا ہوا
رہے آپس ہی میں لڑتے پتے

اپنے ہی پیڑ کے سائے میں جلے
سوختہ جسم، سکڑتے پتے

سفرِ زیست کی تفسیرِ بلیغ
پھوٹتی کونپلیں، جھڑتے پتے

نئے انکر، نئے کلچر کے نقیب
نئی تہذیب اُجڑتے پتے

سوچ کر داؤں لگانا صابرؔ
ہر کسی کے نہیں پڑتے پتے

صلاح الدین نیّر

بازار ادب لال ۔ حیدرآباد ۲

جہاں دیوانہ اِک پل بھی رُکے گا
تمہیں بھی آخری آواز دے گا
بساطِ گل ہو یا دامانِ صحرا
جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا
ترے دامن کی شہرت بہت ہے
مرے اشکوں کی قیمت کون دے گا
دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں
چراغِ آرزو جلتا رہے گا
نشاطِ غم کی جس کو جستجو ہے
سکونِ دل ملے تو کیا کرے گا
اگر یادیں بھی ہم سے چھین لوگے
ہماری زندگی میں کیا رہے گا
اندھیرے گھر میں کون آئے گا نیّر
فریبِ روشنی جب تک رہے گا

نازک بہت ہے دوستو! سوچوں کی آرزو
رسوا نہ ہو نگاہ کا انداز گفتگو
آنسو کبھی کے ہو چکے نذرِ شبِ الم
اب چشمِ انتظار سے گرنے لگا لہو
آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں چہرہ اُداس ہے
اللہ رکھ لے آج شبِ غم کی آبرو
کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کچھ بھی نہ کہہ سکا
کیا بات ہے کہ لب نہ ہلے اُن کے روبرو
صبحِ طرب سے اور بھی محرومیاں بڑھیں
تا عمر کاش رہتی شبِ غم کی جستجو
یوں رندِ تشنہ کام نے دیکھا تری طرف
اُبھرے تری نظر میں کئی ساغر و سبو
نیّر سے غم شناس تو مل جائیں گے بہت
ایسا نہیں کوئی جو کرے چاکِ دل رفو

سلیم کوثر

پاکستان ٹیلی ویژن، کراچی سینٹر۔ پاکستان

بس اب کے اتنی تبدیلی ہوئی ہے
پرانے گھر میں تنہائی نئی ہے
پلٹ کر دیکھ لے تو ٹوٹ جائے
یہاں ہر شخص اتنا اجنبی ہے
وہ چہرہ ہٹ چکا ہے کب کا لیکن
دریچے میں ابھی تک روشنی ہے
بہت جاگا ہوں ان آنکھوں کے ہمراہ
مگر اب نیند آتی جا رہی ہے
سوادِ ہجر میں اک پل وہ آیا
پکار اٹھا تھا سناٹا کوئی ہے؟
فقط اپنے حوالے سے ہوں زندہ
مجھے کیا شئے وراثت میں ملی ہے
ہم ایسے گمرہانِ نیم شب کا
تری آواز پہرہ دے رہی ہے
وہی رستے ہیں زیرِ پا ابھی تک
سلیم اب تک وہی آوارگی ہے

اب گھر ہے نہ کوئی راستہ ہے
بس ایک چراغ جل رہا ہے
سب شہر کے لوگ سو رہے ہیں
اک میرا مکان جاگتا ہے
دیکھی جو کتابِ عمر اب کے
ایک اور ورق الٹ گیا ہے
ٹوٹے یہ حصارِ شب کہاں تو
خود سے ہی دیا الجھ پڑا ہے
اے رسمِ شکستہ پائی تو نے
دل کو بڑا حوصلہ دیا ہے
میں نے کوئی بات کب چھپائی
جو حرف تھا بول کر لکھا ہے
اترے گا نہ قرضِ آسماں کا
جب تک یہ زمیں زیرِ پا ہے
دیکھو تو ذرا سخی سمندر
دریا سے خراج مانگتا ہے
زندہ ہے ابھی سلیم کوثر
کس غم میں یہ شہر مر رہا ہے

اکبر حمیدی

دفتر مارکیٹ کمیٹی گوجرانوالہ (پاکستان)

یہ کرشمہ بھی خدایا دیکھوں
صبح وہ چاند سا مکھڑا دیکھوں
دُکھ اگر بانٹ نہیں سکتا ہوں
اے خدا دُکھ نہ کسی کا دیکھوں
جگمگاتے رہیں تیرے افلاک
کسی گھر میں نہ اندھیرا دیکھوں
دائم آباد ہوں تیرے فردوس
ہنستی بستی ہوئی دُنیا دیکھوں
حُسن واحسان کے موسم آئیں
امن و تہذیب کی برکھا دیکھوں
ہفت افلاک ہوں زیبِ دستار
پاؤں میں بامِ ثریّا دیکھوں
خون سے سینچ رہا ہوں جو کھیت
اب انہیں پھولتا پھلتا دیکھوں
غیر انسان کی مانگوں اکبر
کوئی اپنا نہ پرایا دیکھوں

سب رنگ تری چھب سے ہم آہنگ لگے ہیں
نکھرے ہیں وہ کیا کیا جو ترے انگ لگے ہیں
بھیگے ہوئے ساون کی دھنک اس کا بدن ہے
اس خاک کے پتلے کو عجب رنگ لگے ہیں
کس شہر کی تہذیب پہ مامور ہوا ہوں
ذہنوں سے زیادہ مجھے دِل تنگ لگے ہیں
یارب! انہیں تالیف کی توفیق بھی دینا
جن پھولوں سے ہاتھوں سے مجھے سنگ لگے ہیں
جس دور میں اظہار کے دربند ہوں اکبر
چہرے مجھے جذبات کے فرہنگ لگے ہیں

مدحت الاختر

نیا گودام - کامٹی (مہاراشٹر)

لوحِ روشن نہ ہوئی مرحلہ طے کیسے ہو
اب اسی کرب کے عالم میں رہو جیسے ہو
آنکھ ملتے ہوئے دیکھا تو عجوبہ نکلے
خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم ایسے ہو
سو سمندر بھی اب آنکھوں سے بہیں کیا حاصل
"جو شجر سوکھ گیا ہے وہ ہرا کیسے ہو"
دِل کی حالت تو چھپائے نہیں چھپتی لیکن
کم سے کم پوچھ لیا ہوتا کہ اب کیسے ہو
آج یوں اس سے خفا ہو کے چلا آیا ہوں
اپنے پیکر سے کوئی سایہ جدا جیسے ہو

افضل منہاس

اے - ۱۰۱۱ - بی بی شگفتہ کالونی
عقب اصغر مال روڈ - راولپنڈی، پاکستان

کرتا ہے جو بھی تو وہ جزا و سزا پہ چھوڑ
نیت جو نیک ہے تو نتیجہ خدا پہ چھوڑ
بے وجہ مجرموں میں نہ خود کو شمار کر
اپنے عمل پہ چھوڑ یہ اپنی خطا پہ چھوڑ
تیرا یہ کام ہے کہ کھلے بادبان رکھ
پھر اس کے بعد رُخ کا بدلنا ہوا پہ چھوڑ
اِک دِن یہ لہلہائے گی بنجر زمیں تری
رہ منتظر، یہ مسئلہ سارا گھٹا پہ چھوڑ
رسوائیوں کے تیر تو رستے میں رہ گئے
میں ہوں بہت بلند، انہیں انتہا پہ چھوڑ
مجھ سا کشادہ ظرف کوئی ہے تو ڈھونڈ لا
تجھ سے نہ ہو سکے تو یہ بادِ صبا پہ چھوڑ
افضل یہ زندگی کے تقاضے عجیب ہیں
مشکل ہے فیصلہ، اسے اپنی انا پہ چھوڑ

شاہین بدر

۱۰-کنائی سل اسٹریٹ - کلکتہ - ۷۰۰۰۲۳

یادِ دل کو ، آنکھ کو سیال جوہر دے گیا
میرا ماضی میرے صحرا کو سمندر دے گیا
آپ کہر آلود موسم کے نمائندہ نے
میری سوچوں کا لہو تابندہ گوہر دے گیا
چیختے لمحوں کا موسم کس قدر فیاض تھا
دِل کی بستی کو اُجڑنے کا مقدر دے گیا
بھولی بسری یاد کا خورشید بھی صبحِ نجات
عکسِ شبنم آئینے کی پتیوں پر دے گیا
تمتما اُٹھا چتا کی آگ سے رخسارِ شام
بوڑھے سورج کا جنازہ خوب منظر دے گیا
جاتے جاتے موسمِ تیرہ شبی شاہین بدر
اوس کے قطروں کو تابندہ مقدر دے گیا

دوپہر کی زرد قاشوں کا مزہ لیتے چلیں
دھوپ کی اس رُت کا ہم بھی ذائقہ لیتے چلیں
سانس کے کانٹوں میں اُلجھا ہے یہ قلبِ ناتواں
زندگی! تجھ سے عقیدت کا صِلہ لیتے چلیں
جم چکی ہے یاد کے پھولوں پہ تنہائی کی راکھ
گمشدہ لمحوں کا اپنے جائزہ لیتے چلیں
تشنہ سورج پی گیا ہے سبزہ زاروں کا لہو
خشک پتوں ہی کا اب کے قہقہہ لیتے چلیں
زیست کی خوش رنگ تتلی ہے پریشاں بے طرح
اپنی بربادی کا ہم بھی سانحہ لیتے چلیں
دوستوں کی سوچ کا انداز ہے بدلا ہوا
غم زدہ دِل کا شکستہ آئینہ لیتے چلیں
ربطِ باہم کی جھلک مل جائے گی شاہین بدر
آئینہ خانے سے عکسِ گمشدہ لیتے چلیں

رزاق انورؔ

بستانِ اسٹورس - پانچ قندیل دھولیہ (مہاراشٹر)

غرورِ شاہ کار تھا فنِ آذر میں کھو گیا
انساں توہمات کے چکر میں کھو گیا
جو بے بصر تھا باغ کے منظر میں کھو گیا
ہر دیدہ ور مآلِ گلِ تر میں کھو گیا
جو اپنی رَو میں بہتے ہیں محتاجِ ظرف ہیں
دریاؤں کا خروش سمندر میں کھو گیا
اس کا مزاج، اس کی خوشی، اس کا غم نہ پوچھ
جس کا سکونِ قلب بھرے گھر میں کھو گیا
اُترا نہیں خمارِ ستم ہائے روزگار
کہنے کو اپنا غم مے و ساغر میں کھو گیا
کیا گذری ہم پہ انجمنِ ناز میں نہ پوچھ
برسوں کا اعتماد گھڑی بھر میں کھو گیا
انورؔ سنا ہر اک نے مرا نغمۂ غزل
ذوقِ سلیم معنیٔ مضمر میں کھو گیا

دن رات نیا رنگ بدلتا ہے زمانہ
شاید ترے انداز میں ڈھلتا ہے زمانہ
یہ کون پسِ پردہ اقدامِ طلب ہے
یہ کس کے اشارات پہ چلتا ہے زمانہ
ہے وقت کا فرمان اٹل روزِ ازل سے
ٹالے سے کسی کے کہیں ٹلتا ہے زمانہ
رکھ ہوش بجا منزلِ ہستی کے مسافر
ہر موڑ پہ رُخ اپنا بدلتا ہے زمانہ
ہر دور میں دیکھا ہے کہ انساں کے لہو سے
غازہ رُخِ تاریخ پہ ملتا ہے زمانہ
جو وقت کی رفتار پہ رکھتے ہیں نگاہیں
ہمراہ انہیں لوگوں کے چلتا ہے زمانہ
انورؔ یہی قانون ہے قدرت کا ازل سے
انسانوں کے کردار میں ڈھلتا ہے زمانہ

حصیر نوری

جوائنٹ کوارٹر، محمد پور۔ ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

اپنی خوشی کو غم کے اندھیروں میں چھوڑ دو
تر ہیں شرابِ تلخ سے دامن نچوڑ دو

دِل کا غبار آنکھوں سے باہر نکل پڑے
سنگِ خودی سے حرص کے شیشوں کو پھوڑ دو

تم سے یہ والہانہ عقیدت ہے کیا کروں
شفقت سے خفتہ بخت کو میرے جھنجھوڑ دو

جل جاؤں میں تو زندگی نکھرے گی دوستو
بھڑکا ہوا ہے شعلۂ احساس چھوڑ دو

میں اس کی واپسی کا نہیں منتظر ابھی
تم جس طرف بھی چاہو مِرا ذہن موڑ دو

دیکھو تمہارے ہاتھ ہے فتح و شکست ابھی
ایسا نہ ہو کہ باہمی قوت کو توڑ دو

احسان ہم نہ بھولیں تمہارا کبھی حصیرؔ
ٹوٹے ہوئے جو رشتے دِلوں کے ہیں جوڑ دو

انوار رضوی

کیا جانے کب آئی تھی کیا لے گئی ہوا
بے نام راستوں کا پتہ دے گئی ہوا

حتیٰ کہ برگِ خشک بنا شاخ سے گرا
آ کے روز خواب میں گرجے گئی ہوا

میں اور توقعات کے جنگل کی سختیاں
موقع مِلا تو صاف دغا دے گئی ہوا

اپنے سے کب فراغ ملے ہے کہ دیں خبر
کِن کِن کے در پہ سر کو پٹکنے گئی ہوا

میں ایک گریزاں لکۂ ابرِ آسمان تھا
پاتال پستیوں کی سزا دے گئی ہوا

مجھ کو کبھی کسی سے شکایت نہ تھی مگر
انوارؔ دِل کا چین اُڑا لے گئی ہوا

نورمحمد یاسؔ

۱۴ رمٹیا محل لین۔ بھوپال ۲ (ایم پی)

جب زمیں کا جسم خوں میں بھر گیا
دھیان اپنا آسمانوں پر گیا
دی اُصولوں کو اُسی نے زندگی
خواہشوں کا خون جو لے کر گیا
گھاؤ خاموشی کا گہرا کیوں نہ ہو
دور تک آواز کا پتھر گیا
تھا جہاں مجھ کو اندھیرے کا یقیں
روشنی پائی وہاں تو ڈر گیا
بن گئی قاتل انانیت مری
صرف اسی احساس سے میں مر گیا
جب شررِ ٹوٹا تخیّل کا مرے
غم کے خدوخال روشن کر گیا
گھٹ گئیں مجھ میں تمنائیں مری
قتل کا الزام کس کے سر گیا؟
تھی حریفوں کی وہ بزمِ فکر یاسؔ
بن بُلایا میں جہاں اکثر گیا

مجید ساقیؔ

ہبلی (کرناٹک)

آنکھوں میں کوئی اور نیا خواب بساؤ
حالات کی تلخی کو ذرا بھول بھی جاؤ
سینے میں خموشی کے اُتارو کوئی خنجر
احساس کے ہونٹوں پہ کوئی گیت سجاؤ
سورج کی تمنا میں رکو گے یونہی کب تک
تاریک ہیں راہیں تو کوئی زخم جلاؤ
بدنامی کے شعلے کہیں تم کو نہ جلادیں
چھوڑو مجھے تنہا مرے نزدیک نہ آؤ
ہر دِل میں جو بس جائے تمناؤں کی مانند
اِک ایسا سلگتا ہوا نغمہ بھی سناؤ
تازہ ہے ہر زخم جو پھولوں سے ملا ہے
یارو مری جانب نہ کوئی پھول بڑھاؤ
ساقیؔ جنہیں انجامِ محبّت نہ ہو معلوم
اُجڑے ہوئے گلشن کی انہیں راہ دکھاؤ

دھند ریت

رشید امجد
اے ۱۸۵ ۔ تانک پورہ ۔ راولپنڈی ۔ (پاکستان)

ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پر مڑی تو اُسے برسوں پہلے کی وہ رات یاد آگئی،
جب وہ ایئرپورٹ آیا تھا ۔
باہر جانے کے تجسس کے ساتھ ساتھ شہر چھوڑنے کا دکھ بھی اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔
وہ شہر سے بہت پیار کرتا تھا ۔
لیکن اس کی خالی جیبیں اور ضرورتوں کے بھیانک عفریت اسے دھکیل کر ایئرپورٹ لے آئے،
جہاز میں بیٹھنے تک وہ مڑ مڑ کر دور دھند لکے میں گم شہر کو دیکھتا رہا، سیڑھیوں چڑھتے اسے محسوس ہوا جیسے شہر کی سیمیں کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہے ۔ وہ سیڑھیوں کے درمیان رُک گیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگا ۔
شہر کی سرمئی کلائی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی، شہر کی کچی سوندھی خوشبو دور دور ہوتی گئی ۔
اُس کا دل بیٹھ گیا ۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُمڈتے آنسوؤں کو اندر ہی اندر چوسنے لگا ۔
ٹیکسی لمبی سڑک پر بھاگی چلی جا رہی تھی ۔ راستے کی ملی جلی روشنیاں آنکھیں مارتیں اُسے گدگدا رہی تھیں ۔
وہ برسوں بعد واپس آیا تھا ۔
یہ طویل برس اُس نے مشقتوں کے پہاڑ چڑھتے گزارے تھے ۔ نئے شہر کی رنگ برنگی روشنیوں میں اُسے کئی بار اپنا شہر یاد آیا، پھر دھیرے دھیرے وہ آس پاس کے شور کا عادی ہوتا گیا۔
ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ سڑک کے کنارے بھاگتے کھمبوں کی روشنی دھندلاہٹوں میں تیر رہی تھی ۔ ان طویل برسوں میں اپنے شہر سے اس کا رابطہ دوستوں، عزیزوں کے خطوں یا اخباروں کے تبصروں اور خبروں تک محدود رہا تھا۔
ٹیکسی کے شیشوں سے سڑک کی ڈھلوانوں پر اُگے گھنے درختوں کو دیکھ کر

اُسے مٹیالی دیواروں والا ہوٹل یاد آگیا۔ ہر شام وہ اس ہوٹل میں جمع ہوتے ادھڑے چہرے والی میز کے گرد بیٹھ کر اپنی اپنی جھنجھلاہٹیں کم کرتے اور تھکے قدموں گھر لوٹ جاتے۔

"وہ مٹیالے نام والا ہوٹل تو دور نہیں ہے نا؟"

ڈرائیور نے مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا — "کونسا ہوٹل"

"وہ" — وہ چپ ہو گیا — "کچھ نہیں"

ڈرائیور نے مشکوک کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ٹیکسی پل سے گزر رہی تھی۔

وہ اس ٹوٹے پل سے کئی بار گزر رہا تھا۔ اس رات بھی جب وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا ٹیکسی پل کی ناہموار سطح سے اُچھل اُچھل پڑی تھی۔

وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ٹیکسی اُچھل کر ندی میں نہ جا گرے۔

وہ سنبھل گیا۔

ٹیکسی خاموشی سے گزر گئی۔

"تو پل بن گیا ہے"

"کیا —؟"

"کچھ نہیں — کچھ نہیں"

ڈرائیور نے شانے جھٹکے اور چپ چاپ ونڈ اسکرین میں دیکھنے لگا۔

ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پہ دوڑی جا رہی تھی۔

"سڑک اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہے" اُس نے اپنے آپ سے پوچھا اور مشکوک نظروں سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"یہ مجھے کہیں اور تو نہیں لے جا رہا ہے"۔

راستہ سنسان اور طویل۔

شہر کتنی دور ہے؟

دھندلاتی روشنیاں گہری تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور سڑک کے آس پاس کا منظر پہچان کھو رہا تھا۔

دھندلا — دھندلا ہوا جا رہا تھا۔

ٹیکسی اندھیرے میں رُک گئی۔

"کیا ہوا؟" — اس نے جلدی سے پوچھا۔

"شہر آگیا"

"شہر — کہاں؟"

ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، دیکھتا رہا پھر بولا — "یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے؟"

اُس نے شیشوں سے باہر جھانکا۔

دھند — دھند، دھند

ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

اُس نے سوچا اُترنے سے انکار کر دے۔ ڈرائیور شاید اس ویرانے میں اُسے لوٹنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ لیکن پھر سوچا اندر بیٹھنے سے بھی کیا۔

وہ بھی باہر آگیا۔

"کہاں ہے شہر؟"

"یہ اور کہاں؟"

"کہاں"

ڈرائیور ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا —

"تم پاگل تو نہیں"

"پاگل — پاگل تو تم ہو"

"بابا میری جان چھوڑو — چودہ روپے بنے ہیں"

"لیکن شہر"

"کونسا شہر — یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے"

"کہ — کہاں"

"یہ بازار، دکانیں — اور روشنیاں"

"کہاں"

"بھائی مجھے چودہ روپے دو اور میری جان چھوڑو"

"لیکن شہر"

"شہر، شہر ـــــ شہر، یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے"

"کہاں ؟ ـــــ وہ چیخا، ـــــ "مجھے پاگل سمجھا ہے، کہاں ہے شہر"

"جہنم میں" ـــــ ڈرائیور غصّے سے بولا ـــــ "چودہ روپے دو"

"پہلے مجھے شہر لے چلو"

ڈرائیور دو تین لمحے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر گھوم کر اس کے سامنے آگیا، اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"کیا کر رہے ہو؟" وہ غصّے سے بولا۔

"دیکھ رہا ہوں تم اندھے تو نہیں"

"اندھا میں ـــــ اندھے تم ہو" وہ دو قدم آگے بڑھ گیا۔

ڈرائیور کی نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کے آگے بڑھنے سے وہ ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تو اس کی نظریں اس کے پاؤں پر پڑیں، وہ چونک پڑا۔

دو تین لمحے سکوت، پھر وہ بولا ـــــ "تم زمین پر تو کھڑے ہی نہیں تمھیں شہر کیسے دکھائی دے"۔

"کیا ـــــ ؟" اس نے بوکھلا کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔

"اگر میں زمین پر نہیں کھڑا ہوں تو کیا ہوا میں ہوں ؟"

"اور کیا"

"کیا بکواس کرتے ہو، مجھے شہر لے چلو"

ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑ لیا، اور زمین کی طرف دباتے ہوئے بولا ـــــ "ابھی تمھیں شہر نظر آتا ہے"

"یہ کیا کر رہے ہو ـــــ نیچے گرا کر میرا بٹوہ نکالنا چاہتے ہو"

اگلے لمحے وہ ڈرائیور سے گتھم گتھا ہوگیا۔

جب ایئر کریاؤنڈ میں داخل ہوا تو دوسری ٹیکسیاں سواریاں لے کر نکل رہی تھیں۔ جہاز آئے دیر ہو چکی تھی۔

بے دلی سے سگریٹ سلگا کر وہ مرجھائی نظروں سے بڑے گیٹ کو دیکھنے لگا۔ گیٹ سنسانی کی سیٹیاں بجا رہا تھا۔

اس کا جی چاہا کبھی وہ اس گیٹ سے نکلے ہاتھوں میں چمڑے کے سوٹ کیس، چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس۔

وہ رعب سے آواز دے ـــــ "ٹیکسی"

"جی صاحب"

گاڑی شہر جانے والی لمبی سڑک پر رواں ہوئی تو اس نے کن انکھیوں سے سواری کا جائزہ لیا۔

پشت سے ٹیک لگائے یہ شخص تیزی سے دوڑتے منظروں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے سوچا، یہ لوگ ضرورتوں کی منہ زور چڑیلوں سے بھاگ کر شہر چھوڑ جاتے ہیں، باہر جا کر محنت کی چکیوں میں پستے رہیں۔ اور پھر جب واپس آتے ہیں تو اُن کے بٹوے پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

"بزدل"

"کیا"

"کچھ نہیں" ـــــ وہ سنبھل گیا۔

ایک گہری چپ ـ

اس جہاز سے آنے والی سواریاں عموماً منہ مانگا کرایہ دیا کرتی ہیں۔ اسی لیے وہ اس وقت ایئر پورٹ آجاتا ہے اور دن بھر کی چخ چخ ایک ہی پھیرے میں دور ہو جاتی ہے۔ لیکن آج ـــــ

یہ شخص

ڈگی میں چمڑے کے سوٹ کیس

چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس۔

ایک دن وہ بھی ان سوٹ کیسوں کے ساتھ آئے گا۔

ابھی تو وہ ٹیکسی چلا رہا ہے — بی اے کرنے بعد بھی ٹیکسی۔
دفتروں کی خاک چھان چھان کر، ٹکا سا جواب سن سن کر، آخر یہ ٹیکسی
خواب، خواب — خواب
سوٹ کیس
چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس۔
آج کام پھیکا ہے۔

"کوئی بات نہیں" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "میں جھگڑا نہیں کروں گا"

ٹیکسی شہر کی حدود میں داخل ہو گئی۔
اُس نے کن انکھیوں سے جائزہ لیا — "یہ شخص ٹھیک نہیں پر میں کرائے کا جھگڑا نہیں کروں گا۔"

ٹیکسی شہر کے بیچوں بیچ آ گئی۔
ایک گہری اُداسی، غم آلود چپ
اس نے فٹ پاتھ کے ساتھ ٹیکسی روک دی۔
پھر بھی ایک اُداسی، غم ناک، بھیگی بھیگی ٹھنڈی چپ۔

"شہر آ گیا۔"

"شہر — کہاں"

"کیا کہاں — ؟"

"شہر"

"شہر — یہ شہر ہی تو ہے" وہ نیچے اُترتے ہوئے بولا۔
پیچھے بیٹھا وہ، چند لمحے سوچتا رہا، پھر وہ بھی نیچے اُتر آیا —

"کہاں ہے شہر ؟"

"یہ، اور کہاں ؟"

"کیا یہ شخص کرایہ نہ دینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے" اُس نے جھک کر شہر دیکھا۔

"یہ بازار، دکانیں، روشنیاں۔"

اُسے یقین ہو گیا کہ کرایہ وصول نہیں ہو گا۔ آخری کوشش کے طور پر اُس نے پھر کرایہ کا مطالبہ کیا تو اس نے جواباً وہی رٹ لگائی۔ "مجھے شہر لے چلو"

وہ گھور کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور غور سے اسی کا جائزہ لینے لگا۔

یہ کیا، یہ شخص تو زمین پر کھڑا ہی نہیں۔
تو کیا اسی لیے اسے شہر نظر نہیں آتا۔
اسے تو آگ ہی لگ گئی، غصّہ سے بولا — "تم زمین پر تو کھڑے ہی نہیں، تمھیں شہر کس طرح نظر آئے"

"کیا — کیا" وہ بوکھلا گیا — "میں زمین پر نہیں کھڑا تو کیا ہوا میں کھڑا ہوں۔"

"ہاں، ہوا ہی میں کھڑے ہو" — وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا — بالکل ہوا میں کھڑے ہو۔"
دوسرے شخص نے ایک لمحہ تک سٹپٹاہٹ کے بھنور میں غوطہ کھایا پھر سنبھل کر غصّہ سے بولا — "بکواس کرتے ہو، مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔"

"کیا — کیا۔"
اگلے لمحے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

(۳)

اندر داخل ہوا تو اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی آئی —

"ابّو! میری ٹافیاں؟"

وہ جیب سے دو ٹافیاں نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔

"ابّو! بس؟"

"ہاں بیٹے بس!"

اس کی بیٹی دونوں ٹافیاں ایک ساتھ منہ میں ڈال کر ننھے ننھے ہاتھ پھیلاتی ہے — "ابّو" اور —"

وہ بے بسی سے بیٹی کے پھیلے ہاتھوں کو دیکھتا ہے — "میں جب باہر جاؤں گا نا تو اپنی بیٹی کے لیے ڈھیر ساری ولایتی ٹافیاں لاؤں گا — ہے نا!"

پھر جیب سے دن بھر کی ریزگاری نکال کر بیوی کے پھیلے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے، دھیمے سست لہجہ میں کہتا ہے — "آج ایرپورٹ سے خالی ہی آنا پڑا"

بیوی پیسے گننے لگتی ہے۔

وہ اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔

"کیا بات ہے؟" بیوی سر اٹھا کر تشویش سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔

وہ ہچکچاتا ہے، پھر رکتے رکتے کہتا ہے — "میں زمین پر ہی کھڑا ہوں نا؟"

"کیا مطلب؟" بیوی حیرت سے کہتی ہے۔

"کچھ نہیں — کچھ نہیں" وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

▲▲

ایگزھاسٹ فین

عشرت ظہیر
بنیا پرکھر گیا' (بہار)

صبح سویرے ریاض کمرہ میں داخل ہوتا تو اُسے کمرہ کے چاروں طرف فرش پر اپیا کے کپڑے بکھرے دکھلائی دیتے ـــــ ساری ـــــ بلاؤز ـــــ پیٹی کوٹ ـــــ ایک دوسرے میں گڈمڈ ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ـــــ پھر وہی عجیب سا کچھ مانوس اور کچھ غیر مانوس سی بو کا احساس! اور سامنے لمبی چوڑی مسہری پر پڑی ہوئی گہری سانسیں لیتی ہوئی اپیا ـــــ بالکل عریاں حالت میں! وہ سرتاپا برہنہ بے فکری کی ایسی نیند سوئی ہوتی کہ ریاض کو اس سے شدید نفرت کے باوجود پیار آجاتا ـــ کچھ پیار اور کچھ ہمدردی ـــــ دراصل بناؤ سنگھار جب عورت کا ایک معمول بن جائے جو میکینکل عمل ہو تو جسم کے لیے ایک بوجھ بن جاتا ہے' لہٰذا اپیا اس معین وقت سے چھٹکارا پاتی تو اسے تمام کپڑے اور آرائش کو اتار پھینکنے میں بڑی راحت محسوس ہوتی۔ اسی راحت آمیز نیند میں کھوئی اپیا کو دیکھ کر ریاض اپنے دل سے اس کے تئیں اپنی ساری نفرت کو کھرچ کھرچ کر نکال پھینکتا ـــــ وہ چھت سے لٹکے فین کو دیکھتا جس کے تینوں پنکھ اس کے اپنے ماضی' حال اور مستقبل کی طرح چکراتے رہتے ـــــ وہ جھپٹ کر فین کو بند کرتا' ایسا لگتا ایک ساعت کی بھی تاخیر ہوئی تو پوری بلڈنگ جھٹکے سے اُڑ جائے گی' اس کی اپیا بھی اور وہ بھی ـــــ! اُسے لگتا یہ فین ماضی' حال اور مستقبل کو اسی طرح باندھے چکراتا رہتا ہے کہ وہ اور اس کی اپیا اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر پاتے ہیں ـــــ

پنکھا بند کرنے کے بعد وہ ایک چادر اپیا کے عریاں جسم پر ڈال دیتا۔ کبھی کبھی اپیا کے جسم کے کسی عضو سے اس کا ہاتھ مس ہو جاتا یا کسی عضو پر ایک ساعت کے لیے نگاہ ٹھہر جاتی تو وہ اپنی آنکھیں اتنی زور سے میچ لیتا تو آنکھوں کے کونوں میں کیچ سی ابھر آتی اور پھر دل کے کسی گوشے سے اس کے لیے بے پناہ نفرت اُبھر آتی ـــــ اُس لمحہ وہ سوچتا' اپیا کی گردن دبا دوں؟ کئی بار اس کے ہاتھ اس کی گردن تک گئے بھی' لیکن وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا ـــــ ہاتھ اس کی گردن تک جاتے' نگاہ اس کی گردن پر رک سی جاتی' اور پھر اُسے اپیا کا چہرہ نظر آتا۔ بے حد معصوم چہرہ ـــــ!

وہ سوچتا اپیاؔ حوّا کی طرح اپنے جذبات کی دست درازی سے بے خبر ہے ۔ وہ شجرِ ممنوعہ کے پاس جاتے ہوئے بھی معصوم تھی، اُس سے پھل توڑتے ہوئے بھی معصوم تھی، اُس پھل کو کھا کر بھی معصوم تھی ۔ وہ اس وقت بھی معصوم تھی جب اپنے جرم کی پاداش میں دھرتی پر پھینکی گئی تھی —— وہی ازلی معصومیت اپیاؔ کی شخصیت کا سب سے بیش قیمت حصّہ ہے —— پھر اس کے دِل سے اپیاؔ کے لیے نفرت کی ساری لہریں معدوم ہو جاتیں، لیکن یہ بالکل وقتی اور فانی ہوتا —— پھر وہی نفرت کی زیریں لہریں اُبھر آتیں ۔!

وہ اپیاؔ سے محبّت کرتا تھا ۔

وہ اپیاؔ سے نفرت کرتا تھا ۔

وہ اپنی محبّت اور نفرت کی تمیز نہیں کر پاتا ۔ اُسے نہ اس کا موقع تھا نہ اس کی ضرورت!

وہ نفرت محسوس کرتا تو روتا ہی تھا، لیکن جب محبت کی لپٹیں اُٹھتیں تو بھی رو پڑتا ——!

یہ نفرت کی لہریں، یہ محبت کی لپٹیں اس کے کردار کی اجزائے ترکیبی تھیں اور اس کے وجود کو اس طرح جکڑے تھیں کہ ہر صبح وہ ماضی، حال، اور مستقبل کو باندھے چکراتے پنکھے کو بند کرنے پر مجبور تھا، اپیاؔ کے برہنہ جسم کو انجانے میں دیکھنے اور اس پر چادر ڈالنے پر مجبور تھا، وہ اس کے بکھرے کپڑوں کو سمیٹنے پر مجبور تھا —— وہ مجبور تھا کہ وہ اسے کمرے میں محصور ہو کر پنکھا چالو کرنے سے نہیں روک سکتا ۔ وہ کپڑے اتارنے اور پہننے سے بھی نہیں روک سکتا —— وہ بالکل مجبور تھا ——

صبح میں کمرے کی گندگی اور آلائشوں کو جب وہ صاف کر رہا ہوتا تو اسے لگتا جیسے وہ ایک ہی رفتار سے چلنے والا ایگزاسٹ فین ہے، جس کا کام محض کمرے کی غلیظ اور گندی ہواؤں کو منتشر کرنا ہے —— صفائی میں چند گھنٹے صرف ہوتے، بس! لیکن ان چند گھنٹوں میں وہ محبت اور نفرت کی کیفیتوں کے گھیرے میں آتا اور نکلتا، اپیاؔ کی لمبی لمبی سانسوں اور سینے کے زیر و بم سے نفرت محسوس ہوتی —— پھر وہی گردن دبا دینے کی گھٹی گھٹی خواہش! اور یہ سب گویا صدیوں سے ہو رہا ہے ——!

اپیاؔ دراصل اپیا ہی نہیں منور بانو بھی تھی ۔ منوّر بانو کے روپ میں وہ ایک کامیاب طوائف تھی ۔ دھندے کی ETIQUETTE کا خیال کر کے وہ بناؤ سنگھار کرتی، پھر جیسے ہی اس میکینکل عمل سے گذر جاتی، سکون اور راحت کی کھوج میں بالکل ننگی ہو جاتی، پھر اسی حالت میں گہری نیند سو جاتی ۔ اس کی راحت اور سکون کا یہ طریقہ ریاض کے لیے سوہانِ روح تھا ۔ یہ مسلسل اذیت ریاض کی روح میں اتر چکی تھی اور شاید اس کا مقدّر بن گئی تھی ——!

کمرہ کی صفائی کے بعد ریاض کو بازار جانا پڑتا —— پان اور اس کے لوازمات، شراب کی بوتلیں اور کئی دوسری چیزیں —— تاکہ دوسرے دن پھر کمرہ اسی قابل ہو جائے کہ ریاضؔ صفائی کر سکے ۔

اور پھر بازار .... اور پھر گندگی ...... اور پھر...

اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے، یونہی چلتا رہے گا ....

اس کا کوئی انت نہیں .... چھت سے لٹکے پنکھے کا چکرانا تو وہ روک بھی دیتا ہے ۔ کبھی لائٹ فیل ہونے پر خود ہی لڑکھڑا کر یہ چکر تھم جاتا ۔ لیکن اس کی زندگی کا یہ چکر —— ؟ اس کا نہ کوئی انتم سرا ہے نہ منزل —— ؟ لیکن وہ اس کھوئی ہوئی منزل یا انتم سرا کی تلاش میں ہر لمحہ اور ہر پل لگا رہتا ۔ اکثر فرصت کے اوقات میں شہر کے غیر آباد علاقہ کی طرف نکل جاتا ۔ ریلوے کراسنگ کے پاس ایک بہت بڑے نالہ پر بنے ہوئے پل پر بیٹھ کر گھنٹوں اپنے شب و روز کے بارے میں سوچتا رہتا —— شام گہراتی .... لیکن وہ سوچتا رہتا .... اپنی اداس اور تھکی تھکی سی زندگی کے پہلوؤں [illegible] ... پھر جب رات کی سیاہ چادر پھیل جاتی اور گہری ہونے لگتی تو وہ واپس لوٹتا .... [illegible]

سڑکوں اور بازاروں کو روشنیوں سے منور دیکھتا .... آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے قمقموں کو دیکھتا اور دیکھ کر اپنی زندگی کی آنکھ مچولی کھیلتی ساعتوں کو یاد کرتا ——! روشن سڑکیں، منور دکانیں اور بازاروں کا حسن دیکھ کر وہ اور بھی اداس ہو جاتا۔ آس پاس سے آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھ کر سہم جاتا۔ وہ ان سے نہ آنکھیں چار کرتا نہ ان کے سراپے کو دیکھتا۔ کیوں کہ ایسا اس کے ساتھ ہوا کرتا کہ جب وہ کسی عورت یا لڑکی کو دیکھتا تو اُسے کوئی دیوار حائل نظر نہیں آتی۔ وہ انھیں بالکل عریاں دیکھتا —— ان کے ایک ایک خط، زاویوں اور گولائیوں کو وہ اس طرح عریاں پاتا جیسے وہ ٹرانسپیرنٹ ملبوسات میں کھڑی ہوں، پھر بھی وہ جذبات سے بے حس اور عاری تھا۔

واپس آ کر اسے سکون کہاں ملتا؟

شراب کی بو میں گھرا ہوا بوجھل ماحول، لوگوں کے قہقہے اور اوچھی باتیں —— ساری رات لوگوں کا تانتا بندھا رہتا —— پھر ماضی، حال اور مستقبل کو اپنے تینوں پنکھوں میں سمیٹے چکراتے ہوئے فین کی مسلسل آواز —— ساری رات وہ بے کل رہتا، نہ اُسے نیند آتی نہ کبھی حال سے بے چینی سے نجات ملتی، اپنی نامعلوم سی اندیکھی اور انجانی بے چینی، بے کلی اور الجھن سے پڑا پڑا ذہنی لڑائی لڑتا رہتا، کبھی پلنگ سے اتر کر ٹہلنے لگتا، مگر اضطراب میں کمی پھر بھی نہ ہوتی! یہ اضطراب اسے کہاں لے جانا چاہتا ہے؟ اضطراب؟ یہ اس کے اندر کہاں سے در آیا؟ ٹہلتے ٹہلتے وہ باہر نکل آتا —— وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف جا رہا ہوتا کہ اس کے قدم تھم جاتے —— جانے کیوں جمنا بائی کے در پر آ کر اس کے قدم رک جاتے —— وہ اکثر اس بارے میں سوچتا، یہ عورت بھی تو وہی سب کچھ کرتی ہے، اسی راستے سے چل کر آئی ہے، جس پر اس کی آپا چل رہی ہے، پھر کیوں وہ اس سے نفرت نہیں کرتا؟ کیوں اس کے دروازے پر اس کے قدم رک جاتے ہیں ——؟ وہ اپنے تھکے قدم کو آگے بڑھانے کی ناکام کوشش کرتا، پھر کمرے کے اندر جھانک کر دیکھتا، جمنا بائی تنہا ہوتی تو وہ اندر داخل ہو جاتا۔

"ہائے ریاض ——" وہ خوش ہو کر ایسا ہی نعرہ لگایا کرتی جیسے کوئی الہڑ اور مٹیار لڑکی اپنے محبوب کی اچانک آمد پر جھوم اٹھی ہو۔

"ہائے ریاض ——"

اس کے یہ کہنے میں لہجہ اور ادائیگی میں جو لذت تھی۔ وہ اس کی اوباشی سے بہت مختلف تھی، جیسے وہ جھیل رہی تھی، جھیلتی آئی ہے ——

"ایسا کیوں ہے؟ —— ایسا کیوں ہے جمنا بائی؟" اس کے سوالوں کے تیور دیکھ کر جمنا بائی کے چہرے پر سائے سے آتے اور گزر جاتے لیکن ہر بار وہ اپنا دامن ان سوالوں کی گرفت سے بچا جاتی۔

"ہائے ریاض ——"

یہ جملہ سن کر، اس دن وہ چیخ اٹھا ——

"جمنا بائی —— تم مجھے کیا سمجھتی ہو —— تم مجھے اس طرح کیوں پکارتی ہو —— تم میرے ساتھ یہ کون سا ڈھونگ رچا رہی ہو۔ کیوں مجھے اُلجھن میں ڈالتی ہو ——؟"

جمنا بائی مبہوت ہو گئی۔ کتنے لمحے آئے اور سرک گئے۔ پھر اُس نے بتایا ——

"ریاض! میں ایک باعزت گھرانے کی لڑکی تھی، بھولی بھالی —— دنیا کے مکر و فریب سے نا آشنا۔ میرے پڑوس میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ وہ تمہاری طرح خائف اور سہما سہما سا نظر آتا تھا۔ میں اس کا نام تک نہیں جانتی، بس دیکھا کرتی تھی۔ میری ایسی ہزاروں خواہشیں دل کے نہاں خانے میں اُبھر کر ڈوب جایا کرتیں کہ اسے محبت سے پکاروں، جیسے تمھیں پکارا کرتی ہوں۔ اسے اپنا پن کا احساس دلا کر اس کے چہرے پر سے خوف اور سراسیمگی کے سائے میں دھو ڈالنا چاہتی تھی۔ لیکن ——؟

"لیکن کیا ہوا ——؟" ریاض نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بے حد گمبھیر لہجہ میں کہا ——

کچھ لمحوں کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد وہ بے سکون ہو گئی ——

"لیکن میرے ارمانوں اور خواہشوں کا اَن گنت تا سمندر زیریں لہریں ہی بنا رہا۔ میری شادی ایک ایسے بڈھے سے کر دی گئی، جس نے کبھی میری تشنگی نہیں بجھائی، اس کے ساتھ رہ کر میں پاگل ہوتی جا رہی تھی، اُسے دیکھ کر مجھ پہ دیوانگی کا دورہ پڑا کرتا تھا، میں رات رات بھر بستر پر تڑپتی رہا کرتی ——— پھر میں نے اُس زندان سے خود کو آزاد کر لیا ——— وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے جانا اس دنیا میں سارے لوگ تشنگی کے حصار میں قید ہیں ——— ایک میں تشنگی کا شکار تھی تو کیا تھا؟ لیکن وہ لمحہ ——— ؟ وہ قیمتی اور اہم لمحہ جانے کہاں کھو گیا۔ میں آج تک اس لمحے کی تلاش میں ہوں ——— میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے لگا، میری زندگی کے بہت سارے قیمتی لمحے تم میں چھپے ہیں ——— مجھ میں نہ جانے کتنے لوگ اپنی تشنگی ڈھونڈ کر جا چکے ہیں، نہ جانے اور کتنے اس تشنگی کو ڈھونڈنے آئیں گے ——— ایک میں نے تم میں تھوڑی سی خوشی ڈھونڈ لی تو کیا گناہ کیا میں نے، بتاؤ کیا گناہ کیا میں نے؟ میں نے تم سے کچھ مانگا؟ ——— صرف ایک کھوئے ہوئے، ڈوبے ہوئے لمحے میں پکارا ہی تو کرتی ہوں"۔

"مجھے معاف کر دو، جنا بائی، مجھے معاف کر دو"۔ اسے لگا وہ رو رہا ہے ———

——— لیکن اس طرح وہ اپنی زندگی نہ رو پایا تھا کہ رو کر بھی گئے، اس نے کچھ پالیا ———

اُس دن کے بعد اُس پر کوئی ایسی رات بھاری نہ ہوئی کہ اُسے نہ سوتے بنے نہ جاگتے نہ ٹہلتے ——— وہ راتوں کی بے کلی اور الجھنوں کی گتھیاں لیے جنا بائی کے کمرے میں چلا آیا کرتا۔ پھر باتیں نہ ختم ہوتیں اور رات کی سیاہی چھٹ جایا کرتی ——— لیکن کسی رات جب جنا بائی اینگیج رہا کرتی تو ——— !

تو وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے بھاری رات ہوتی ———

جنا بائی اپنی جوانی پیچھے چھوڑ چکی تھی، پھر بھی کوئی بھولا بھٹکا کبھی چلا آتا تو نمٹانا ہی پڑتا ———

ایسی ہی بھاری اور قیامت سی رات کے بعد جنا بائی نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوسرے محلے میں کمرہ کرایہ پر لے لے، اور اپنی راتیں وہیں گزارا کرے۔

"تمہیں رات کو یہاں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے، صبح سویرے چلے آیا کرو" ———

اُس نے سوچا تھا جنا بائی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ کمرہ مل جانے کے بعد بھی راتوں کی تنہائی میں خیالوں کی یورش اس کا تعاقب کرتی رہے گی۔

اُس کے کمرے کی مشرقی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی۔ جس روز وہ سرِ شام وہاں آ جاتا۔ اس کھڑکی کو کھول دیتا۔ اس کھڑکی کے ٹھیک سامنے گلی کے پار سامنے کے مکان کی ایک کھڑکی تھی ——— اُس نے اکثر اس کھڑکی میں ایک لڑکی کا چہرہ دیکھا تھا۔ کھڑکی سے لڑکی کا صرف چہرہ نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ اُسے دیکھتا رہتا، کبھی چھپ چھپ کر اور کبھی روبرو ——— اُسے وہ لڑکی بہت اچھی لگتی۔ بڑا بھولا بھالا اور شگفتہ چہرہ تھا اس کا۔ یہ تانک جھانک اس کا معمول بن گیا ———

ایک دن وہ کھڑکی کھولے کھڑا تھا۔ اور سامنے کھڑکی خالی تھی، وہ اس لڑکی کا انتظار کرنے لگا، جیسے صدیوں سے وہ اس انتظار میں ہو ——— انتظار کی لذت اس کے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھی۔ ——— یہ سحر اس وقت ٹوٹا، جب کمرے میں ایک اجنبی نوجوان گھس آیا اور بڑی کرخت آواز میں اس سے مخاطب ہوا ——— "کیا کر رہے ہو تم ——— ؟"

"جی ——— !"

"میں کہتا ہوں اگر تم نے اپنی کھڑکی ہمیشہ کے لیے بند نہ کی تو تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا"۔

"کھڑکی ——— میں نے آخر کیا کیا ہے؟ میں کمرے کا کرایہ ادا کرتا ہوں، کھڑکی بند کروں یا کھولوں، یہ میرے اختیار میں ہے" ———

"بدتمیز" ——— نوجوان نے بڑھ کر اس کے جبڑے پر گھونسہ جڑ دیا ——— "تم ہر وقت میری بہن کو گھورتے رہتے ہو اور بک رہے ہو؟"

ریاض خاموش ہوگیا اور وہ نوجوان دھمکی دیتا ہوا چلا گیا۔

نوجوان کے جانے کے بعد اس نے کھڑکی بند کی اور ریلوے کراسنگ کے پاس نالہ پر بنے ہوئے پل پر جاکر بیٹھ گیا ——— وہ گم سم اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں سوچتا رہا ——— بڑی دیر تک اس نے اپنے دل کو ٹٹول ٹٹول کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ جان سکا۔ ہر پل بدلتی کیفیتوں کے جال میں وہ ایسا قید تھا کہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتیں بھی اُسے اندر سے بہت اندر سے جھنجوڑ دیتیں اور وہ اپنی محبت اور نفرت کے موڑ پر کھڑا سوچتا رہتا۔ میں کدھر کا رخ کروں مجھے کدھر جانا ہے؟ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا ' ——— بچپن سے نوجوانی کی دہلیز تک قطرہ قطرہ نفرت کا زہر اس نے اتنا پی لیا تھا کہ ساری فضا اُسے مسموم نظر آتی ——— بازار، تفریح گاہ اور سینما ' ——— وہ کہیں بھی تو نہیں جا سکتا، سب کچھ عریاں تھا ——— آپا کے جسم کے ایک ایک تار چڑھاؤ وہ جانے انجانے میں تھوڑا تھوڑا کر کے اس طرح برہنہ دیکھ چکا تھا کہ اس منظر کو وہ کبھی بھلا بھی نہیں سکتا۔

اس رات وہ کمرے میں جانے کی بجائے وہ وہیں واپس آگیا ' جہاں کی بو، قہقہے اور قہقہوں کے درمیان کہی گئی باتوں سے وہ بھاگنا چاہتا تھا ——— وہ ساری رات پنکھے کی رفتار کی آواز سنتا رہا ——— ساری رات اسے وہ بھائی یاد آتا رہا جس نے اپنی بہن کے گھور ے جانے پر اپنی بے پناہ خفگی کا اظہار کیا تھا۔ ساری رات اس نے اپنی بے بسی اور مجبوری کی تہہ ہوتی چنگاری سی سلگتی محسوس کی ——— ساری رات پنکھے اس کے وجود کو بے پنکھے سے کاٹتا رہا ——— !

دوسرے دن صبح میں جب وہ آپا کے کمرہ میں جا رہا تھا اُسی وقت بھی اُس نے اپنے اندر چنگاری کو صاف محسوس کیا تھا، لیکن وہ جانتا تھا ' یہ چنگاری شعلہ کبھی نہ بن سکے گی کہ اس کے ساتھ اس کی آپا بھی جھلس جائے۔ یہ چنگاری تو اس کی روح کی جزو تھی ———

کمرے میں داخل ہوا تو وہ ششدر رہ گیا۔

کمرے کا منظر بدل چکا تھا۔ نکھرا نکھرا سا اور بڑا سہانا منظر تھا۔ آپا سامنے مسہری پر اپنے پورے لباس میں پڑی سو رہی تھی ——— وہ خوشی سے بے خود ہو گیا اور لپک کر آپا کے پاؤں پر گر گیا۔ پھر اس کے پاؤں سے اپنا سر رگڑ رگڑ کر رونے لگا ———

اچانک آپا نے اپنے پاؤں کھینچ لیے اور اس کے چہرے پر ایک زوردار لات ماری ———

" حرامزادے ' سویرے سویرے جگا دیا ' چلو جاؤ ——— اپنا کام کرو ——— سب سالے ایک طرح کے ہیں ——— ہونہہ ——— ایک حرامی کی اولاد رات آیا تھا ' میں کپڑے نہیں اُتاروں گا ' میں تمہارے کپڑے نہیں اُتاروں گا ——— ہونہہ ——— سالا پھر کس لیے آیا تھا "

وہ بڑبڑاتی ہوئی کروٹ بدل کر سو گئی ———

ریاض نے اپنے سر کے پچھلے حصہ میں چپچپاہٹ سی محسوس کی۔ وہ بڑے زور سے گرا تھا۔ سارا جذبہ، ساری لذت بکھر گئی ——— اس نے انتہائی نفرت محسوس کی۔ غصہ سے اس کا سارا وجود تپ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا ——— مکان سے بھی نکل گیا اور ریلوے کراسنگ کے پاس نالہ پر بنے ہوئے پل پر آکر بیٹھ گیا۔ نالہ میں بہتے ہوئے گندے پانی کو وہ گھنٹوں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا ' نالہ میں کوئی خوشنما چیز بہتی چلی آئے تو کیا نالہ اپنی غلاظت دھو پائے گا ——— : ایک رات کپڑے پہن کر سونے سے آپا کو کتنا دکھ ہوا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اس پل پر بیٹھا وہ بے ربط خیالات میں گھرا رہا پھر اچانک اُسے ٹرین کی زوردار سیٹی سنائی دی۔ اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک جیسے اس کو اپنی بے سمت زندگی کا کوئی سراغ مل گیا ہو ——— پسنجر ٹرین اپنی رفتار سے بڑھی آ رہی تھی اور وہ ریلوے لائن پر ٹرین کی طرف پیٹھ کیے ' اپنی نجات کا انتظار کر رہا تھا ——— ایک لمحہ ——— دو لمحہ ——— انتظار ——— انتظار ——— اچانک اسے محسوس ہوا جیسے ٹرین رک گئی ہو ——— اس نے پلٹ کر دیکھا کچھ

فاصلہ پڑنے شہر گیا تھا ـــــ اُس نے سگنل کی طرف دیکھا وہ سرخ تھا ـــــ پھر غیر محسوس طور پر وہ دھیرے چلتا ہوا ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا ـــــ کچھ ساعت کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ڈبہ میں جاکر بیٹھ گیا، بغیر کچھ سوچے سمجھے ـــــ!

انجانے شہر میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھی اس کے اپیا اور اس کے ننگے جسم کے نشیب و فراز محو نہ ہوئے ـــــ لیکن اجنبی شہر آکر اُسے اپیا کی یاد آتی تو اس کے لیے نفرت کا کوئی جذبہ نہیں جاگتا، ـــــ اس پر ترس آتا، وہ سوچتا اپیا جس طور پر زندگی کو بھگت رہی ہے اور وہ خود اس کے لیے المیہ ہے۔
احساس اُسے نہ ہو تو یہ بھی ایک المیہ ہے اس کے لیے ـــــ

اس شہر میں ریاض کے ہاتھ زندگی کا ایک سرا ضرور آ گیا تھا۔ جس عورت کے یہاں وہ باہر کے کام کاج پر ملازم تھا وہ چالیس پینتالیس سالہ ایک نیک نفس اور سبھوں سے پیار کرنے والی خاتون تھی۔ ریاض چاہتا اس کے جسم کے نقش و نگار اُسے عریاں نظر نہ آئیں مگر ـــــ اُس نے بچپن سے نوجوانی تک جس طرح اپنی آنکھوں سے اپیا کے جسم کا عضو عضو دیکھا تھا، اس نے سب کو عریاں کر دیا تھا ـــــ ریاض اس مہربان عورت کے سامنے بہت کم نظر اُٹھاتا ـــــ وہ کسی کے سامنے نظر نہیں اُٹھاتا ـــــ گھر میں کام کرنے والی ماما کی لڑکی سکینہ اس کا کھانا لیکر آتی تو نظریں جھکائے رہتا، حالانکہ اس کی آواز اسے بہت پیاری لگتی، لیکن ـــــ!

پھر ایک دن ـــــ

ایک دن ایسا ہوا کہ اس نیک دل خاتون نے اسے بلا کر کہا۔

"سکینہ کی ماں اس کی شادی کے لیے بہت فکر مند ہے میرا خیال ہے سکینہ تمھیں پسند کرتی ہے اور تم بھی تھکے تھکے سے اور متوحش دکھائی دیتے ہو، مجھے لگتا ہے تم اپنی اداس اور خاموش زندگی سے اکتا چکے ہو ـــــ میں نے یہ رشتہ طے کر دیا ہے"۔

پھر اس نے بہت سر مارا، اس کے انکار کو بے جا شرم کے

ہوا اور کچھ نہ سمجھا گیا اور ریاض ایک انجانے خوف سے اندر اندر کانپتا رہا ـــــ اس نے اپنے خوف سے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا ـــــ اس کی اپیا نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اُس سے اور اس کی آنکھوں میں بینائی کی بجائے عریانیت بھر دی تھی۔

سہاگ رات ریاض نے اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالہ میں سکینہ کے چہرہ کو لے کر بڑے گمبھیر لہجہ میں کہا ـــــ "اس میں میرا کوئی قصور نہیں، کوئی قصور نہیں ـــــ

سکینہ نے اپنی پلکوں کو اُٹھا کر بڑی حیرت سے اسے دیکھا، لیکن خاموش رہی۔

ریاض اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے سے اپنے قریب لایا اور اپنے سرد ہونٹوں کو اس کے دہکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیا ـــــ پھر ایک سرد اور بے مزہ ـــــ مگر بے حد طویل بوسہ! اتنا طویل کہ سکینہ بوکھلا گئی۔

پھر ریاض تھوڑی دیر ساکت رہا۔

دراصل اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ نہ جانے اس کے دل کے نہاں خانے سے کس طرح جینا باجی کی تصویر اُبھر آئی۔ ـــــ اُس نے سکینہ کو دیکھا تو اسے لگا، وہ جینا باجی ہے ـــــ وہ نامعلوم خوف سے کانپ گیا ـــــ

"نہیں ـــــ!" وہ چیخ پڑا۔

سکینہ کچھ نہ جان پائی۔ اور اُس نے ریاض کے بالوں میں اپنے ہاتھوں کی پتلی پتلی اُنگلیاں اُلجھا دیں ـــــ ریاض نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر بڑے زور سے بھینچ لیا۔ اتنی زور اور سختی سے سکینہ کا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا۔

ریاض نے تھوڑی دیر بعد سکینہ کو چھوڑ دیا اور ہانپنے لگا۔

▲▲

پانچویں سمت

راشد احمد
۱۹، معروف گنج، گیا

پہلی سمت سمندر کو جاتی تھی، دوسری صحرا کو، تیسری جنگل کو اور چوتھی چیختے گاتے شہر کو۔

وہ چار تھے —— جن کے چہرے ایک مشترکہ کینواس تھے —— وہ کینوس جس پر انتشار کے قنوطی برش نے تغیر پذیر لمحوں کے بے ہنگم خطوط کھینچ ڈالے تھے۔ جن کا وجود چار رنگوں کے اتصال کے بعد عمل میں آیا تھا۔ سمت، چار سمتیں۔ چہرہ، چار چہرے۔ رنگ، چار رنگ۔ علامت، چار علامتیں —— لیکن انتشار کا آہنگ —— ایک، صرف ایک۔

وہ چاروں اپنے آپ کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں عریاں دیکھ کر متحیر تھے۔
ایک سوال کا سُرخ سورج بیک وقت چاروں کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔
"تو کیا تمھیں بھی؟ تمھیں بھی؟ —— تو کیا تمھیں بھی؟ تمھیں بھی؟"
"ہاں! ہم سبھوں کو"
آنکھوں کی پرتوں پر سرمئی غلاف چڑھ گیا —— اور سوال کے سورج نے خودکشی کرلی۔

اچانک اس کا دوسرا جنم ہوا۔
"تو پھر ان چار سمتوں کا تعین کس نے کیا؟"
اُس نے جس نے ہمیں سوال کی تحریک بخشی۔
خموش سرگوشیوں سے عصبیت کی رگیں اپنے زیروبم کے ساتھ پھڑکنے لگیں۔
سوال کی زبان مشترکہ چہروں سے نکل کر ہونٹوں پہ لپلپانے لگی۔
لیکن مقدس کتابوں میں اس نے بھی تو کہا تھا کہ پانچویں سمت کا تعین ہم کریں گے۔ جس کی کونپلیں ان چار سمتوں کی پیشانیوں سے اُبل کر پھوٹنے لگیں گی۔
مگر اس پانچویں سمت کے لمس نے ہمیں ابتک نہیں گدگدایا، ایسا کیوں؟
ایسا صرف اس لیے ہوا کہ اس طلسمی لمس کی تلاش میں ہمارا ارتقائی سفر انوکھے موڑوں کو پھلانگتا رہا —— ہم تجربہ کرتے رہیں، نئی مساعی

تراشتے رہیں ـــــ ہاں! ـــــ اور اس ہوس میں ہمارا ارتقائی سفر اس موڑ پر آکر گمراہ ہوگیا، جس موڑ پر زمین و آسمان کے لب ایک دوسرے سے چپک کر صدیوں کی تشنگی کو لعاب آگیں کرنے لگے۔ ـــــ جہاں تین، پانچ، سات اور گیارہ کے اعداد و شمار میں ہم صرف ایک صفر میں سمٹ جانے پر مجبور کردیے گئے؟ ـــــ پھر نئے تجربات کے آپریشن تھیٹر میں "اکائی" کا وجود خود ایک تجربہ بن گیا اور نئے لمحوں نے پرانے لمحوں کا ایک ایک عضو کاٹ کر تاریخ کی روح کو آوارہ بنا ڈالا"

کچھ دیر کے لیے سوال کے سُرخ سورج کو جواب کے سیاہ بادلوں نے اپنی آغوش میں چھپالیا۔ لیکن لمحاتی آغوش کے اس دھندلے قرب نے سورج کے جذبات کو لوبرانگیختہ کرڈالا۔

"ـــــ تو پھر ان چار سمتوں کا کیا ہوا؟"

"ـــــ ان چار سمتوں میں پہلی تین سمتوں کے خدوخال نے اپنی انفرادی شناخت کو مسخ کرڈالا۔ اور چوتھی سمت میں آکر ضم ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک سمت رہ گئی ـــــ جو نہ پہلی تھی، نہ دوسری اور نہ تیسری ـــــ بلکہ وہ خلائی سمت چوتھی تھی۔ جس میں پہلی تین سمتوں کی علامتیں بھی انگڑائیاں لیتی ہوئی اینک نظر آرہی ہیں"

وہ چار دیوانے، ـــــ درمیانی فاصلہ ـــــ خاموشی، ـــــ کربناک خاموشی کا آہنگ وحشی قہقہوں سے بھی متجاوز تھا۔

چاروں نے سوال ایک دوسرے سے کیا یا اپنے آپ سے ـــــ جواب خود سے طلب کیا یا ایک دوسرے سے ـــــ اس کا امتیاز وہ نہیں برت سکے ـــــ رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں میں ایک عزم، ایک ارادہ سلگتے شعلہ بار ہوگیا اور ـــــ پھر وہ ہم زبان ہوکر غرائے۔

"آؤ! ہم اس پانچویں سمت کی تلاش کریں ـــــ"

اُن کی نئی آواز کے پنجے قدیم کھنڈر کی چھاتیوں کو نوچنے لگے ـــــ لیکن اچانک ہواؤں کا ترنم چیخوں میں ڈھل گیا۔ اواز کے شور نے کھنڈر میں سوئی ہوئی پتھر کی مورتیوں کو بیدار کر ڈالا ـــــ سبھی بیدار مورتیاں اپنے پتھریلے تابوتوں سے نکل کر ان چاروں کے گرد پھیل گئیں ـــــ اوران پر خاموش قہقہوں کی پراسرار بارش شروع کردی جس میں طنزیہ الفاظ کی دھاریں برس رہی تھیں ـــــ

"تم سے پہلے کئی گوتم یہاں آئے ـــــ انھیں بھی پانچویں سمت کی تلاش تھی ـــــ لیکن انھیں کیا ملا؟ ـــــ رہبانیت، یعنی شخصیت کا قتل ـــــ شانتی، یعنی مادہ کی موت ـــــ جمود کی نمو، یعنی ارتقاء کا خاتمہ ـــــ وہ سبھی بزدل تھے، فراریت کے اندھے پیروکار ـــــ ہم ان کا خموش مضحکہ اڑاتے ہیں۔ تم لوگ بھی ان کی صف میں شمولیت کے متمنی ہو تو آؤ! ہم تمہارا بھی تمسخر اُڑائیں گے ـــــ

ہاہا ـــــ ہاہاہاہا ـــــ ہاہاہاہا ـــــ ہاہا"

اور وہ چاروں پیچھے کی طرف دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ بھاگتے رہے، اس وقت تک، جبتک وہ تمسخرانہ قہقہے ان کی سماعت پر خاموش دستکیں دیتے رہے۔ ▲▲

زرد مٹی کا حادثہ

اسلم سلازار
آبگلہ، بگیا ۸۲۳۰۰۲ (بہار)

"ہمارے لیے زندگی محال ہو رہی ہے — یہ سانپ؟!"

"ہمارے ذہن پر وہ سانپ کچھ اس طرح چھا گیا ہے کہ ہر کہیں ہمیں سانپ ہی سانپ نظر آتا ہے"

اس روز ہمارے لیے ایک انہونی ہی ہو گئی تھی کہ ہمارے نگر میں ایک سانپ نمودار ہو گیا تھا۔ ہر سمت خوف و ہراس کا زرد غبار مکدرا تا پھر رہا تھا۔ اور لوگوں کے حواس میں ننھے ننھے سنپولیے کلبلانے لگے تھے۔

سرر... سرر.... سرد .... سرد .... مہیب پھنی!

میں نے گھبرا کر زور سے اپنا ہاتھ جھٹکا اور دم بھر میں میری "زندگی" کے چمن میں بھک سے آگ لگ گئی — بستر سے نیچے گری ہوئی میری گرل فرینڈ بھلا کر دور جا کھڑی ہوئی۔

میری لرزتی کانپتی زبان سے سانپ پھسلا۔

"سانپ ..... میرے ہاتھ پر سانپ چڑھا جا رہا تھا!"

"گنوار کہیں کے — ایڈیٹ!"

چلتے چلتے کسی کو محسوس ہوتا جیسے سانپ پیچھے پیچھے رینگ رہا ہو۔ وہ چیخ کر بھاگنے لگتا، اور کسی کھمبے، گاڑی یا آدمی سے ٹکرا کر خود کو زخمی کر لیتا۔

سانپ کی آمد کے بعد سے لوگوں میں ایک عجیب سی کھلبلی مچ گئی تھی — کہ سب کے چہروں پر ناگواری اور خوف کی ایک تہہ سی چڑھ گئی تھی..... دماغ کی بلوں میں موٹے موٹے سانپ گھس آئے تھے۔

چلتے چلتے میرے پاؤں یکلخت تھم گئے۔ مجھے اپنے کندھے پر سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور میں...... میرا ساکت و جامد بت سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ خوف سے جسم کا سارا خون لمحہ بھر میں خشک ہو گیا۔ اور احساس کی طنابیں جیسے ٹوٹ ٹوٹ گئیں۔ ذہن میں سن سن کرتی ہوئی آندھیوں اور آنکھوں کے سامنے بکھری ہوئی سفیدی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

یک ساعت میں نے جلد جلد طنابیں جوڑ کر ہمت کا خیمہ تیار کر لیا۔ اور آخری بچاؤ کی خاطر اپنے سانپ والے کندھے پر دوسرا ہاتھ زور سے پھینکا — اور خوف کا کھنڈ

دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

میرا دوست میرے شانے کو دبا کر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں شرمندہ ہوں!" میری زبان سے ندامت کے کچوے پھیلے۔

"شرمندگی کی کوئی بات نہیں دوست ـــــ کہ اس زرد احساس کی کونپلیں آج ہر ذہن میں اُگ رہی ہیں!"

خوف اور شرمندگی کے ایسے واقعات جب ایک سے گزرتے ہوئے سب کے ساتھ ہوئے تو ہر جگہ اتھل پتھل مچ گئی۔ کئی لوگوں نے سانپ کے خوف سے بند کیے کیے اپنی آنکھیں کھو ڈالیں ـــــ آخری بچاؤ کرتے کرتے اپنے کئی انگوں کو ناکارہ کر لیا۔

ـــــ اور جب یہ احساس پاگل پن کی حد کو جانے لگا تو بڑی مشکل سے انہوں نے ڈرتے ڈرتے ایک میٹنگ کی۔

"ہمارے لیے زندگی.....؟"

"ہمارے ذہن پہ یہ سانپ.....؟"

"یہ کوئی حقیقت ہے.......یا افواہ؟"

"بھائی ایسا نہ کہو ـــــ کہ اسے دیکھنے والا ہم میں سے ہے!"

"سانپ کیسا تھا ـــ کیسا تھا؟؟" لوگوں نے اُچک اُچک کر سوالوں کے تیر چھوڑے۔

"بے حد خوفناک ـــــ گاڑھا سبز اور سیاہ!" دیکھنے والا بولا۔

"کوئی زہریلا ہی ہوگا؟"

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"تو پھر.....؟"

"تو پھر ہمیں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنا پڑے گا۔"

"حل بس یہی ہے کہ ہم اسے کھوج کر مار ڈالیں ـــــ ورنہ"

"ہاں، ہم اسے ختم ہی کر دیں۔"

لوگوں نے اپنے ذہن کی بلوں سے سانپوں کو نکال پھینکا اور اپنے اپنے گھروں سے لاٹھیاں لیکر چل پڑے۔

"سانپ جس جگہ دیکھا گیا ہے ـــــ وہ جگہ تمہیں اچھی طرح یاد ہے؟" کسی نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں، اسی سڑک سے تین فرلانگ آگے ـــــ کنارے پر بکھرے ہوئے کھیتوں کے ایک ٹوکرے میں تھا وہ سانپ"

"یہ کچی زمینیں خطرناک ہوتی ہی ہیں کہ بھیانک اور زہریلے جانور ان میں اپنی آرام گاہ بنا لیتے ہیں!"

"ہاں، بھئی ـــــ"

"نہیں.......!!"

کھیت میں پہنچ کر اس نے جگہ کی نشاندہی کر دی، مگر وہاں اگی ہوئی ننھی منی گھانسوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"سانپ کبھی ایک جگہ نہیں ٹکتا ـــــ وہ بہت تیز چلتا ہے"

پھر وہ جھٹ پٹ محتاط ہو کر چاروں طرف پھیل گئے ـــ ہر ٹوکرے کو چھان مارا ـــ بلوں میں لاٹھیاں بجائیں مگر سانپ کہیں سے بھی برآمد نہیں ہوا۔

"شاید کسی دوسری جگہ چلا گیا ہو۔"

"لیکن کہیں بھی جائے۔ موذی کو ڈھونڈ کر مارنا ہی بہتر ہے!"

پھر وہ اس کی تلاش میں دوبارہ چل پڑے۔ بڑی احتیاط سے ہر جگہ دیکھتے جاتے ـــــ لمبی لمبی گھانسوں، جھاڑیوں اور بلوں میں...... لیکن سانپ دستیاب نہیں ہوا۔ وہ چلتے رہے ـــــ اور چلتے چلتے ان کی حرکتیں جنونانہ ہوتی گئیں ـــ وہ ہر جگہ لاٹھیاں بجاتے ہوئے چلنے لگے ـــ پھر ایسا ہوا کہ ان کی لاٹھیاں آپس ہی میں لڑنے لگیں۔

اچانک وہ تھک کر بیٹھ گئے۔

"ہم پاگل ہو گئے ہیں!"

"ہاں، ہم پاگل ہو گئے ہیں!!"

"نہیں — ہم پاگل نہیں ہوئے — ہمیں بنا دیا گیا ہے"

"عجیب پاگل ہے!؟"

"پاگل! — اسے پکڑو کہ جس نے ہمیں جھوٹی خبر دی — ہمارا وقت ضائع کیا اور ہمیں پاگل کرنا چاہا!"

لوگوں نے خبررساں کو جھٹ زمین پر گرا کر اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"جھوٹا ...... ذلیل!"

انھوں نے اسے مارنے کے لیے لاٹھیاں اٹھائیں اور تیزی سے چیخ اٹھے۔

انھیں اپنی مٹھیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی ...... جیسے لجلجی سی کوئی چیز پکڑ رکھی ہو — شاید سانپ!

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ان کی مٹھیوں میں سانپ لہرا رہے تھے ......

......گہرے، سبز اور سیاہ — ! ▲▲

عمل

شبنم سحر
۵۲۶، چوڑی والان ـ دہلی ۱۱۰۰۰۶

میں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم ہے جو نہ جانے کس طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

اُن لوگوں کے چہروں پر ایک عجیب طرح کا جوش اور بے پناہ اضطراب تھا۔

وہ لوگ اندھادھند ننگے پاؤں خود سے بھی فراموش دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے کمزور ناتواں بدن میں انجانے ہاتھوں نے برقی رو دوڑادی ہے۔

میں نے ان لوگوں کو روکنا چاہا مگر ان میں سے کوئی بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

ان لوگوں کی بے چینی دیکھ کر میرے اندر بھی تجسس جاگ اٹھا ——— آخر یہ کاہل لوگ جو اپنا بوجھ اُٹھانے سے بھی کتراتے ہیں کہاں بھاگے جا رہے ہیں، یہ تو اتنے خود غرض لوگ ہیں کہ بنا غرض کے تو شاید یہ سانس لینے سے بھی انکار کر دیں ——— مجھے یاد آیا کہ یہ وہی لوگ تھے جو ایک قدم آگے بڑھانے سے بھی گھبراتے تھے، تاریکیوں میں رہنے کی جن کو عادت سی پڑ گئی تھی۔ روشنی جن کو تیر بن کر چبھتی تھی، آج ان رینگتے کیڑوں کو کس بات نے مجبور کیا کہ یہ لوگ اپنے خول سے باہر نکل آئے ہیں ———

میرے ذہن میں سوالات ہی سوالات تھے، جوابات کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اپنے ان سوالوں کا جواب پانے کے لیے ضروری تھا کہ میں بھی ان لوگوں کے قدم سے قدم ملانا شروع کر دوں اور آخر کار میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چل پڑی۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ اور آخر ہم سب اس جگہ پہنچ ہی گئے، جہاں پہلے سے ہی بے پناہ ہجوم تھا ——— وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ ہم سب وہاں ایک ایسے مہاتما سے ملنے آئے تھے جنھوں نے ہر چنتا سے مکتی پالی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ مہاتما کھڑے تھے جو اپنی نرم میٹھی اور مشفق آواز میں کہہ رہے تھے۔

"زمین کو سورگ بنانے کا سپنا ہر کسی نے دیکھا ہے مگر کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ دھرتی جبھی سورگ بن سکتی ہے جب دکھ، پریشانی اور بیماری کا خاتمہ ہو سکے۔ انسان جبھی پرسکون رہ سکتا ہے جب اسے کوئی فکر، کوئی پریشانی نہ ہو، میں بھی برسوں پہلے ان ہماری سمسیاؤں کا حل ڈھونڈنے نکلا تھا ——— اور آج برسوں کی کڑی تپسیا اور ان گنت پریکشاؤں کے بعد میں نے اپنی منزل پالی ہے۔ آج میں تم لوگوں کے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ تم کو تمہاری منزل تک

لے جاؤں۔ اگر تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلنا چاہے تو اپنا ہاتھ اٹھالے"

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کھڑے سب لوگوں نے اپنے ہاتھ اٹھالیے۔

"ٹھیک ہے۔ ہمارا یہ سفر آج ہی سے شروع ہوگا مگر پہلے سب وچن دو کہ تم کڑی سے کڑی پریکشا سے بھی نہیں گھبراؤ گے اور اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لوگے" ـــــ مہاتما جی بولے۔

"ہاں ہم سب وچن دیتے ہیں" وہ سب چیخ اٹھے۔

اور پھر ہمارا یہ اندھیروں کی طرف سے اجالوں کی جانب کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم سب لوگ مہاتما جی کے ساتھ چل پڑے چلتے چلتے ہم لوگ ایک صحرا میں جا پہنچے۔ ہمارے سروں پر تپتا ہوا سورج تھا اور پیروں کے نیچے گرم کھولتا ہوا ریتیلا سمندر ـــــ ہم لوگوں کے تالو پیاس سے خشک ہو رہے تھے اسی لیے ہم لوگ آپس میں بولنے سے بھی گریز کر رہے تھے کہ کہیں ہمارا حلق چٹخ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ چلتے چلتے جیسے قیامت گذر گئی۔

خدا خدا کر کے وہ ریتیلا سمندر ختم ہوا اب ہم لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایک بھیانک جنگل اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس کے زہریلے کانٹے بڑے طنز سے ہمارا حوصلہ دیکھ رہے تھے مگر ہم نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ ہم لوگ گرو جی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے پاؤں لہولہان ہوگئے، ہمارا حوصلہ دم توڑ گیا۔

اس سے اگلی منزل بڑی کٹھن تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک بستی تھی جس میں سے شعلے نکل رہے تھے جگہ جگہ انگاروں کے ڈھیر پڑے سلگ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچتے وہاں کا زہریلا دھواں ہمارے ذہنوں پر مسلط ہونے لگا۔ کھانستے کھانستے ہم سب بے حال ہوگئے۔ گرو جی ہم سے کہہ رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں ـــــ یہ بھی آخری پریکشا ہے اس کے بعد ہم کو ہماری منزل مل جائے گی۔ جلدی کرو، اس سے پہلے کہ یہ جہنم کے شعلے آسمان کو جالگیں ہم کو اس بستی سے گذرنا ہے"

میں نے اپنے سب ساتھیوں کو آگے بڑھنے کے لیے کہنا چاہا مگر یہ دیکھ کر میں پتھرا گیا کہ آسمان جیسے اونچے اونچے دعوے کرنے والے وہ لوگ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھانستے ہوئے پیچھے کی جانب واپس بھاگ رہے تھے۔

▲▲

فرضی کہانی

شاہد پرویز
معرفت نفیسہ بانو، بڑی مدرسا ئے، کوارٹر لیف
بلاک ۴۴ — دہلی ۱۱۰۰۰۶

وہ تینوں پچھلے نصف گھنٹے میں آدھی بوتل صاف کر چکے تھے ۔

سعید، خالد اور امیر ——— تینوں کو بوتل ختم ہونے سے زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں کمار نہ آد ھمکے ۔

کھڑکی کے عین سامنے ——— مندر سے ذرا ہٹ کر سرکاری سٹراس گھر کے بائیں طرف کمہار بدری پرشاد چاک پر مٹی کے گھڑے بنا رہا تھا ۔ دائیں طرف بھینگی آنکھوں والے شرما کی اسکوٹر ورکشاپ بند ہو چکی تھی ۔

میونسپل لیمپ پوسٹ کے نیچے بدری پرشاد کمہار کا چاک اس کی حاملہ بیوی رکمنی کی زبان سے بھی زیادہ تیز رفتار سے گھوم رہا تھا ۔ جنتا ڈیلکس ہوٹل کا مالک لاری خاص طور سے ان گاہکوں کی خاطر مدارات میں لگا ہوا تھا جنھیں آج ڈرائی ڈے کے باوجود کہیں نہ کہیں سے شراب دستیاب ہو گئی تھی ۔

کھڑکی سے بدری پرشاد کے دونوں مٹی میں لتھڑے ہاتھ، گھومتا ہوا اپنا چاک، اور قریب ہی بیٹھی رکمنی کا پھولا ہوا نصف پیٹ نظر آ رہا تھا ۔ بدری کے مشاق ہاتھ ہر دو تین منٹ بعد رکمنی کے پیٹ کی طرح گول، بڑا سا ایک گھڑا تیار کر کے پتھریلی زمین پہ بچھی نرم نرم بالو کی تہہ پر احتیاط سے رکھ دیتے ۔

امیر نے بڑے پیار سے اپنے سامنے رکھے گلاس سے اپنے ہونٹوں کا گول دائرہ بناتے ہوئے وہسکی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا ——— پھر کھڑکی کے باہر دیکھتا ہوا بولا ———

"یار سعید! ——— دیکھو بدری کے ان گھڑوں میں کتنی یکسانیت ہے ۔ سالے سب ایک جیسے ہیں ۔ گول مٹول، خوب بڑے"

سعید نے اپنی بھاری بھاری موٹی موٹی آنکھیں کھڑکی کے راستے لیمپ پوسٹ کے نیچے پہنچا دیں ——— "یکسانیت نہیں اجتماعیت کہو ——— بالکل آدمی کی طرح ———"

خالد مضحکہ خیز انداز میں گنگنایا ——— "آدمی، مٹی کے گھڑے کے سوا کچھ بھی نہیں"

امیر نے پھر وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا ——— "آدمی میں تو اجتماعیت کا فقدان ہے"

"بالکل غلط" سعید کو جوش آگیا ۔۔۔ "کیا تم نے کبھی آدمی کے تین ہاتھ، چار آنکھیں، پانچ پیر دیکھے ہیں ۔۔۔ سب سالوں کو دو آنکھیں، ایک ناک، دو ہاتھ، دو پیر اور ایک چہرہ ہوتا ہے۔"

"بکواس" ۔۔۔ امیر غرایا۔ "اتنی یکسانیت کے بعد بھی اجتماعیت کیوں؟" ۔۔۔

سعید ہوا میں مکا لہرا کر بولا ۔۔۔ "ہاں اتنی اجتماعیت کے باوجود ہر انسان ایک دوسرے سے منفرد ہے۔ کسی کی شکل ایک دوسرے نہیں ملتی۔" ۔۔۔

"دراصل یہ تو آدمی کی تخلیق کرنے والے کا گھٹیا پن ہے۔" خالد نے ہنس کر کہا ۔۔۔

"گڈ!" ۔۔۔ امیر نے خوش ہو کر اپنا گلاس خالی کر دیا ۔۔۔ "گویا ثابت ہو گیا کہ ہم سب کو بنانے والا، بدری پرشاد سے بھی چھوٹا کمہار ہے۔"

"کفر بک رہے ہو حرامزادے۔" سعید غرایا۔

"یار تم شراب پی کر کچھ زیادہ مذہبی ہو جاتے ہو۔" ۔۔۔ خالد نے بھی اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

سعید کچھ بولنے ہی والا تھا کہ زینوں پر کچھ آہٹ ہوئی ۔۔۔ تینوں نے لپک کر اپنے گلاس میز کے نیچے چھپا دیے۔ ۔۔۔ تینوں کی زبان سے گھبراہٹ میں ایک ساتھ نکلا ۔۔۔ "کمار"

اُسی لمحہ کواڑ کے پیچھے سے ایک بلی نکل کر بھاگی۔ تینوں نے اپنی آنکھوں سے خوف اور گھبراہٹ کو نکال کر باہر پھینکتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر اپنے اپنے گلاس نکال کر میز پر رکھ دیے۔ امیر اور خالد کے گلاس خالی تھے۔

"ڈالو یار ۔۔۔ شراب ڈالو۔" امیر اور خالد ایک ساتھ بولے۔

"ٹھہرو! پہلے میں اپنا گلاس خالی کروں، ساتھ ساتھ چلو۔"

خالد جو شراب پینے کے دوران کچھ زیادہ جھگڑالو ہو جاتا تھا۔ چیخ کر بولا ۔۔۔ "یہ تو سراسر کمینگی ہے۔"

"بالکل!" امیر نے میز پر گھونسہ مارا۔

"یہ کمینگی نہیں، ڈرائی ڈے کی احتیاط ہے۔"

"ڈرائی اور احتیاط کی ایسی تیسی۔" خالد نے بوتل اُٹھا کر اپنے اور امیر کے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔

سعید نے ایک ہی سانس میں اپنا گلاس بھی خالی کر دیا۔ امیر اپنے گلاس میں سوڈا ملانے کے بعد کھڑکی سے باہر رکمنی کے پیٹ کو گھورنے لگا۔ خالد اپنے ہاتھوں کے سفید دھبوں کو تک رہا تھا۔

"ابے تم ان سفید داغوں کا علاج کیوں نہیں کراتے؟" سعید نے کہا ۔۔۔

"کتنی بار کہا یہ برص نہیں ہے۔" ۔۔۔ خالد جھنجھلا گیا۔

"ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے یار ۔۔۔ تم ہمارے دوست ہو ۔۔۔ ہم تم سے نفرت کیسے کر سکتے ہیں؟" ۔۔۔ امیر جذباتی ہو گیا۔

"یہاں سب برص زدہ ہیں پیارے ۔۔۔ کسی کی روح کوڑھ آلود ہے کسی کا ذہن۔"

"فلسفہ نہیں چلے گا میاں ۔۔۔ شراب ختم ہو رہی ہے۔" خالد نے بوتل کے پیندے میں پڑی تین پیگ شراب کو دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔

تینوں شراب ختم ہونے کے متوقع خطرے سے پریشان ہو گئے۔ تینوں کو معلوم تھا کہ آج ڈرائی ڈے ہے۔ یہ بوتل بھی خالد اپنے کسی فوجی دوست کی مدد سے ملٹری کینٹین سے لایا تھا۔ آخر سعید نے مشکل آسان کی۔ امیر اور خالد یہ سن کر کھل گئے کہ شراب مل سکتی ہے۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ پینتیس کی بوتل ستر میں بلیک سے ملے گی تو ساری مسرت سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

سب نے اپنی اپنی جیبوں کی جھڑتی لی۔ سعید کی جیب سے

سب سے کم ملا ہے آگلے ـــــ تیرہ روپے باون پیسے ۔ امیر نے بیس کا نوٹ نکالا۔ خالد نے سب کے پیسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے سو کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

سعید اور امیر پھر غرائے ـــــ "بہت بڑے حرامزادے ہو سالے۔"

"ہم سب اپنی اپنی جیبوں کے ہلکے اور بھاری پن کے حساب سے کسی نہ کسی درجے کے حرامزادے ہیں پیارے۔"

غرض سعید نیچے اُترا اور کسی کو پیسے دیکر واپس آگیا۔ تھوڑی دیر میں ایک اور بوتل آگئی ـــــ ابھی نئی بوتل کا کارک کھلا ہی تھا کہ کمار بغیر کسی آہٹ کے آدھمکا۔

تینوں نے سہم کر بوتل کو دیکھا ـــــ پھر اپنے چہروں سے ناگواری کے پرت نوچ کر پھینکے اور اس طرح مسرت بھری قلقاریاں ماریں جیسے وہ برسوں سے بچھڑے کسی دیرینہ رفیق سے اچانک ملے ہوں۔

"یار کچھ نمکین منگواؤ۔" سعید نے کہا۔

"انڈے منگوالو، اُبلے ہوئے۔" امیر بولا

"ایک درجن بہت ہوں گے، ـــــ کچھ سوکھے چنے بھی منگوالو یار ـــــ" خالد نے مشورہ دیا۔

"پوری بوتل ہے نا؟!" ـــــ کمار نے پوچھا۔

"بالکل پوری، ابھی سیل توڑی ہے۔"

"بلاؤ نیچے سے کسی کو۔" کمار نے دس کا نوٹ نکالا۔

۱۲ بجے تک چاروں پیتے رہے۔ دوسری بوتل بھی خالی ہوگئی تو چاروں کمرہ بند کر کے نیچے اُترے۔ امیر کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ اُس کی آخری بس چھوٹنے کا وقت قریب تھا۔ کمار نے قمیص اور پتلون اُتار کر کندھے پر ڈال لی تھی۔ وہ اس وقت قدرتی لباس پہننے کے فلسفے پر عمل کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب ہم سب ایک جیسے ہیں ـــــ جب ہماری روحیں تک برہنہ ہیں تو ہم کپڑوں کی مصیبت کیوں مول لیں۔

خالد کو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔

لیکن جیسے ہی سعید نے بازارِ حُسن کی سمت جانے کی بات شروع کی تو کمار نے جلدی سے سڑک پر کھڑے ہی کھڑے پتلون قمیص پہن لی۔ امیر نے بس چھوٹ جانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے واپسی پر اسکوٹر سے جانے کا فیصلہ کر لیا اور خالد کی بھوک فوراً غائب ہوگئی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ سعید بالکل پھکڑ تھا۔ امیر کے پاس کچھ روپے ضرور تھے لیکن وہ انھیں اس لیے نکالنے کے حق میں نہ تھا کہ خالد کی جیب کافی بھاری تھی۔

کمار کو اس لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سیکس یا عورت اُس کے لیے کوئی پرابلم نہ تھی۔

آخر طے یہ ہوا کہ سعید پر جس کا بھی جو خرچ ہوگا وہ سعید کل واپس کر دے گا۔ چار آدمیوں کا یہ قافلہ ایک ہی رکشا پر لد کر منزلِ مقصود کی سمت چل پڑا۔

جب بازارِ حُسن ۲ فرلانگ رہ گیا تو خالد نے کہا ـــــ

"یہ نہایت غیر اخلاقی حرکت ہے کہ ہم اپنی بیویوں کے ہوتے ہوئے رنڈی بازی کرنے جا رہے ہیں۔"

امیر کا خیال تھا کہ اس رنڈی بازی کی محرک خود ان کی اپنی بیویوں کی سرد مہری ہے۔

سعید بیوی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی معصوم تھا۔ اس لیے وہ صرف رکشا والے کو تیز چلنے کے لیے کہتا رہا۔

کمار کو یوں تو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ پھر بھی جب وہ سب بازارِ حسن میں پہنچ گئے تو صرف وہی ایک اکیلا تھا جو زینے کی پہلی سیڑھی پر کھڑا تینوں سے کہہ رہا تھا ـــــ "چلیے جناب! اب کیا پرابلم ہے ـــــ؟"

لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جب وہ کئی زینے چڑھنے اور

کوٹھا اترنے کے بعد اپنا اپنے جسم کی تمام حیوانی غلاظت پھینک کر نیچے اُترے تو چاروں کی زبان پر اس کوٹھے کی ایک سیاہ فام گھاٹن چھوکری کی شرافت، محبت، خود سپردگی اور ٹوٹے ہوئے بے پناہ بدن کی تعریفیں تھیں۔ ان چاروں نے اس کو "بلیک بیوٹی" کا خطاب تک دے رکھا تھا۔

پھر ایک مہینے بعد جب ان چاروں کی تخلیقات ایک بڑے ادبی ماہنامے میں چھپیں تو ——
امیر کی غزل کی ردیف "بلیک بیوٹی" تھی۔
کمار اور سعید کی نظموں کے عنوان "بلیک بیوٹی" تھے۔
اور خالد کی کہانی کا نام "بلیک بیوٹی" تھا۔

شاید وہ چاروں اپنے آپ کو آدمی کے خالق سے ہی نہیں —— بدری پرشاد کمہار سے بھی بڑا تخلیق کار ثابت کرنا چاہتے تھے —— ▲▲

ڈنک

محسن علی

"ایسی عورت جو کسی مرد سے نہیں ڈرتی، اس سے سبھی مرد ڈرنے لگتے ہیں ــ اور پھر ایسی عورت سے بڑا مرد شاید دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔"

شہباز میاں نے اپنی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

اُس قہقہے کی بھینی سی تہہ ان کے چہرے کے ان نقوش پر جم گئی جنہیں گذری جوانی نے یادگار کے طور پر چھوڑ دیئے تھے۔

میراں کی نظریں فضا میں کہیں ایک نقطے پر ٹھہر گئیں جیسے وہ وہاں بہت کچھ دیکھ رہے ہوں۔ ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ کی لہر تھی جیسے وہ کچھ اور کہیں تو یہی لہر آگے بڑھ کر سیلاب بن جائے گی ــ

وہ فوراً ہنسے ـــــ دوستوں کی طرف پلٹے اور آنکھ مار کر زرا دبی آواز میں کہا ــ

"حشمت خاں بھی ایسی ہی عورت تھی"

اس نام پر ان کے دونوں دوست ہنس پڑے تو شہباز میاں نے کہا ـــــ

"ہاں! اس کا نام حشمت خاں ہی تھا۔ سچ کہتا ہوں بالکل پہاڑوں میں پلی اور پتھر کی بنی تھی وہ عورت ـــــ لال گلابی سا رنگ تھا اس کا ــــ سر سے پیر تک ہوا سے اپنے آپ کو لباس میں چھپائے تو رکھتی تھی لیکن بدن اتنا کھلنڈرا تھا کہ لباس سے پہلے بدن نظر آجاتا تھا۔" ـــــ

"شمالی کوہستانوں میں گھرا ایک قریہ تھا جہاں کی وہ رہنے والی تھی۔ اور جب جوانی ہر کہ زمین کی چھاتی پر چڑھ آئی تو کسی دشمن قبیلے کے بارہ سورماؤں نے مل کر ایک ہی بلا اس کے دل سے مردوں کا خوف ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا ــــ اس کے بعد وہ پھر اپنے قبیلے کو واپس نہیں جا سکی تھی اور اتر کے ان سربفلک پہاڑوں کے ڈھلوانوں سے پھسلتی ہوئی وہ سیدھے دکھن کے سبزہ زاروں میں پہنچ گئی تھی ـــــ اس کی جوانی جیسے پہاڑی ندیوں ایسا تیز و تند بہاؤ تھا۔ عورت بے خطر ایسی تھی کہ مرد اور عورت ہمیشہ سر گرداں اس کا طواف کرتے رہتے تھے۔ بدن کے ہر خطوط میں اس کے جمال کی ریتیوں کی سی ... تھی جو ہر ہیرے کا جگر کٹ سکتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کچھ ایسی رائے رکھتی تھی ــــ میری بات

چھوڑو، میری طرف دیکھنے والے کو سنبھالنے کے لیے وہ بھاری بھر کم مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اس بات پر شہباز میاں کے دونوں دوستوں کی نظروں میں روشنی چمکی تو شہباز میاں نے ایک تبسم خاص کے ساتھ پھر کہنا شروع کیا ــــ

"ایک جاگیردار تھے۔ جن کا قد ایسا تھا کہ اپنی ڈیوڑھی کے اونچے پورے دروازوں سے گزرتے ہوئے اپنی گردن جھکا لیتے تھے۔ سینہ ایسا آگے کو نکلا ہوا کہ ان کے سامنے آنے والے کو ایک گہرا سانس لینا پڑتا تھا۔ تاؤ دی ہوئی کالی مونچھیں ایسی کہ دیکھنے والے کو اپنے ہونٹوں پر گدگدی محسوس ہوتی ــــ نظر سان پر لگایا ہوا تیشہ ــــ

ان کے پاس لاؤ لشکر نہیں تھا، البتہ ان کا حرم بھرا پرا تھا۔ علاوہ اس کے دو شوخ و طرار منکوحہ بیگمات تھیں، اپنا اپنے مورچہ پر ڈٹی ہوئی ــــ نواب جب کوئی ہندوستانی فلم دیکھتے تو بیگمات کے پاس چلے جاتے اور انگریزی فلم دیکھتے تو حرم کا راستہ لیتے۔

جب نواب کے سراغ رسانوں نے یہ خبر ان تک پہونچائی کہ کوئی غنیم، دشمن جان، جاگیر کی سرحد پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو ان کی تیشہ جیسی چمک رکھنے والی آنکھوں میں زیادہ چمک آ گئی۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ دشمن زد میں ہے، فتح کا قوی امکان ہے ــــ لیکن جب دشمن کے تیز و تند مزاج اور اس کے سامانِ حرب کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو مسکرا پڑے اور اس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ایلچی بھیجا لیکن منہ کی کھا کر لوٹا ــــ نواب کو بڑا طیش آیا۔ فوراً شب خون کی ٹھانی لیکن کسی قریبی مصاحب نے رائے دی کہ حضور پر نور کے جلال سے غنیم ابھی نا واقف ہے بس ایک بار اگر حضور کی رعب دار شخصیت پر اس کی نظر پڑ جائے تو یقینی ہے غنیم سرنگوں ہو جائے ــــ لہٰذا طے پایا کہ حضور بنفسِ نفیس قدم رنجہ فرمائیں ــــ توسنِ خاص پر زین پڑ گئی اور نواب اپنے شباب بستہ زرہ کے زیبِ بکتر سے لیس غنیم کے خیموں کی طرف چل پڑے ــــ شام کی روشنیاں ہو چلی تھیں۔ خیموں سے کچھ فاصلے پر ٹھہر کر اپنی آمد کی اطلاع پہونچائی۔

تو وہاں سے جواب آیا ــــ بار یابی کا شرف بخشا جاتا ہے۔

نواب مسکرا پڑے، سوچا مقابلہ ٹکر کا ہے ــــ پھر دشمن کی کمیں گاہ میں پہونچ گئے۔"

علی الصبح نواب جب غنیم کے خیموں سے اپنی ڈیوڑھی کی طرف لوٹ رہے تھے تو ان کا توسنِ خاص کچھ ایسا چاق و چوبند نہیں تھا لیکن نواب کے بشرے پر کچھ ایسی فتح مندی کا احساس تھا جیسے پانی پت کی تیسری جنگ جیت کر آ رہے ہیں۔ پھر بھی ان کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے بار بار یہ آواز آ رہی تھی کہ ــــ "ہم نے باجگذاری قبول کر لی"

اس واقعہ کے بعد کچھ ہی دنوں میں مشہور ہو گیا کہ حشمت خاں نے نواب کو زد کر چھوڑا ہے۔ نواب ہی کی جاگیر میں ایک پر فضا مقام پر "ایوانِ گل" نام کا ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا ــــ نواب نے حشمت خاں کے سامنے جب ہتھیار ڈالے تھے اسی وقت "ایوانِ گل اور کچھ علاقے حشمت خاں کی نذر کر دیا تھا ــــ

شہباز میاں نے یہ داستان کہتے کہتے ایک پہلو بدلا۔ اور اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا ــــ

"میں نواب کے مصاحبین میں نہیں تھا مجھے وہ اپنا یار سمجھتے تھے۔ اور بڑی ہی بے تکلفی کا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ میرے مزاج کو پہچانتے تھے۔ اور میری وجاہت کو تسلیم کرتے تھے۔ ــــ ان دنوں میری طبیعت کی جولانی اور خودسری کا عالم یہ تھا کہ نیچے زمین اور اوپر آسمان کے سوا اور کوئی مدِ نظر کو قبول نہیں تھی۔ ــــ میں نے حشمت کو کبھی دیکھا تو نہیں تھا لیکن اتنا کچھ سنا تھا اس کے بارے میں کہ قسم کھانے کو جی چاہتا تھا کہ اس کو دیکھ لیا ہے۔ دفعتاً نواب کی نہ صرف آنکھوں میں بلکہ ان کی ہر بات اور ہر سانس میں بسی ایک ایسی شے پاتا تھا جس کا نام حشمت خاں ہی ہو سکتا تھا۔ ان دنوں نواب کے وجود کے آس پاس ایک ایسی خوشبو سی محسوس ہوتی تھی جیسے کسی کا سجا ہوا کمرہ ہوتی نسوانیت سے

جھلملاتے ہوئے لبادہ کی سرسراہٹ ہو۔

ان دنوں میرے خیال و احساس میں کچھ ایسی سرگوشیاں کرتی ہوئی خوشبو بس گئی تھی کہ میں ملتا تو نواب سے تھا لیکن لگتا تھا میں نواب کے وجود سے بے خبر حشمت خاں سے مل رہا ہوں۔

ایک دن نواب نے بڑے ہی تلذذ آمیز لہجے میں مجھ سے کہا۔

"بھائی شہباز، ہم تو کب کے دنیا سے اُٹھ گئے۔ تم سے تو ہمارے یہاں کھوئے ہوئے ہوش ملتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اس عالم حیات سے گزرا ہو جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ یہ وہ کیفیت لطیف ہے جس کے ہزاروں رنگ اور نت نئی روشنیاں زندگی کی تشنگی بڑھا کر اس کو نئی نئی لذتوں سے معمور کر دیتی ہیں۔ دراصل اس کیفیت کا تعلق نہ اس زمین سے ہے نہ آسمان سے، نہ ہی اُن صدیوں پرانے گھسے پٹے احساس و شعور سے ہے جس کا اسم عام زندگی ہے۔ یہ تو وہ کیفیت برتر ہے جس کو پانے کے لیے زندگی صرف ایک وسیلہ ہے ـــــ یہی ہے فلسفۂ رنگ و بو جس کی تفسیر میں انسان کے ہر احساس کا رنگ قوس قزحی بن جاتا ہے۔"

نواب کے ہونٹوں پر یہ فلسفہ تھا تو ان کی آنکھوں میں اس کی تفسیر تھی۔ انہوں نے اپنی زبان سے زیادہ اپنی آنکھوں سے کہا ـــــ

"اُف! شہباز ـــــ کاش تم وہ منظر دیکھتے جہاں ہم بار بار قتل ہوتے ہیں ـــــ اُف کیسے کیسے وار چلتے ہیں اور کیسے کیسے زخم لگتے ہیں؟ ہمارا دل ایک ایسا زخم ہے شہباز کہ جس کا درد زندگی کا دوسرا نام بن گیا ہے۔"

اپنے دوستوں کو نواب کی یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے میاں شہباز خود اپنے آپ سے بے خبر ہو گئے۔ ان کے کمرے کے باہر کچھ آہٹ سی ہوئی۔ جیسے قریب سے کوئی گنگنا گیا ہو۔ شہباز میاں چونک پڑے۔ دوستوں کو یہ بتلانے کے لیے کہ ان کو کوئی اندر بلا رہا ہے کمرے سے باہر گئے۔ چاروں طرف نظر ڈالی اور لوٹ آئے۔

دوستوں کی پُراشتیاق نظروں کو اپنی طرف متوجہ پایا تو پوچھا ـــــ "لگتا ہے میرے مختصر سے بیان پر ہی حشمت خاں کو تم دیکھ رہے ہو؟ اُف! کیا بتاؤں یارو ـــــ کئی بار تو ایسا ہوا کہ طبیعت بے قابو ہو گئی۔ ذہن میں بجلیاں کوندیں کہ ہائے کیسی اندھیری رات ہے۔ اپنے اسپ عالی نسب پہ زین کسوں اور پہونچ جاؤں "ایوان گل" میرے خوابوں کا محل ـــــ اور پھینک دوں کمند، یا قسمت یا الغیب ـــــ لیکن بار بار نواب کا خیال آجاتا۔

ایک دن نواب کی آنکھوں کا نشہ صرف شعر پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے بڑی ہی گہری آواز میں بلکہ سرگوشی میں یہ شعر پڑھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

پھر کہنے لگے اب ہم وہاں جائیں گے تو لوٹیں گے نہیں ہم فنا ہو جائیں گے اور اس فردوس کے ہو کر رہیں گے۔

میں نے ہمت کر کے ان سے یکلخت کہہ دیا ـــــ "نواب! کاش اس فردوس کی ایک جھلک اس گنہگار کی قسمت میں بھی ہو۔"

نواب ایکدم چونکے اور پوچھا ـــــ "تم ـــــ!" تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر نواب نے مجھے گلے لگا لیا ـــــ

"چلو میرے ساتھ چلو، تم کو اپنے ساتھ ہم اس کوہِ قاف پر لیجائیں گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کیا ہوگا اس رات کا منظر ـــــ اس علاقے کے سارے رئیس آرہے ہیں۔ حشمت نے سب کو مدعو کیا ہے۔ دعوت لازم دی ہے۔ ایک طرح کا سوئمبر رچایا ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ تمہارا نواب سارے تیر و کمان توڑ پھینکے گا اور حشمت کو ہمیشہ کے لیے زیر کر دے گا۔ تم گواہ رہنا۔" ـــــ ایک رات میں نواب کے ساتھ وہاں پہونچ گیا۔

وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا جیسے اودے بادلوں میں گھرا ہوا۔

وہاں پہونچنے کے لیے آدمی کو صاحب توقیر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تقدیر ہونا بھی لازمی تھا ـــــ ایک بڑا جشن ہوا۔ اس جشن کا اہتمام حشمت خان نے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ اس علاقے کے سب سے اچھے مرد سے ملنا چاہتی تھی ـــــ ایسا لگتا تھا کہ اس شب شوریدہ کو پہلے کبھی کسی مقام پر لیجا کر سجایا گیا تھا، پھر پوری طرح سج دھجنے کے بعد وہ رات، ٹھنڈی اور معطر ہواؤں کی پالکی میں "ایوانِ گل" کو لائی گئی تھی۔ اُس رات نے اس مقام کو جی جان سے پسند کر کے یہاں اپنا ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اور حشمت سے رازدارانہ انداز میں کہا تھا۔

"یقین کرو اس فسوں خیز گوشۂ نشاط سے ہٹ کر اب رات کا کوئی اور پہلو آتنا فردوسی نہیں ـــــ بس اب تم اس اقلیم شب کی حکمران ہو۔ ایک جنبشِ ابرو سے اعلانِ قتلِ عام کر دو۔ جب نخچیروں کے دل خون خون ہوں گے تو میں اپنے سارے پراسرار اندھیرے گنگناتی روشنیاں اور اپنا سارا وجود تم پر نچھاور کر دوں گی"۔

ان گھڑیوں میں ایوانِ گل کا ہر گوشہ غماز تھا عیش و خمار کے اسرار کا ـــــ ہر پہلو مدھم میٹھی روشنیوں میں محفوظ و مامون ـــ تازہ روش سنبل و سوسن، لالہ و یاسمین باغ کی روشنیوں میں متبسم و منتظر ـــــ ہلکی ٹھنڈی ہواؤں میں میٹھے سُریلے سُر ـــــ

تقدیر میری شباب پر تھی۔ نواب کے ساتھ میں ان کا ہمسر بنا بیٹھا تھا۔ علاقے کے کتنے ہی خوبرو اور خوش نصیب نوجوان مقابل تھے۔ دور سے تھا کہ ہلکی ہوائیں عمر خیام کی رباعیات گنگنا رہی تھیں۔ سرخ و سفید پھولوں کی کیاریوں سے میں لگا بیٹھا تھا۔ اوپر آسمان تک سرمئی سرمئی سی چاندنی تھی۔ ایک شعلہ سا لپکا، جیسے میرے جام میں آگ لگ گئی۔ میری نظروں نے کیا دیکھا، مجھے سوچا نہیں۔ بس میں سن سکا۔ نواب میرا تعارف حشمت سے کرا رہے تھے۔ حشمت قریب کی نشست پر بیٹھ گئی۔

اور اس طرح مجھے دیکھا جیسے پھول ہنستے ہیں تو روشن روشن بھی ہو جاتے ہیں۔ خیال آیا کہ صدیوں کی ریاضت کے بعد شاید کسی کو ایسی نظر ملتی ہوگی ـــــ وہ نظر آواز بن گئی تو میں نے سُنا۔

"ارے! یہ تو شاعر لگتے ہیں"۔ ان الفاظ کے ساتھ ایک ایسی ہنسی سنائی دی جو اپنی جگہ ایک میکدہ تھی۔ میں نے بڑے ہی اعتماد سے جواب دیا ـــــ کہ

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

حشمت نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا لیے اور تالی بجانے لگی۔

بس دو گھڑی میں اتر سے دکھن کی طرف اترنے والی شاہراہ مجھے روشن نظر آئی۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ میں دراصل عورت کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں ـــــ

شہباز میاں کے دوستوں میں سے ایک ہنس پڑا اور بولا ـــ

"پہلی بار!"

شہباز میاں بھی ہنس پڑے اپنی مونچھوں تک ہاتھ لے گئے،

"ارے سچ یار پہلی بار ـــــ!"

شہباز میاں نے ذرا پھر اندر کے دروازے کی طرف کچھ تشویش سے دیکھا اور دبی آواز میں کہا ـــــ

"جانے کتنے حسینوں کے ساتھ بِکھوا ملایا تھا لیکن غلطی سے ان کو عورت سمجھ لیا تھا۔ خدا کی سب سے حسین تخلیق جسے عورت کہتے ہیں اس کو تو ہم نے پہلی بار اس رات دیکھا تھا۔ کبھی کسی ناگ کے ڈس لینے سے کس طرح اچانک سر سے پیر تک ایک جھنکار سی اُٹھتی ہے بس ویسی ہی ایک جھنکار میرے سارے بدن میں پیدا ہو گئی تھی۔ ایک نظر اُٹھا کر حشمت کی طرف دیکھا تو لگا کہ ایک آگ ہے جو کسی زجاجی مجسمہ میں ڈھل گئی ہے ـــــ جانے کیا ہوا، اچانک بتیاں بجھ گئیں اور ہر طرف چھٹپٹا سا نظر آنے لگا۔ ہلکی چاندنی پہ یلغار کرنے والے بادلوں کی سیاہی۔

نواب اچانک بول پڑے ـــــ "ایک جام اس منظر کے لیے"

ایک جام بھرا اور حشمت کی طرف بڑھا دیا۔ حشمت نے ایک لچک کے ساتھ ہاتھ بڑھایا ـــ جام اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھے پیش کر دیا۔ وہ جام، جامِ جم تھا ـــ مجھے سات طبق روشن نظر آئے۔ نواب چونکے اور بولے

"ایں عنایت بر رفیقِ ما"

حشمت کھل کھلا کر ہنس پڑی ـــ بولی ـــ "نواب! اس شب کے شہزادے تم ہو، میں کھو جاؤں گی تو مجھے ڈھونڈ نکالنا ـــ میں ابھی آئی" ـــ یہ کہتے ہوئے حشمت وہاں سے آگے نکل گئی۔ جس روش پر وہ جا رہی تھی اس پر کتنی ہی پلکیں بچھی ہوئی تھیں۔ دل بکھرے ہوئے تھے جنھیں روندتے ہوئے وہ آہستہ خرام آگے بڑھ رہی تھی۔

جب ہر طرف بے چینیاں بڑھ گئیں تو رات نے کروٹ لی۔ روشنیاں پھر جل اٹھیں۔ ہر طرف قہقہے سنائی دینے لگے۔ سب بدمست تھے۔ نواب اپنی صراحی سے لپٹے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "نواب اس شب کے شہزادے تم ہو" ـــ اچانک اسی لمحے ایک سرخ پوش خادم میرے قریب سے گزرا، مجھے اشارہ کیا اور آگے چلنے لگا ـــ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ پھولوں کا ایک کنج تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ مجھے ہلکے ہلکے اندھیروں میں ایک زرق برق ملبوس نظر آیا ـــ کچھ لعل و یاقوت سے پھوٹتی ہوئی روشنیاں ـــ نظر آئیں اور وہ گہری دمکتی آنکھیں اور سرگوشی ـــ

"کون ہیں آپ؟"

"میں نواب کا ساتھی ہوں"

"تو آج آپ آدھی رات گئے میرے ہاں آئیے ـــ میں آپ سے علیحدہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"بس اسی عمارت میں"

"اچھا ـــ!"

"جائیے۔"

میں نے پلٹ کر نواب کی طرف دیکھا۔ اُن سارے مدہوش رئیس زادوں کی طرف دیکھا۔ اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو لگا کسی نے رات کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ایک روشن، دوسرا سیاہ ـــ مجھے جائے پناہ کی تلاش تھی۔ مجھے تو جیسے کسی نے ستاروں کی طرف اُچھال دیا تھا۔ نیچے دھرتی پر آہ و بکا تھی۔ پانی پت کی لڑائی میں زخمی ہونے والے کتنے ہی سپاہی تڑپ رہے تھے۔ میں فاتح تھا۔

اس محفلِ رنگ و بو کے برخواست ہوتے ہوتے نواب کو میں نے نیم بیہوشی کے عالم میں ان کے محل تک پہونچا دیا اور خود زرہ بکتر پہنے رات کے سمندر میں اپنا اسپِ عالی نسب ڈال دیا۔ ایوانِ گل کی روشنیاں بجھ گئی تھیں اور ہلکی چاندنی میں وہ ایک خیالی محل لگ رہا تھا۔ ہر طرف اسرار ہی اسرار ـــ میں ہر سمت سے بے خبر تھا۔ مجھے ہوا کے جھونکے ساتھ لیے جا رہے تھے ـــ وہ سمن زار ـــ وہ سبزہ زار ـــ میں آگے بڑھتا گیا۔ اکا دکا مدھم قمقمے میں آگے بڑھتا گیا۔ یہ ایوانِ گل کی وسیع دہلیز ـــ مجھے ایک پیڑ کے سائے میں کھڑا وہی خادم نظر آ گیا ـــ میں محل کے اندر پہونچ گیا۔

فتح و نصرت کے نشان گاڑ کر میں لوٹ رہا تھا، صبح ہو رہی تھی ہوائیں یوں چل رہی تھیں جیسے ہر طرف شادیانے بج رہے ہوں ـــ ہماری جے جے کار ہو رہی ہو ـــ وہ فتح ہمارے بھی نصیب میں تھی ایک خود سر حسینہ کو فتح کرنا، ایک دنیا فتح کرنے سے کم نہیں ـــ"

اپنی زندگی کے اس معرکے کے ذکر کے بعد شہباز میاں نے اپنے دوستوں کو بغور دیکھا۔ دونوں کی نظریں پتھرائی سی لگیں ـــ دونوں کے گالوں پر محرومیت کا احساس ایک شدید تشنگی بن کر اُبھر آیا تھا۔ اشک بھری نظر سے دونوں نے شہباز میاں کی طرف دیکھا تو شہباز میاں اپنی مخصوص مسکراہٹ کے سہارے اپنی مونچھوں کے تاؤ کو جھاڑ کر رہے تھے ـــ پھر انہوں نے فضا میں کسی نقطے [illegible]

ادھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں کہا ـــــ

" اس زندگی نے کچھ اتنے حسین ستم توڑے ہیں مجھ پر یارو کہ اب جی میں کوئی ارمان نہیں رہا ـــــ ساری زندگی حور و قصور کا ایک تصور بن گئی ـــــ لیکن حشمت خاں میری فتح عظیم تھی "

ایک دوست نے کہا ـــــ " ہائے کیا گناہِ عظیم تھا اور کیسی لذّتِ گناہ تھی " ـــــ

" گناہ ! " شہباز میاں نے لطف لیتے ہوئے کہا ـــــ " ارے دیوانو ! شباب ایک لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں " گناہ " ـــــ وہ آدمی جو کوئی حسین گناہ نہیں کرتا اس کی زندگی بچپن سے نکل کر سیدھے بڑھاپے میں داخل ہو جاتی ہے ۔ اسے جوانی نصیب نہیں ہوتی "

" واہ ، کیا بات کہی ؟ " ـــــ

" ارے یار ، مرد کبھی کسی عورت کے ساتھ گناہ نہیں کرتا ، صرف عشق کرتا ہے ، اور عشق وہ آتش ہے جس پر کسی کا زور نہیں ـــــ کل آؤ ، ایک راجکماری کے ساتھ گذری ہوئی رات کی کہانی سناؤں گا "

دونوں دوستوں کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ ایک گہرا سانس لیکر اپنے خیالوں میں کھو گئے ۔

محفل برخاست ہوئی ۔ شہباز میاں دونوں دوستوں کو اپنے گھر کی دہلیز تک چھوڑنے کے لیے باہر نکلے تو دیکھا ۔ شام کا رنگ گہرا ہو گیا ہے ، آسمان پر کچھ بادل ہیں اور بادلوں کے پیچھے چاند کچھ پھنسا پھنسا سا لگ رہا ہے ۔

اپنے گھر کے پائیں باغ کی ایک روش سے گذرتے ہوئے اپنے دوستوں سے انہوں نے کہا ـــــ " دیکھو ! یہ شام ! کسی کافر سے زیبا ہو سکتی ہے ؟ " دونوں دوست ہنس پڑے اور چلے گئے ۔

دوستوں کو باہر چھوڑ کر جب شہباز میاں لوٹ رہے تھے اس وقت ان کو اپنے گھر کا چھوٹا سا باغ بھی بڑا پُراسرار لگا ـــــ مسکرا کر ایک کنج کی طرف بڑھ گئے ۔ اُدھر کچھ پودوں کے جھنڈ انہیں کچھ بولتے سنائی دیئے ـــــ " تم ، تم وحشی ہو " جھنڈ کے اندر یہ ان کی صاحبزادی فرحت کی آواز تھی ۔

جواب میں ایک نوجوان مرد کی آواز سنائی دی ـــــ " اور تم .... تم ...... تم تو سچ مچ حشمت خاں ہو "

اچانک شہباز میاں کو لگا جیسے کسی بڑی کالی زہریلی شئے نے ان کو ڈس لیا ہو ـــــ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ وہ پلٹ کر پھنکارتے ہوئے گھر میں گھس گئے ۔ سیدھے اپنے کمرے میں گئے ۔ وہاں رکھی ہوئی بندوق اُٹھائی اور لپک کر باہر آئے ۔ پیشں دالان میں آئے تھے کہ ان کی بیگم نے ان کو اس غیض و غضب میں دیکھا ۔ کوئی بھیانک روشنی سی بیگم کی آنکھوں کے سامنے کوند گئی اور وہ آگے بڑھ کر شہباز میاں کے قدموں میں گر پڑیں ـــــ شہباز میاں کی آنکھوں میں جو خون اُتر آیا تھا اسے باہر نکلنے کی راہ نہیں ملی تو ان کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی اور وہ غش کھا کر گرتے گرتے سنبھل گئے ۔

اُن کے ذہن میں ایک بجلی سی چمکی ـــــ " حشمت خاں ! "

پھر اس سرد لمحے کا زہر ، جس نے ان کو ڈس لیا تھا رات کی رگ رگ میں پھیل گیا اور وہ رات ان کے سینے میں چھپی ہوئی رنگین یادوں کے دفینے پہ ناگن بن کر ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی ـــــ ▲ ▲ ▲

جلوۂ نمو

مجموعۂ کلام ——— سید حرمت الاکرام

قیمت ——— پندرہ روپے

ناشر ——— حلقۂ ترویج ادب رام باغ، مرزا پور (یوپی)

خیال و فکر کا میدان بلا تفریق نظریہ و تصور جن کے ہاتھ ہے "یا" زمانے سے آگے ہے جن کا زمانہ" انھیں شاعروں اور دانشور قلمکاروں میں (فیض و ندیم، جاں نثار اختر، شکیب جلالی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور فضا ابن فیضی وغیرہ جیسے سنجیدہ اور معتبر تخلیق کاروں کی طرح) "شہپر" کے مصنف سید حرمت الاکرام کا شمار بھی ادب میں ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔

ان کی تازہ شعری تصنیف "جلوۂ نمو" کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے ذہن اس نقطہ پر آ کر جم سا جاتا ہے اور دھڑکنے کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سچی شاعری وہی ہے جو نہ صرف اپنے عہد کی ترجمان ہو بلکہ اپنے ماضی کا نشان بھی ہو۔ حرمت الاکرام نے قرار واقعی اپنے ہی مخصوص لب و لہجہ میں سلاست کے ساتھ صلابت کا جادو جگا کر اپنی غزلوں اور نظموں کو یادگار اور جدیدیت و ترقی پسندی کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے، بے مقصد اور بے جان کاوشیں تو دور کی بات ہے، اس میں رطب و یابس کا حصہ بھی برائے نام ہی ہے، گویا نہ ہونے کے برابر ——— یہ انفرادی خصوصیات شب و روز کا خون پی کر آنکھیں ٹپکانے، ذاتی طریق اور تازہ قوتِ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے رموز و علائم سے دامانِ نظم و غزل کو مالا مال کرنے، بالخصوص فکرِ مستعار کے جگنوؤں کو مٹھی میں تھامنے کی بجائے ماضی اور حال کے فنکارانہ ہاتھوں سے مطلعِ فردا کے دامن کو نئی قوسِ قزح سے سجا دینے کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں کا ایک ایک شعر اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے ایک مکمل نظم اور اس پر مستزاد یہ کہ نئے امکانات کا پیش خیمہ بن کر رہ گیا ہے۔ غرض یہ کہ حرمت کی شاعری کا فن بہ حیثیت فن اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ "جلوۂ نمو" میں ابھر کر ہویدا ہے اور کچھ اس طرح کہ نہ صرف اپنا اعتبار بڑھا لینے بلکہ انھیں بھی عظیم اور معتبر بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس شعری مجموعہ کے سینکڑوں منتخب اشعار میں سے یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور شاعر کے کمالِ فن کی داد دیجیے۔

سوچتا ہوں کہ یہ کس طرح کا موسم ہے
سب کچھ [illegible]

انتخاب

جلوۂ نمو ——— سید حرمت الاکرام

لفظوں کی دھوپ ——— شکیب مظہری

محتسب ——— عتیق احمد عتیق

تم بھوگے تو میں بک جاؤں گا ورنہ اک طرح
پہلے لمحوں کے کنویں سے تو نکالو یا رو!

کیا وقت آپڑا ہے کہ اپنا وجود بھی
خنجر کی طرح سر پہ لٹکتا دکھائی دے

دو دو باتیں کر کے مچلو لیں پلکیں، اس کا حاصل کیا ہے
صحرا صحرا دکھ پایا ہے، آؤ دریا دریا رو لیں،

میں چوب نم ہوں اسی طرح مدتوں حرمت
مرے وجود کو دل کا دھواں لپکا رے گا

ان کی نظموں کے بارے میں انہیں کی ایک نظم (محاذ فن کی طرف) کے یہ مصرعے حوالے کے طور پر پیش کر رہا ہوں، جو ان کے فکر و فن پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں ؎

ادراک کی صدا ہو، احساس کی نظر ہو
اور جو ـــــ امروز کی پیامی، فردا کی نامہ بر ہو
وہ شاعری امر ہے

"جلوۂ نمو" بجائے خود ایک ایسی شعری تصنیف ہے، جس کی پذیرائی ملک بھر میں کسی سفارش کے بغیر ہی کی جا رہی ہے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے ـــ۔ (عتیق احمد عتیقی)

لفظوں کی دھوپ

مجموعۂ کلام ـــــ شکیل مظہری
قیمت ـــــ دس روپئے
ناشر ـــ میرین پبلشرز "آشیانہ" ڈانڈیلی اینی کے

لفظوں کی دھوپ سے پیکرِ معنی کو بے نقاب کر دینے والا شاعر اپنے کھوئے ہوئے وجود کی تلاش میں یونہی سرگرداں رہا تو وہ دن دور نہیں جب اپنے آپ کو وہ پالے، عرفانِ ذات کے لیے فکر و تجسس کا کا عمل بہرحال مقدم ہے اور شکیل مظہری جس کام میں لگے ہوئے ہو کر رہ جاؤ "والے اصول و نظریہ کے قائل ہی نہیں اس پہ کمتر سے عمل پیرا رہنا اپنے لیے لازمی و لابدی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ذات کے پاتال سے خود کو نکال لانا ان کے لیے کوئی مشکل امر نہیں، پھر ایسی فصیلِ درد جس کے پیچھے خوشیوں کا قافلہ رینگ رہا ہو اس کی بلندیوں کو پھلانگ آنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ ان کا متجسس جذبہ ان حدوں کو چھو چکا ہے جہاں سے کامرانیوں کے سلسلے اپنے مستقر سے جا ملتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شکیل مظہری نے ؎

اپنے سفر کی پہلی منزل اس سرعت سے طے کر لی
دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے "نکلا، ابھرا، چمکا چاند

خدا اور ترقی دے تاکہ وہ ان جیسے اور چمکتے ہوئے اشعار کی طرح ؎

کل درد کے سناٹے جہاں بوئے گئے تھے
آج اس جگہ آواز کا اک پیڑ اُگ آیا

بیداریوں کے کرب سے مل جائے گی نجات
تارِ نفس میں خواب پرو کر تو دیکھئے

تجھ سے بچھڑ گئے، تو کسی سے نہیں ملے
کیا تیرا ساتھ سارے زمانے کا ساتھ تھا

جھونکا کبھی مہکتی ہوئی یاد کا شکیل
خوشبو کا سیل، رنگ کا طوفان سا لگا

درد آنکھوں میں جگا دیتا ہے وہ
رات کو دن سے ملا دیتا ہے وہ

جس کے پیچھے تھا خوشی کا قافلہ
وہ فصیلِ درد اونچی تھی بہت

اک چمکتی دھوپ تھے ہم بھی مگر
ہم کو سائے کا تجسس کھا گیا

کچھ اور اچھے، کچھ اور معیاری شعر پیش کرنے اور دنیائے ادب میں مزید شہرت و نیکنامی سے ہمکنار ہونے کا شرف حاصل

کرتے رہیں ۔

• لفظوں کی دھوپ" میں شامل کچھ ایسے اشعار جو اپنے خالق کے تخلیقی عجز کو بے نقاب کیے دے رہے ہیں، ان کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے ۔ مثلاً ؎

شام کرتی ہوئی سایہ اُتر آئی ہے تشکیلؔ!
لوٹ آیا ہے کوئی صبح کا بھولا' رتی!

دونوں مصرعوں میں تخاطب کے اس انداز نے تشکیل کو رتی اور رتی کو تشکیل بنا دیا ہے ۔

ایک اور غزل کے مقطع ؎

پہلے اے تشکیلؔ اس میں ہر طرف تھے ہنگامے
آج کتنی سونی ہے دل کی انجمن یارو !

میں بھی یہی سقم ہے ___

یہ شعر بھی ؎

کون سنگسار ہوا کس کے لہو سے اے تشکیلؔ
چاند بن بن کے چمک اٹھے ہیں ذرے کتنے

خارج از ردیف ہے، پھر اس پر طرّہ یہ کہ لفظ سنگسار اور حرف تخاطب اے بھی اپنے صحیح وزن کے ساتھ استعمال نہیں ہوا ہے ۔ شعروں میں کوئی بھی لفظ توڑ مروڑ کر یا محض برائے بیت استعمال کرنا اپنے عجز کا ثبوت دینا ہوتا ہے ۔ تاہم تشکیلؔ مظہری جیسے سنجیدہ فن کار کو ازراہِ دوستانہ چونکہ ٹوک دیا گیا ہے اس لیے توقع ہے کہ آئندہ وہ ضرور احتیاط برتیں گے اور اس قبیل کے شعروں کو غزل میں شامل ہی نہ کیا کریں گے ___ . .

(عتیق احمد عتیق)

افکار

- انور سدید
- سید محمد عقیل
- ڈاکٹر اسلم ظفر
- حرمت الاکرام
- غالب عرفان
- افسر رضوی
- مسلم سلیم
- مجیب ساقی
- حفیظ الکیانی
- اسماعیل راز

• انور سدید ——— پاکستان

"ہم زبان" جب بھی ملتا ہے تو ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ بھارت سے جو ادباء بھی پاکستان آتے ہیں وہ بالعموم یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھارت میں اُردو مر چکی ہے۔ چنانچہ عصمت چغتائی کے اس بیان کو یہاں ضرورت سے زیادہ اہمیت ملی کہ ان کے بچے اُردو زبان سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کا "ہم زبان" شائع کرنا محض جراتِ رندانہ ہی نہیں بلکہ اُردو کو زندہ رکھنے کی ایک کاوش ہے۔ "ہم زبان" میں لکھنے والے جس دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھارت میں لکھنے والے نہ صرف اس زبان میں سوچتے ہیں بلکہ اس زبان کو اظہار کا وسیلہ بھی بنا رہے ہیں۔ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی اور عظیم آباد ایکسپریس کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بھارت کی مختلف ریاستی حکومتیں اُردو کی کتابوں پر فیاضانہ طور پر انعامات دے رہی ہیں۔ اور یوں لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہو رہی ہے بلکہ اُردو کتابوں کی اشاعت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ بھارتی ادباء کے بیانات اور اخبارات کی پیش کردہ واقعاتی صورت میں مجھے بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اُردو کے بارے میں بھارت میں صورتحال اتنی خطرناک نہیں جیسی بعض ادباء پیش کرنے کی سعی کر رہے ہیں اور میں اُردو کے لیے آپ کی خدمات کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"ہم زبان" کی گزشتہ دو اشاعتوں سے ماہنامہ تخلیق لاہور کے اُٹھائے ہوئے اس مسئلے پر لے دے ہو رہی ہے کہ پاکستانی رسائل میں بھارتی ادیبوں کی اشاعت ہونی چاہیئے یا نہیں۔ "ہم زبان" نے اس کے خلاف خاصے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ میری رائے میں اظہر جاوید صاحب نے بہت اچھا کیا کہ یہ اہم مسئلہ ادباء کی برادری کے سامنے پیش کر دیا چنانچہ اس سے بحث کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ بہت سے ادباء کا نقطۂ نظر بھی نکھر کر سامنے آ گیا۔ اظہر جاوید صاحب کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے یہ سوال مجرمانہ عقل میں اُٹھایا اور اس پر عمل کرنے سے قبل رائے عامہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہمارے ہاں کئی ایسے رسائل بھی ہیں جو بظاہر ترقی پسندی کا دم بھرتے ہیں' ادب کی [illegible]

تو دہائی دیتے ہیں اور اپنی تخلیقات میں عالمی انسان، جمہوری قدروں اور آزادیٔ رائے وغیرہ کو اہمیت دیتے ہیں لیکن عملی طور پر اس قدر تنگ نظر ہیں کہ ادب میں صحت مند فضا پیدا کرنے کے لیے اپنے ادبی مخالفین کو نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی اجازت تک نہیں دیتے۔ چنانچہ ان رسائل نے اپنے صفحات غیر ملکی ادباء پر ہی بند نہیں کر رکھے بلکہ یہ پاکستانی ادباء کو بھی قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس قسم کے رسائل میں سر فہرست ترقی پسند رسائل ہیں جو بظاہر انسان دوستی کا علم سر بلند کیے ہوئے ہیں لیکن عملی طور پر ان میں صرف وہی ادباء شائع ہوتے ہیں جن کی وفاداری ترقی پسند مدیران کے ساتھ غیر مشروط ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ترقی پسند رسائل کے مدیران نے بھارتی ادیبوں کے ساتھ اپنے ذاتی رابطے تو ہر سطح پر قائم کر رکھے ہیں لیکن جب ان کی تخلیقات کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو ان کی قومی اور ملی غیرت خطرے کی زد میں آجاتی ہے۔ اور حد یہ ہے کہ اس مرحلے پر اظہر جاوید جیسے مدیرانِ جرائد جو ادبی تخلیقات کے بارے میں نسبتاً آزادروّیہ رکھتے ہیں کے خلاف آواز اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بات طویل ہو رہی ہے اور میں اسے مختصر کرتے ہوئے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی متعصب تحریریں جن میں کسی ملک کی نظریاتی اساس کو زد میں لانے کی کوشش کی گئی ہو اشاعت کے لیے قبول کرنا نہ بھارت کے مدیرانِ جرائد کے لیے ممکن ہے اور نہ پاکستان کے لیے۔ لیکن وہ ادب جس میں صادق قدروں کو موضوع بنایا جاتا ہے وہ جغرافیائی حدود سے بلند ہوتا ہے۔ اور نظریاتی تعصب اس کی آفاقیت کو محدود نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تحریریں کا اپنے قارئین تک پہنچانا ہر مدیر کا فرض ہے اور جو اسے قبول نہیں کرتا ظاہر ہے وہ مدیرانہ فرائض سے غفلت برت رہا ہے ۔۔۔۔ ..

● **سید محمد عقیل ـــــــ الہ آباد**

"ہم زبان" اس مرتبہ لکھائی چھپائی کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ مگر منقولات تشفی بخش نہیں۔ کیا بات ہے؟ اچھی چیزیں ہی شائع ہونے سے رسالے کا مزاج بنتا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ "ہم زبان" کا کوئی خاص مزاج نہیں بن پاتا۔ مضامین بھی بہت ہلکے، غزلیں، نظمیں، معیار کے لفظ تک مشکل سے پہنچ پاتی ہیں۔ افسانے بھی کچھ یونہی سے ہیں۔ ابن کنول صاحب کا افسانہ "بے آواز" اس کے دلدار کا مسئلہ کہاں ہے؟ میں کچھ نہیں پایا کہ یہ مسائل انھیں کیسے سوجھے؟ اغوا شدہ عورتوں کی برآمدگی کا مسئلہ تو اس وقت اہم مسئلہ تھا جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ آج کے دور میں وہ کیسے انھیں محسوس کر رہے ہیں اور کیوں؟ ـــــ انھیں کیسے معلوم کہ لاریاں برآمد شدہ عورتیں لے کر یا مہاجر لوگ کس طرح اپنے اہل و عیال کو لے کر تقسیم کے وقت بھاگ رہے تھے؟ اگر انھوں نے محض تاریخ سے یہ باتیں لی ہیں تو ضرورت کیا پیش آئی؟ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں۔ یہ افسانے کا نیا رُخ بھی نہیں۔ اگرچہ وہ ابھی طالب علم ہی ہیں مگر ان میں اچھے افسانے لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن اگر وہ اسی طرح محض روایتی اور تقلیدی طور پر کہانیاں لکھیں گے تو شاید وہ زیادہ دور نہ جا سکیں۔

نئے "ہم زبان" میں زیادہ تر رسالہ پاکستانی جرائد سے حاصل لیا گیا ہے میرے خیال میں یہ بھی مناسب نہیں۔ کوشش کیجیے کہ ہندوستان کے نئے لکھنے والوں کا تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔ نئی کہانی' اور نئی شاعری' سب کچھ نئے حالات کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو لیکر آئے گی بشرطیکہ ہم زبان انتظار کر سکے ۔۔۔۔ ..

● **ڈاکٹر افصح ظفر ـــــــ گیا (بہار)**

آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ نے جس نیت سے اسے لکھا ہے' وہ مستحسن ہے۔ مگر میں آپ کے بعض نکتے سے متفق نہیں ہوں۔ "افسانہ تجرید یا علامت کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو اسلوب' طرزِ ادا اور فکری پرواز کے نشانات ہیں اور یہ کسی بھی طرح افسانہ کا جسم نہیں کہے جا سکتے" یہ عبارت بڑی جارحانہ ہے۔ تجرید اگر فن میں تخلیقی جوش کے ساتھ

ملتا ہے تو بُرا نہیں' ہاں میں تجریدکو تحریک بنانے والے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ اور یہ نفرت اس لیے کرتا ہوں کہ اس میں جہالت کی بو آتی ہے۔ لوگوں کو جاننا چاہیئے کہ تجرید فرانسیسیوں کا ٹھیکہ نہیں یہ خالص اسلامی تہذیب کی دین ہے۔ اسلامی فنِ تحریر اور فنِ تعمیر پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ہیئت کے خالص تصور میں کتنے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں۔ تجرید کے فن کو برتنے کے لیے اسلامی طرزِ احساس سے اگر تعاون حاصل کیا جائے تو ہم تجرید میں نئے گوشے تلاش کر سکتے ہیں۔ ہم ہندایرانی لوگ اسے کیوں بھول گئے ہیں' بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بس اتنا ہی اس معاملے میں سوچا جا سکتا ہے کہ یہ بھی مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ جب میرے نزدیک تجرید کا تصور اس طرح اُبھرتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر علامت کا مقام میرے سامنے کتنا بلند ہوگا —— ..

● حرمت الاکرام —— مرزا پور

"ہم زبان" موصول نہیں بلکہ باصرہ نواز ہوا۔ اس کے متعلق قدرے تفصیل سے اظہارِ خیال کرنے کو جی چاہتا ہے مگر مصروفیات و مشاغل کے شدائد مانع ہیں۔ لہٰذا اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ باوجود پابندئ وقت سے اشاعت پذیر نہ ہونے کے یہ ادبی حلقوں میں بڑی تیزی سے اپنا جداگانہ اور نمایاں مقام بناتا جا رہا ہے۔ جب اہلِ ادب کسی جریدے کا انتظار رہنے لگے تو یہ اس کی کامیابی و مقبولیت کی دلیل ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ "ہم زبان" اس منزل تک پہنچ چکا ہے۔ اداریہ مجتہدانہ ہے اور مختلف ادبی مسائل پر ایسے ہی اداریوں کی ضرورت ہے —— ..

● غالب عرفان —— حیدرآباد

[۱]

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ (۶ جولائی ۸۶ء) ابھی دو روز قبل تفصیلی طور پہ زیرِ مطالعہ رہا تو حیرت ہوئی کہ مالیگاؤں جیسی جگہ سے بھی آپ کی حوصلہ مندی نے ایسے صاف ستھرے ادبی رسالے کی تخلیق کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ تاخیر سے ہی سہی مبارکباد قبول فرمایئے کہ پرچہ مجموعی طور پر بہت پسند آیا۔

نثر اور نظم ہر دو حصّوں کے صفحات نے معیار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہے۔ غزلوں میں مظہر امام اور حرمت الاکرام کی تخلیقات حاصلِ مطالعہ ہیں تو افسانوں میں مقتدر حمید کا "علاج" ایک ایسا نفسیاتی مطالعہ ہے جو اُردو افسانے میں دورِ حاضر کی مسائلی اُٹھان کا مظہر ہے۔

کتابوں پر تبصرے بھی پسند آئے لیکن کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ محتسب بہک گئے ہوں۔ مثلاً جہاں علی احمد فاطمی نے جوگندر پال کی "لیکن" کا محاسبہ نہایت ہی نپے تُلے انداز میں کیا ہے' وہیں "مسدود راہوں کے مسافر" پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے رضوان احمد کے فن پر لکھتے وقت بخل سے کام لیا ہے۔ کرشن موہن کی "کوئے ملامت" کا بشیر ہاشمی نے جس طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ واقعی قابلِ تعریف ہے لیکن عتیق احمد عتیق نے رؤف خیر کی "اقرار" پر بے حد مبالغے سے کام لیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کتابت کی خوبصورتی اور نفیس طباعت نے "ہم زبان" کو انفرادیت بخشی ہے لیکن بعض ایسی خامیاں بھی ہیں جو حسِ جمیل پر گراں گذرتی ہیں اور جن پر بہ آسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔

ترتیب ہی کو لیجئے' صفحہ ۳۳ پر آپ نے حقیر نوری کی غزل شائع کی ہے جو بلاشبہ پیاری پیاری سی سجائی ہے۔ لیکن اسی صفحہ پر پرکاش نکری کی غزل بالکل ہی عجیب سی لگی ! خصوصاً ایسے میں جبکہ انہوں نے مقطع میں "تک" جیسے متروک لفظ کا استعمال کر کے شعر کے حسن کو متاثر کیا ہے۔ چلیئے یہ مان لیتے ہیں کہ حکیم افتخار کی غزل (صفحہ ۳۲) کے چوتھے شعر کے مصرعِ ثانی میں ایک "سے" کا زائد استعمال کاتب صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے لیکن عبدالقیوم ابدالی نے اپنے مضمون "فنِ تخلیق اور اس کے مسائل" کی آخری عبارت اس جملے سے شروع کی ہے ——

"اخیر میں چند الفاظ فن کاروں کی نظر ہیں"

لفظ "اخیر" کیا ہے ؟ خیر جانے دیجئے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ

"نظر" کاتب صاحب کی غلطی کیسے کہوں؟ تعجب ہے "فنِ تخلیق کے مسائل" پر قلم اٹھانے والا ذہن "نذر" اور "نظر" کے فرق کو نہ جان سکے! کیوں ہے نا عجیب سا معاملہ؟

اردو سے اپنے دیرینہ لگاؤ کے سبب میں نے نہایت ہی خلوص سے پرچے کی بہتری کی خاطر اپنے احساسات قلمبند کیے ہیں اس سے کسی کی تعریف یا تضحیک مقصود نہیں۔

اُمید ہے "ہم زبان" آنے والے دنوں میں ہماری زبان کا ایک معیاری پرچہ ثابت ہوگا۔ آخر میں اپنی تمام نیک خواہشات کے ساتھ۔

۲

ابھی چند روز قبل میں نے "ہم زبان" کے تازہ شمارے پر اپنے احساسات کی ایک تصویر ایک خط کی شکل میں آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی تو قع ہے وہ خط آپ کو مل چکا ہوگا لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس خط میں چند باتیں لکھنے سے رہ گئیں اور وہ صرف اس لیے کہ بعض اوقات انسان کا ذہن اس کو ایسے فریب دیتا رہتا ہے کہ وہ بہت قریب کی چیز بھول جاتا ہے اور بعید کی چیزیں یاد رکھ لیتا ہے۔!

میں صرف یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ "اختلاف" کے عنوان کے تحت آپ نے جو اداریہ تحریر کیا ہے وہ نہ صرف حقیقتاً آج کی افسانہ نگاری کی سمتیں تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ اُردو افسانے میں معنویت اور تاثر کی گمراہی کے اسباب کا آئینہ دار بھی ہے۔

بعض باتیں آپ نے ایسی کہی ہیں کہ بے ساختہ واہ نکل پڑتی ہے۔ میں آپ کے ان خیالات سے سو فیصد متفق ہوں کہ ——

"ابھی ابھی ہم نے وہ تلاش بھی دیکھی ہے جب بے معنویت بھی زبردست تجرید کی حد میں داخل ہو گئی تھی اور اسے فنکاری کہا جا رہا تھا۔ وہ فنکاری کتنے لمحے چلی؟"

نہ جانے اس قسم کی تحریکیں کہاں سے اٹھتی ہیں اور کتنی جلدی اچھے خاصے پڑھے لکھے ذہنوں کا احاطہ کر لیتی ہیں کہ نہ تو اہلِ دل پر کچھ چلتے ہیں اور نہ ہی اہلِ زبان کی زبان کھلتی ہے۔! ہاں اتنا فرق ہے کہ یہ سب صرف ایک عرصے کے لیے ہوتا ہے نہایت ہی مختصر عرصے کے لیے۔ (جس کے لیے آپ نے نہایت ہی صحیح لفظ "لمحے" منتخب کیا ہے) اور اس کے بعد حقیقت پھر اپنا دامن جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ایسی تحریکیں خود اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔

آپ نے افسانہ نگاری کے موجودہ اتفاقی رجحان کا صرف دو ہی صفحات میں جس قدر بصیرت افروز جائزہ لیا ہے وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ اور اس بے باک تبصرے پر آپ کی شخصیت یقیناً قابلِ مبارکباد ہے کہ!

"کچھ افسانہ نگاروں نے انفرادیت حاصل کرنے اور توجہ کا مرکز بننے کے لیے افسانہ کی بہت ساری ہڈیاں چکنا چور کر دیں اور اس طرح اپنا نام بنا لیا ہے لیکن یہ نئے یا جدید یا افسانے کی پرخلوص تعمیر یا دریافت نہیں ہے۔ نیا افسانہ انہیں تمام افسانہ نگاروں کے بیچ میں کہیں چھپا بیٹھا ہے"

میرے یہ تمام احساسات بھی میرے پچھلے خط کا ہی حصّہ ہیں جو ذہن میں کلبلانے کے باوجود خط کے دائرۂ تحریر میں آنے سے رہ گئے تھے۔ اُمید ہے میری اس بھول کو بھول جائیں گے۔..

● انوار رضوی ______ دہلی

"ہم زبان" برابر مل رہا ہے۔ بہت اچھا پرچہ نکال رہے ہیں آپ۔ مجھ کو خوشی ہے کہ معیار کا لحاظ برابر رکھے ہوئے ہیں یہ بڑا ضروری ہے — کمزور مواد شائع کرنے سے کوئی تجبہ نہیں ہے اس سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ آپ بعض پرانی اچھی چیزیں دوبارہ شائع کریں۔ مگر ظاہر ہے ان کی کثرت اس وجہ نہ ہو کہ نئی چیزیں دب جائیں چوں کہ رسالہ کا مطلب ہے اپنے زمانے کے ادب کی نمائندگی کرنا اور اس کو منظرِ عام پر لانا۔ آپ کا یہ کوشش

تو عمدہ ہے ہی۔ لیتھو پر اتنا شفاف پرچہ نکالنا بجائے خود ہنرمندی کا کام ہے۔

اس ماہ کے تبصروں میں اوراق "(جدید نظم نمبر) پر شبیر آصف صاحب کا تبصرہ کئی جگہ معقولیت کی حدود سے باہر نکل گیا ہے۔ تبصرہ نگار کو اپنی پسند ناپسند کا اختیار ہے مگر "مخبوط الحواسی" کا لفظ ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے استعمال کرنا خاصی بدتمیزی کی بات ہے۔

تبصرہ بنیادی طور پر بے ربط ہے۔ تبصرہ نگار نے اوّل تا آخر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ اس نمبر کو اچھا سمجھتے ہیں۔ (این چہ بوالعجبی ایست؟)

جدید نظم کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا رویّہ بے حد اعتدال کا رویّہ ہے۔ وہ لا یعنیت کے خلاف ہیں اور شاعری سے معنی اور ابلاغ کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ میراجی کے مداح ہیں۔ اور جدید شاعری کا امام مانتے ہیں۔ اور جدید نظم کی جڑیں بجا طور پر میراجی میں تلاش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی وہ اقبال کو جدید نظم کی بنیاد ڈالنے والا سمجھتے ہیں کہ جس نے نظم کے پیکر میں داخلیت کا نفوذ کیا۔ یہ نظریہ نیا ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے اس کی پذیرائی ہونی چاہیئے ـــــ ..

● مسلم سلیم ــــــــــ الٰہ آباد

اس شمارہ کے تمام فن کاروں نے محنت کی ہے اور ان کے فن پاروں کا انتخاب بھی بہت عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر علی احمد فاطمی کا جوگندر پال کی کتاب "لیکن" پر تبصرہ ـــــ ابن کنول کا افسانہ "بے آواز" اور نگہت سلطانہ کا چوتھی کے جوڑے کا تجزیہ قابلِ قدر کاوشیں ہیں۔

بابِ استعمال سے آپ کی انسیت کچھ زیادہ ہی ہے کیوں کہ "اقتراح" سے "اشتہار" تک بار بار اسی باب کے الفاظ کے عنوانات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور آپ کی عربی دانی کے بین مظاہر ہیں۔

کچھ باتیں بے شک سمجھ میں نہیں آتیں

مثلاً صفحہ ۱۶۱ پر "دو مختصر کہانیاں" عنوان کے تحت تین کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ کیا جدید تحریک کا کسی قدر اثر آپ کے رسالہ پر بھی ہے؟

اس طرح "مسدود راہوں کے مسافر" پر تبصرہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی کی یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ـــــ "عظیم آباد ایکسپریس اخبار کا نہیں بلکہ کسی ٹرین کا نام ہونا چاہیئے تھا۔"

دنیا کے کئی مشہور انگریزی اخبارات کے ساتھ لفظ ایکسپریس وابستہ ہے اور صحیح ہے۔ فاطمی صاحب کی علمی استعداد کو مدِنظر رکھنے کے باوصف یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس تبصرے کے شروع کے دونوں پارے ـــــ (PARAGRAPH) اصل تبصرے سے قطعی غیر متعلق ہیں۔

شبیر ہاشمی نے کرشن موہن کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بالکل درست ہے۔ اس قسم کی لچر اور بے معنی شاعری اسی قسم کے برتاؤ کی مستحق ہے۔

رسالے کی طباعت خاص طور سے معیاری ہے ـــ ..

● مجید ساقی ــــــــــ دہلی

"فن تخلیق ....." پر مضمون اچھا لیکن تشنہ رہا۔

دیگر مشمولات میں طاہر نقوی، اسلم سلازار، مقتدر حمید وغیرہ کے افسانے ٹھیک رہے۔

حصۂ نظم میں تقریباً سبھی نظمیں ٹھیک رہیں۔ غزلیات میں شاہد میر، فضا ابن فیضی، لطف الرحمٰن، حرمت الاکرام اور غلش مظفر بہتر رہے۔

اس بار جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے آپ کا بے باک "اختلاف" جو نہ صرف چونکا دینے والا ہے بلکہ اربابِ ذوق کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے ـــ

آپ کا یہ کہنا کہ ــــــ " افسانہ خواہ وہ تجریدی ہو، علامتی ہو یا نیا ہو اسے پڑھنے والوں کے لیے لکھا جاتا ہے، کیوں کہ وہ لکھنے والوں کے درمیان نہیں بلکہ پڑھنے والوں کے درمیان زندہ رہتا ہے .... ! بالکل صحیح اور حق بجانب ہے ۔۔

● حفیظ مالیگانوی ــــــ مالیگاؤں

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ ملا ۔ یادآوری اور کرم فرمائی کا شکریہ! خوشی ہوئی کہ رسالہ حسبِ معمول بلندیوں کے مراحل طے کر رہا ہے اور اچھے اچھے قلمکاروں کا تعاون اسے حاصل ہے ۔ یقین ہے آئندہ اور بھی اہلِ قلم ساتھ آئیں گے ۔

اس شمارے میں کئی چیزیں معرکے کی ہیں ۔ خصوصاً مضامین بڑے فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں، اس قسم کے جائزے اگر آئندہ بھی شائع ہوتے رہیں تو پڑھنے والے عصری رجحانات سے مستفیض ہوتے رہیں گے ۔ گذشتہ شماروں کی طرح اس بار بھی آپ کا اداریہ صف شکن اور زلزلہ افگن ہے ۔ واقعی آج کے افسانے ان خصوصیات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو کبھی طرۂ امتیاز تھے ۔ بھلا اس تحریر کو افسانوی خانے میں کس طرح رکھا جائے گا جس میں نہ کہانیت ہے نہ حقیقت، کردار نگاری ہے نہ تحیّر ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے نقالی نے ہم سے یہ فن بھی چھین لیا ہے ۔ اور ہم اس کے لیے بھی مغرب کی طرف منہ اٹھائے کھڑے ہیں ۔ دیکھئے مالِ درآمد کی نوعیت کیا ہوتی ہے ۔ آپ کا انتباہ قابلِ قدر ہے ۔ خدا کرے اشہبِ قلم کے لیے تازیانہ ثابت ہو اور خالق توجہ اس طرف مڑ جائے جو ایک بہترین افسانے کے لیے ضروری ہے ــــ اس بار تمثیلی افسانہ خوب رہا ۔ شبیر آصف نے اچھے اشعار کہے ہیں ۔ اس شعر نے بڑی دیر تک اپنے حصار میں رکھا

شعر ؎ سوچا تو آسمان بھی تھا مختصر لگا
اُڑنا تو ایک روزنے کا کام ہی گیا

دوسری غزلیں بھی عمدہ ہیں ۔ انتخاب قابلِ تعریف ہے البتہ وہ غزل جو سراپا عروضیوں کے لیے ہے صاحبِ غزل کے مزاج کو عریاں کرتی ہے ۔ تعجب ہے ریڈیو کشمیر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو موسیقی اور ترنم کے سیلِ رواں میں رہ کر بھی اپنا دامن خشک رکھتے ہیں ۔ اور اپنی غزلوں میں مختلف اوزان کو ٹکرا کر مہابھارت کا سماں پیدا کرتے ہیں ۔

افسانے، نظمیں، اور دوسری چیزیں ابھی عالمِ انتظار میں ہیں دیکھیے کب موقع ملتا ہے، "تمثیل" بدستور آپ کی مہارتِ فن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے ۔ مبارکباد قبول فرمائیے ــــــ ..

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

جشنِ "ہم زباں" کے نام

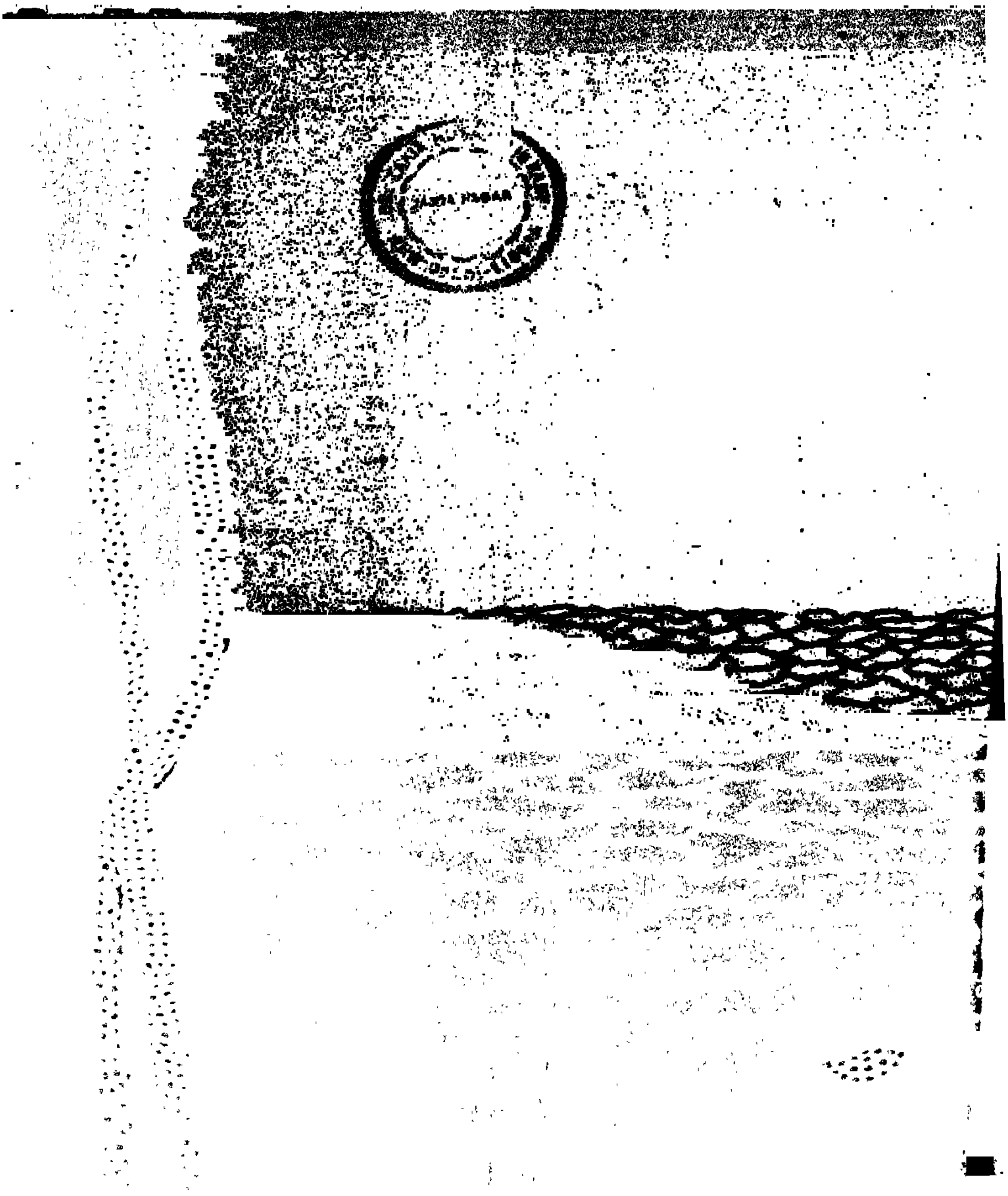
اسماعیل رازؔ

"ہم زباں" نام بہت خوب ہے لیکن اے دوست
اس میں مضمون ہے کیا اس کی علامت کیا ہے
شاید میری ہی سمجھ چھوٹی ہے سمجھا نہ سکے
کون سلجھے یہ ادب اس کی حقیقت کیا ہے
کون جانب ہے رواں قافلہ دیوانوں کا
کوئی منزل نہ کوئی راہ نما ہے کیا ہے
کوئی سمجھاتی ہیں گتھی کوئی سمجھا مضمون میں
کیسی دُھن کیا جانتا انداز ہے وہ

بات سیدھی جو سلیقے سے نہیں کہہ پاتے
وہی بگڑی ہوئی تصویر بنا دیتے ہیں
شہر کی، گاؤں کی، ٹوٹی ہوئی دیواروں پر :
ماڈرن آرٹ اسے کہہ کے لگا دیتے ہیں
ماٹیل میری سمجھ میں نہیں آیا اب تک
آڑی اور ترچھی لکیروں کا یہ مطلب کیا ہے
منہ کدھر، ناک کدھر اور یہ چہرہ ہے کدھر
صرف نقطوں کا یہ دائرہ ہے اور سب کیا ہے

تم جہاں رہتے ہو مزدوروں کی یہ بستی ہے
ان کے زخموں کا اگر ہے کوئی مرہم بتلاؤ
ان کو حاصل ہو کدھر زیست کی خوشیاں یارو
کون سا لے کے چلے ہاتھوں میں پرچم بتلاؤ
"ہم زباں" ہو تو غریبوں کے لیے کام کرو
اونچا مزدور کا معیار کرو دنیا میں
پونجی والوں کی ہر اک چال کو ناکام کرو
ترقی پسند قدروں کا ترجمان (؟) ہفت روزہ "بیباک" مالیگاؤں

ہم زباں



ماہنامہ

ہم زبان

مالیگاؤں

ایڈیٹر
سلطان سبحانی

ٹائیٹل : سلطان سبحانی

مینیجر : شاہ نواب

جلد ۲ شمارہ ۷ • نومبر دسمبر ۷۸ء جنوری ۷۹ء • تاریخ اشاعت ۶ جنوری ۷۹ء • کتابت : اکبر مرزا
طباعت : سردار پریس مالیگاؤں • قیمت : دو روپئے پچاس پیسے • زرِ سالانہ : بیس روپئے • پرنٹر پبلشر پروپرائٹر سلطان سبحانی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ ہم زبان نشاط بک سینٹر، قدوائی روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

امتزاج

اِختلاف

وہ ادب جو اپنے عہد کی آواز نہ بن سکے اسے کا شمار زندہ ادب میں نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ ادب سچ ہوتا ہے۔ وہ پوری دُنیا کے مناظر، حالات اور احساسات کا لشکر لے کر اُبھرتا ہے اور دِلوں میں بس جاتا ہے۔ عصری ادب میں نئی حسیت کے نام پر جو تجربے سامنے آئے ہیں اور ان میں جدید عہد اور عصری مسائل کی جو جھلکیاں دکھلائی گئی ہیں ان کا زیادہ حصہ حقیقت سے بعید ہے اور ان پر ملمع سازی یا پردہ پوشی کی کوشش غالب نظر آتی ہے۔ موجودہ عہد کا اصل چہرہ مسخ کر کے کوئی اور چہرہ تراش دینا اور انسانی زندگی کے اصل مسائل سے چشم پوشی کیلئے کچھ خود ساختہ مسائل کی دھول اُڑا دینا ایک طرح سے سچائی کے اظہار سے دستبردار ہونے کا اعلان ہی ہے۔ موجودہ عہد کی غلط صورت گری اور عصری مسائل کی غلط نشاندہی سے نہ تو وقت کا موسم بدل سکتا ہے نہ دنیا کے دیکھنے کا انداز ہوتا ہے۔ دُنیا خود کو اور اپنے مسائل کو فن کار کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنی آنکھ سے دیکھتی ہے۔

آج کا فن کار کچھ اتنے فنی باریکیوں کے مقام پر پہنچ چکا ہے اور کچھ ایسے مبہم سے لطیف دائروں میں اُلجھ گیا ہے کہ تخلیقی عمل کے وقت کسی بھی مسئلے پر کوئی صاف انداز میں کہتے ہوئے اسے اپنا فن اور وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہیں کوئی اس کی بات سمجھ نہ لے ورنہ معنویت اور تہہ داری ختم ہو جائے گی۔ وہ خدا کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی یتیم خانہ کے مہتمم سے ہمکلام ہے۔ وہ جنگ کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تو لگتا ہے جنسی ہوسناکیوں پر بحث کر رہا ہے۔ وہ امن پر کچھ لکھتا ہے تو لگتا ہے دیوالی یا جشنِ آزادی کا منظر نامہ پیش کر رہا ہے۔ یہ کوئی تہہ داری

نہیں ہے۔ یہ علامت نگاری کی ناکام ترین مثالیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی کامیاب تحریریں بھی سامنے آئیں ان کی اہمیت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ناکام تحریروں کی حمایت میں سارا الزام قارئین پر عائد کر دیا جائے کہ وہ باشعور اور حساس نہیں ہیں تو یہ صرف اپنے عیوب کی پردہ پوشی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب قارئین سے نہیں بنتا لیکن ادب صرف کتابوں میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسے زندہ رکھنے کے لئے عوام کے درمیان آنا ہی پڑے گا جہاں باشعور قارئین صف بہ صف ملیں گے۔

ناکام اور موجودہ عہد سے خارج تحریروں کی صفائی میں ایک مثال عرصہ سے دی جا رہی ہے کہ .... غالب کو سو سال بعد سمجھا گیا۔ یہ مثال یہاں غلط ثابت ہوتی ہے کیوں کہ غالب کی تحریر ناکام نہیں تھی، دوسرے غالب اپنے عہد سے کسی بھی طرح کٹا ہوا نہیں تھا اس نے سو سال یا ہزار سال آگے دیکھنے کے لیے اپنے دور سے رشتہ منقطع نہیں کیا بلکہ اسے پورے طور پر سمیٹ کر آگے کی طرف بڑھا یہی وجہ ہے جو وہ اپنے کل میں بھی زندہ ہے آج میں بھی اور آنے والے زمانوں میں بھی۔ ابعادِ ثلاثہ کو اپنی ذات میں سمو لینا بھی ایک بہت بڑا فن ہے۔ آج کے فنکار کو آج سے زیادہ سو سال بعد زندہ رہنے کی اتنی فکر ہے کہ وہ آج کو فراموش کر کے صرف سو سال بعد کے زمانے پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ جو اپنے عہد میں زندہ نہ رہ سکے وہ سو سال بعد کس طرح زندہ ہو سکتا ہے۔ آنے والے دور کی بنیاد ہمیشہ آج کے کاندھوں پر رہتی ہے۔

زندہ ادب ہمیشہ سے وقت اور سچائی کا نقیب رہا ہے، ادوار بدلتے ہیں، سب کچھ فنا ہو جاتا ہے لیکن وہ باقی رہتا ہے۔ اس کے برخلاف مریضانہ ادب عصری مسائل پر ملمع کر کے اسے دوسری صورت میں پیش کرتا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے دور سے کٹ جاتا ہے۔ اگر ویتنام وحشیانہ بمباری کی زد میں ہو۔ اگر بیت المقدس آگ اور خون میں نہا رہا ہو، علی گڑھ بے گناہوں کے بہیمانہ قتلِ عام سے چیخ رہا ہو تو ایسے وقت اگر کوئی ادیب ان واقعات سے فائدہ اٹھا کر اپنی ذات کا نوحہ یا المیہ لکھنے بیٹھ جائے تو اس کا رویہ حقیقت پسندانہ نہیں ہوگا — ۲
اس کی تخلیق میں ویتنام کا کوئی سپاہی، فلسطین کا کوئی مجاہد یا علی گڑھ کا کوئی خاندان اپنا درد نہیں دیکھ سکے گا —— ..

حزیں لدھیانوی (پاکستان)

جب ذرا مسکرانے لگتے ہیں
اک نیا زخم کھانے لگتے ہیں

چاند تک تو سفر ہے دو دن کا
اُس کے دل تک زمانے لگتے ہیں

اک دیا گر جلا بھی لیتا ہوں
کتنے جھونکے بجھانے لگتے ہیں

جب کوئی قتل گاہ سجتی ہے
سب ہمیں آزمانے لگتے ہیں

عشق، چاہت، خلوص، پیار، وفا
یہ سبھی دُکھ پرانے لگتے ہیں

چاند جب ٹوٹتے ہیں آنکھوں سے
راستے جگمگانے لگتے ہیں

چلتے پھرتے ہیں، جی رہے ہیں مگر
آدمی سب فسانے لگتے ہیں

دارِ شب پر بھی اے حزیں ہم لوگ
صبح کا گیت گانے لگتے ہیں

سفر پسند ہوں، زندہ رہوں کہ مر جاؤں
مگر میں دشتِ وفا سے حزیں گزر جاؤں

یقیں ہے کچھ تو اندھیروں کی عمر کم ہوگی
جلا کے مشعلِ غم، رات کے نگر جاؤں

بچھڑ کے تجھ سے پیامی بنوں بہاروں کا
شجر شجر میں سدا اے مرے شجر جاؤں

نئے سفر پہ ہوں نکلا یہ آرزو لے کر
مسافروں سے نئے راستوں کو بھر جاؤں

کروں نہ دشت کے کانٹوں کو کس لئے سیراب
میں لہر ہی سہی، دریا میں کیوں اُتر جاؤں

میں زخم کھاتا ہوا، خون میں لتھڑتا ہوا
شفق کا رنگ بکھیروں جدھر جدھر جاؤں

میں آدمی ہوں، کوئی ریت کا بھنور تو نہیں
ہوا کے سامنے، پھر کیوں بکھر بکھر جاؤں

طلوع ہونا ہے آخر تجھے مرے سورج
اک اور شب میں ترا انتظار کر جاؤں

حزیں ہوا کی طرح چل رہا ہوں میں ورنہ
وہی نگر، مرا اپنا ہے، جس نگر جاؤں

عتیق — مالیگاؤں (ناسک)

میں اپنی ذات سے یوں تو سمندر آسا تھا
مگر خود اپنے لئے بوند بوند پیاسا تھا
اب اس بھنور سے کوئی کیوں نکالتا اس کو
وہ اپنی ذات کے گھیروں میں خود گھرا سا تھا
اُبھرتی ڈوبتی سانسوں کی یہ صلیبیں تھیں
کہ میرے ہونے کا جھوٹا سا اک دلاسا تھا
وہاں میں خود کو کہاں تک سمیٹتا کہ جہاں
حقیقتوں کا تصور بھی خواب آسا تھا
لگی تھی بھیڑ مگر کتنی اجنبیت تھی
نہ میں کسی کا نہ کوئی مرا شناسا تھا
لسی کے روپ کی بہتی ہوئی ندی کا سماں
ہت ہی خوب تھا لیکن بہت ذرا سا تھا
ے لبوں کے سمندر میں غرق رہ کر بھی
رے لبوں کا جزیرہ بہت ہی پیاسا تھا
ل سی کو بھی خیرات کوئی کیا دیتا
سب نے ہاتھ میں بے مائگی کا کاسا تھا
ے کے رہ گیا آواز کے بدن سے عتیق
ب جو اس کے لبوں کا بڑا شناسا تھا

خاکِ دل سے سپہرِ بخت اُگا
کہکشاں سا بھر اک درخت اُگا
کاٹ کر فصل ان لکیروں کی
اپنے ہاتھوں میں اپنا بخت اُگا
سائے جن کر رہِ مسافت کے
آگ اگلتے ہوئے درخت اُگا
دل کی مٹی تو نرم تھی، نم بھی
خارِ حسرت ہی سخت سخت اُگا
اپنے پہلو میں اب، اک ایسا دل
کر دے جو غم کو لخت لخت اُگا
جو بھی بیٹھے ہرا بھرا ہو جائے
ایسا اک با ثمر درخت اُگا
خود کو سمجھیں سبھی سکندر بخت
ملک میں ایسے ساز و رخت اُگا
بے پر و بال اُڑ فضا میں عتیق
پاسباں سا کوئی تخت اُگا

مارکسی ادب اور ادیب

ڈاکٹر سید محمد عقیل
صدر شعبۂ اردو، الہ آباد

ادب کی بات، تاریخ، عمرانیات، حیات اور حقیقتوں کی بات ہے۔ انسان کی سب سے بڑی تبدیلی اور مشکل یہی ہے کہ وہ سوچتا ہے اور سوچ سمجھ کر زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ زندہ ہے تو کیوں زندہ ہے؟ کیا وہ خود اپنے لیے زندہ ہے یا دوسروں کے لیے بھی؟ کیا زندگی محض یوں ہی جیئے جانے کا نام ہے یا اپنے جینے کی کچھ نشانیاں بھی زندگی چھوڑتی ہے؟ کیا زندگی کسی نصب العین کے سہارے چلتی ہے یا نظریات اس کی سادگی میں رخنے ڈالتے ہیں۔ کیا انسان اپنے ماحول سے وابستہ ہے اور اس کا ماحول اس کی سوچ میں اپنی دلخستگی اور اپنا زہر گھولتا رہتا ہے؟ یا تاریخ کے پیچ و خم اسے ایسے راستوں سے گزارتے ہیں جہاں زمان و مکان کی گرفت میں آکر وہ اپنے عادات، اطوار اپنی فکر، اپنے نظریات کے نشانات بھی چھوڑ جاتا ہے، جو تہذیبوں کی تشکیل میں، ادب کی فکر، نظام اور سماجی زندگی کی تاریخ بنتے ہیں؟ یہ اور بہت سی باتیں ادب کی بنیاد میں ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ ادب انسان کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے جسے وہ زندگی کے ساتھ لیکر پیدا ہوا ہے۔ جس میں اس کی تخیل رنگ بھرتی ہے اور فکر ایک نقطۂ نظر پیدا کرتی ہے۔

انکشافِ ذات سے لگا تجربہ، ادیب کے سامنے کچھ ایقان، کچھ اصول اور کچھ نظریات ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے وہ ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ آگہی، قوت اور اظہار سے تیکنیک اور افکار تک کتنے ہی نقاطِ نظر ہیں جو آج تک ادب کی دنیا میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ ادب ایسا ہی ہو اگر وہ ادب کے زمرے میں آتا ہے تو کسی نہ کسی نظریۂ زندگی کا ادراک اس کے لیے لازمی ہے۔ اور یہ نظریۂ زندگی فکر کے عروج و زوال، فن کے احساسِ حسن اور انسانوں کی تاریخ کی روشنی ہی سے تدوین ہوتا ہے۔ بقول لیبنی ———

"ہر سنجیدہ ادب حیاتِ انسانی کی ایک زندہ دستاویز ہے جس میں (حیاتِ انسانی کے) ادوار اور تاریخی تبدیلیوں کی کرشمہ زائیاں ہوتی ہیں۔"

اور ان بہت سارے نظریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ وہی نظریہ قوی ہوتا ہے جو انسانوں کی زندگی کو بہت دور تک روشنی دکھا سکے۔ اور ادب کی چاندنی سے ان کے ذہن کے گوشوں کو منور کر سکے۔

ادب کے ان مختلف نظریات کی جلو میں مارکسی نقطۂ نظر سب سے موخر (Latest) ہے جس نے ادب اور ادیب کے لیے ایسے رویوں کی نشاندہی کی ہے جن سے زندگی کی حقیقتوں اور ادب کی مادّی تفسیر اور تفہیم میں بہت سے گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔

مارکسی ادب زندگی کی ایسی تعبیر ہے جو زندگی سے کیف و کم اور اس کے گرد و پیش سب کا عکس لیکر ان حقیقتوں کا مظہر بنتا ہے جو بہتر حیات کی تعمیر کے لیے مادی ذرائع سے ماحول تیار کرتی ہیں۔ یہ ماحول عصری بھی ہوتا ہے اور ماورائے عصر، اس ماضی سے بھی جڑا ہوتا ہے جو اس کے لیے عقبی زمین کا کام کرتا ہے، یہی مادی ذرائع خیال سے حقیقتوں کے ادراک تک پہنچتے ہیں اور مارکسی ادب کے لیے اصل اصول کا کام دیتے ہیں اور بلنسکی کے الفاظ میں :—

"زندگی میں نئی شگفتگی لاکر اس طرح اسے پیش کرتے ہیں جیسی وہ ہے اور اسی وجہ سے ادب کی قدر و قیمت سوسائٹی کی نظر میں وقیع ہو گئی ہے۔"

مارکس فکری طاقتوں کے تاریخی ارتقاء کا قائل تھا۔ یہ فکری طاقتیں زندگی کی ان حقیقتوں سے اپنے سلسلے جوڑتی ہیں جن سے زندگی اپنے امکانات کا مظہر بنتی ہے، جن پر بھروسہ کرکے انسان زندگی کے لیے خوش آئندہ خواب بنتا ہے اور ایک اتفاق کے ساتھ کارزار حیات میں خود کود پڑتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں، انسان کی عملی زندگی کی کہانیوں کے سوا اور کیا ہیں؟ بشرطیکہ ادب نے ان کا صحیح ادراک کیا ہو۔ اور انہیں چند تیار شدہ یا پہلے سے متعین حقیقتیں نہ سمجھ لیا ہو۔ کیوں کہ حقیقتیں، انسانی معلومات، حرکت و عمل اور اس کے امکانات کے تغیر و تبدل سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ کسی انفرادی سوجھ بوجھ یا نفسی کیفیات کی معروضی سوچ کا نتیجہ نہیں۔ جو یہ نہیں سمجھتے وہ حقیقتوں کے ادراک میں دھوکہ کھاتے ہیں اور انفرادی سوچ سے پیدا ہوئی نفسی معروضیت کو ردِ عصر اور عصری حقیقتیں سمجھتے ہیں پھر ان کو سماج اور زمانہ سب انہیں مفروضہ حقیقتوں میں آلودہ نظر آتا ہے اور پھر انہیں کو وہ تمام انسانوں کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور مزعومات (Whims) کے سہارے چل کر ادب کی حیثیت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ انہیں عوامی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہ جاتا اور فکری تضاد میں گھر جاتے ہیں۔ انفرادیت کے معنی ان کے یہاں ہر شخص کے داخلی محسوسات ہوتے ہیں جو نجی حالات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ خواہ نجی حالات اور محسوسات کسی ذہنی بیماری (Neorisis) کے تحت آئے ہوں یا کوئی نفسیاتی گتھی ان کی محرک ہو تو اس سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن مارکسی ادیب ان الجھیڑوں سے باخبر ہوتا ہے۔ وہ اس فکری تضاد میں مبتلا نہیں ہوتا جو عوامی مسائل، اور انفرادی، نجی مسئلوں کی آویزش سے پیدا ہوتا ہے۔ مارکسی ادیب اپنے اصولوں کی بنیاد (objective Laws) پر رکھتا ہے، جو عوامی زندگی کو نظر میں رکھ کر حقیقتوں کا ادراک کرتے ہیں۔ اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو سماج اور کائنات کی کمیوں پر محمول نہیں کرتے۔

انیسویں صدی کے فرانس میں جب انحطاط پسندوں (Decadents) کا دور دورہ ہوا تو ذاتی محرومیاں اور کمیاں شعر و ادب کے راستوں سے عام انسانوں کی محرومیاں بتائی جانے لگیں۔ بودلیر ایک Nedipus Complex زدہ ذہنی مریض تھا۔ جس نے اپنی کاہلی اور ذاتی محرومیوں کو فلسفہ بنا کر انحطاط پسندوں کے ادبی اور ذہنی رویے کی دستاویز بنانے کی کوشش کی اور اپنے احساسِ گناہ سے پیدا ہونے والے ذہنی کچوکوں کو انسان کی محرومیوں سے تعبیر کرنا شروع کیا اور اس طرح "بدی کے پھول" انیسویں صدی کے فرانسیسی سماجی انسان کی حقیقی زندگی کا مقسوم بن گیا۔ اگرچہ حقیقت صرف یہ تھی کہ بودلیئر کے آتشک کے مرض، اس کی ماں کی دوسری شادی، اس کی اپنی جنسی ناآسودگی اور ساتھ ساتھ ایک سانولی لڑکی کے تعلقات کی گھٹن نے یہ تشکل پیدا کی تھی۔ ان تمام باتوں نے بودلیئر کی ازدواجی زندگی

میں اس کی ضد اور ناکارہ پن کی وجہ سے زہر گھول دیا تھا۔ جس پر قرض خواہوں کے تقاضے مستزاد تھے۔ اسے ذہن کا اپنے اندرون میں داخل ہو کر سمٹ جانا اور اس کے اظہار کو حقیقت نگاری سمجھنا لازمی تھا۔ بودلیئر کے یہ تجربے اپنے دور کی عوامی زندگی کے مطابق نہ تھے اور نہ انحطاط پسند (Decadents) عام انسانوں کی زندگی سے دلچسپی لیتے تھے، جو ان کی تحریروں میں اس زندگی کی سچی تصویر نظر آتی۔ انحطاط پسندوں کی تحریک انسانوں کو اپنی فکر اور اس سے پیدا شدہ ماحول کا غلام بناتی ہے جبکہ اس زندگی کا عام انسان اپنے ماحول پہ قابو پانے اور حالات کے بدلنے میں کوشاں تھا جیسا کہ اس نے انقلاب فرانس اور جولائی انقلاب میں کر دکھایا تھا۔ مارکسی ادب اس لیے فن کار کے داخلی مزعومات (Whims) کو فن کی بنیاد نہیں مانتا بلکہ سوسائٹی کے ان (objective laws) کو اہمیت دیتا ہے جو ایک مخصوص دور میں کسی سماج کی فکر اور فن کی اساس بنتے ہیں اور یہ objective laws نہ تو Abstract ہوتے ہیں اور نہ بے جان۔ ان میں زندگی کا تضاد بھی ملتا ہے اور اس کے نشیب و فراز بھی اور اس طرح یہ سماجی حقیقت نگاری سے نزدیک بھی ہوتے ہیں اور اس کی سچی تصویر بھی بناتے ہیں۔

ہر دور کا ادب اپنی زندگی کا تضاد بھی رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ جو لوگ ادب کے مارکسی نظریے کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ مارکسزم ادب کی جہتوں کو کم کر کے اسے صرف ایک رُخ میں بڑھنے کی اجازت دیتا ہے، اس میں انفرادی کوششوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع نہیں ہوتے، ایسے لوگ یا تو مارکسزم کو سمجھتے نہیں یا اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس لیے اس حلقے سے اعتراض ہوتا ہے کہ جب ایک ہی سماجی، تہذیبی اور اقتصادی پس منظر میں ادب کی بارآوری ہوتی ہے تو تمام ادیب ایک ہی طرح کیوں نہیں سوچتے۔ ایک طرح کی چیزیں کیوں نہیں لکھتے۔ ان کا اسٹائل ایک ہی کیوں نہیں ہوتا۔ اور چوں کہ ایسا عملی طور پر نہیں ہوتا، اس لیے کسی ادب کی تفہیم میں سماجی اور تہذیبی نشیب و فراز یا تاریخی تجزیے کی بات بیکار کا عمل ہے۔ ایسے معترض ادب کی تخلیق اور انسانی ذہن کی پسند ناپسند اور اس کے طریق کار کی انفرادیت کو پس پشت ڈال کر یہ کہتے ہیں کہ اگر سب حالات ایک جیسے ہیں تو ہر تخلیق مشین سے نکلتے ہوئے بٹن یا سوئی کی طرح برابر ہونی چاہیے۔ اور چوں کہ ایسا نہیں ہوتا اس لیے ادب کو سماجی، اقتصادی یا تاریخی حالات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ادب تو ادیب کی صرف انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تھوڑی دیر رک کر اس مسئلے پر غور کرتے ہیں۔ یونان میں جب سماج کی تقسیم شریفوں اور غلاموں کی تقسیم پر ہوئی، تو ہر طبقہ کی نفسیات بھی ایک خاص ڈھنگ کی بننا شروع ہوئی۔ ادب کے اظہار میں صرف ایک طبقے کو برتری حاصل رہی اور صرف اسی کے محسوسات اور نظریات ادب کی اظہاری صورتوں میں ڈھلتے رہے۔ غلامی انسان کا لازمی مقسوم ہو گئی۔ یہاں تک کہ اسلام کے دور تک غلامی کی تقریباً وہی شکل رہی۔ اسلام بھی فوری طور پر کوئی انقلابی تبدیلی اس نظامِ فکر میں نہ لا سکا۔ لیکن تاریخ کے بدلتے ہوئے انداز نے یہ باور کرا دیا کہ یہ نظامِ حیات نہ تو مناسب ہے اور نہ اس کی بقا ممکن ہے۔ اس لیے حالات اور تہذیب اور عرب کی عادتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلام نے غلام کے آزاد کرنے میں ثواب بتایا اور سماجی تبدیلی یوں ہوئی کہ غلام کی اولاد آزاد رہے گی اسے جو نسلی اور نسبی طور پر غلام سمجھا جاتا رہا ہے یہ سماجی اصول اب مسلمانوں میں باقی نہ رہے گا۔ یا جاہل عرب میں جو ماں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی رسم تھی کیوں کہ ماں بھی، باپ کا ترکہ بیٹے کے لیے سمجھی جاتی تھی اس کا سختی سے استیصال کر دیا گیا۔ اب ادب الجاہلی میں جو غلاموں اور کنیزوں کے متعلق جذبات اُبھرے، یا امراء القیس اور عمرو بن کلثوم کی شاعری میں جو عرب کے ایسے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے وہ اسلام کی ترویج کے بعد باقی نہ رہا، بلکہ ممنوع قرار پائی۔ یہ ممانعت سیاسی نہ تھی بلکہ سماج کے بدلتے ہوئے نظریات سے آئی تھی۔ اسلام میں اگرچہ شاہی کا کوئی تصور نہ تھا مگر مسلمانوں میں اقتدار کے خواہاں، خلافت کو شاہی میں تبدیل کرنے لگے۔ مگر مسلم عوام کو خوش رکھنے کے لیے انہوں نے خلافت کی رسم بھی جاری رکھی۔ اس میں پھر

دیم ظلّ اللّٰہی و کبیری کا عروج ہوا اور بادشاہ کے اقتدار کا اندازہ ' غلامانِ دربار
کرنے کی تعداد سے لگایا جانے لگا۔ تصوف جو ایک سادہ زندگی بسر کرنے اور
عوام دوستی سے شروع ہوا تھا اس میں تکلفات اور رعایت پرستی کا دور دورہ
ہونے لگا۔ دربار سے متعلق ہو کر اہلِ ایمان اور حامیانِ راہِ سلوک،
شرابِ معرفت پینے لگے، وہ شراب جو اسلام میں ممنوع قرار پائی تھی اس کے
تذکرے شعرائے بنی امیہ اور عباسیہ کے دور میں معرفت کے پردے میں
ہونے لگے۔ شعر و سخن جس میں خالص جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی اس
میں ذکر و فکر کے ساتھ عقلیت کا دور دورہ شروع ہوا۔ اعشیٰ، متنبی،
فرزدق، دعبل اور ابونواس کی تخلیقات میں ان کے دور کی آواز اور شعری
روایتوں اور تبدیلیوں کو بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ عباس مروزی سے
خیام اور خیام سے عارف قزوینی، ابوالقاسم لاہوتی، اور سایہ تک فارسی
شاعری میں جو فکر و نظر کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، وہ تاریخ، سماج اور
سیاست کو پسِ پشت ڈال کر نہیں سمجھی جا سکتیں۔ طبقے جو پیدا ہوتے
ہیں اور مٹ جاتے ہیں وہ اپنی نفسیات، اپنے عادات و اطوار انسانی سماج
اور فکر و نظر کی تاریخ اور تجربوں میں چھوڑ جاتے ہیں اور جب بھی کوئی نیا
شعوری تجربہ پایا جاتا ہے، انسانی فکر کا ماضی، وراثت کے طور پر نئے تجربوں
میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ انسانوں کا شعوری ارتقاء اپنی قدروں سے بھی
پہچانا جاتا ہے۔ جن کو پہچاننے کے لیے ہمیں تاریخ، سماج اور نفسیات
کی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے اور انہیں کے پس منظر میں ہر فکر اور ہر شعور
کا مطالعہ کرنا، رویّے کی پہچان ہے۔ اس طرح وہ یکسانیت کہیں نظر
نہیں آنے گی جس کا شبہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے۔ مادی زندگی کے ساتھ
تبدیلی آتی ہے اور یہ تبدیلی مختلف حالات میں اپنے تجربے کی سطحیں بدلتی
رہتی ہے۔ چھوٹی سطح پر اُتر کر ایک محدود وقت میں یہی تجرباتی قوت،
انفرادی فکر اور انداز میں ملتی ہے جو اپنے دور کے بڑے احاطے سے باہر
نہیں جاتی۔

اشارہ تھا، انیسویں صدی کے لکھنؤ میں ایک ہی وقت میں
خلیق، فصیح، دلگیر، ضمیر اور تھوڑے وقفے کے ساتھ دبیر اور انیس
موجود ہیں جن کے تہذیبی، سماجی اور اقتصادی پس منظر ایک بڑے
دائرے میں قریب قریب ایک ہیں، لیکن مرثیے کی شعری روایت اور
مزاج کو صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ یا محمد شاہ رنگیلے
کے دور میں دلی اور لکھنؤ میں وہ فروغ کیوں نہ ملا جو غازی الدین حیدر،
نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے
دور میں ملتا ہے۔ حفظِ مراتب گفتگو کا لہجہ، فکر کی بلندی، مقامی رسوم
کے اظہار کے طریقے، انہیں اس سماجی روایت اور تہذیبی صورتوں کو
سمجھے بغیر نہ پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان سب کے
باوجود اردو کا ادنیٰ طالب العلم انیس اور دبیر کی اپنی اپنی طرزِ پیش کش اور
انفرادی کوششوں کو بآسانی ایک دوسرے سے الگ کر کے بتا سکتا ہے جو
اظہارِ فن کے طریقوں اور حالات کے مطالعہ کی قوت اور اس کے اظہار پر
قدرت کی بات ہے۔ اس اظہار میں بہت سی چیزیں وقتی اور مقامی
دلچسپیوں کے بدلنے کے ساتھ فنا ہو گئیں، کچھ دور کے اور قدروں کے
بدلنے سے اپنی اہمیت کھو چکیں، لیکن انسانی ہمدردی کا جذبہ، ظالم اور
مظلوم کی داستان اور اس بیان کی دل میں اُتر جانے والی کیفیت آج
بھی مرثیوں میں باقی ہے۔ باقی تمام چیزیں روایت بن گئیں۔ بلنسکی نے
ایک مقام پر لکھا ہے کہ :۔

> "ادب کی پیشکش میں جو کچھ وقت کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے وہ اہم
> نہیں، اگرچہ وقتی طور پر اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اصلی
> چیز وہ ہے جو صدیوں تک انسانوں کی رہبری کرتی رہتی ہے۔
> خواہ وہ تاریخیت کی شکل میں ہو یا کسی دور کی تہذیبی زندگی کے
> ادراک کی صورت میں، یا اُس طاقت کی شکل میں جو کسی قوم کو اوپر
> اٹھانے میں کسی خاص وقت میں مددگار ہوئی ہو ایسا ادب یا ایسی
> تاریخیت وقت کے ساتھ فنا نہیں ہوتی۔"

مارکسی رویّہ، ادب کے دوسرے رویّوں سے اپنے مفہوم میں الگ ہو جاتا

ادب کے دوسرے رویّے صرف اس داخلیت کو تلاش کرتے ہیں جو کسی فن کار میں اس کے ذہنی رویّے کی شکل میں، اس کے مزعومات (whims) ہوتے ہیں جن کا اس دور کی نفسیات، تاریخ اور سماج سے واسطہ نہیں ہوتا۔

مارکسی ادب روایت پرستی کی ترغیب نہیں دیتا۔ اضافیت اور جدلیت مارکسی ادب کے سب سے اہم پیمانے ہیں۔ جن کے بغیر ادب کا صحیح محاسبہ نہیں کیا جاسکتا۔ مارکسی ادب انسان دوستی اور خیر پر زور دیتا ہے۔ عظیم لینن نے زندگی کو سب سے زیادہ خوبصورت کہا اور یہ کہا کہ — "حُسن ہی زندگی ہے" (the beauty is life) جس نے مارکسی جمالیات میں ایک نئے نقطۂ نظر کا آغاز کیا۔ یہ حُسن زندگی میں خود کفیل حقیقتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ محض ادبی آرائش سے نہیں۔ ادبی آرائش زندگی کی حقیقتوں کو جھٹلاتی ہے اور زندگی کے اصل حُسن کو اوجھل کر دیتی ہے۔ لیکن خود کفیل حقیقتیں جو استحصال سے نہیں بلکہ زندگی کی صالح قدروں کے ساتھ آدمی کو ملتی ہیں تو اس کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مسرت کی تلاش میں انسان کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا ہے اور یہی مسرت اسے زندگی کی بصیرت تک پہونچاتی ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری ادب کے اس رویّے کو ایک مناسب اور متوازن رویّہ کہتی ہے، باقی سب کچھ یک رخا، غیر متوازن اور مبہم ہے۔ یہ حقیقتیں باطن سے نہیں آتیں بلکہ باطن کے لیے زندگی کے بیرونیت اور مادی تجربوں سے آتی ہیں۔ یہ تجربہ حسن کا بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے کسالے کا بھی۔ لیکن ایسی حقیقت نگاری کے منکر اسے یوں پیش کرتے ہیں کہ زندگی کی وحدت میں مسرت اور اُمید کے ساتھ نا اُمیدی بھی شامل ہے۔ تو ناکامیوں سے کام لینا اور مایوسیوں کو حقیقت مان کر پیش کرنا بھی ادب اور زندگی کا دوسرا رُخ ہے اور اگر کسی کو صرف ناکامیوں نا اُمیدیوں اور نارسائیوں سے ہی دلچسپی ہے تو اسے بھی اپنی پسند کو زندگی سمجھ کر پیش کرنے کا حق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو اندھیرا پسند ہے تو اسے اپنی پسند کے اعلان کا پورا حق ہے لیکن اس کا یہ اعلان درست نہیں کہ اندھیرا ہی زندگی کی حقیقت ہے اور سب کچھ محض لغو ہے۔ ادب کا مارکسی رویّہ — ابھی تک کے انسانوں کی صالح اور مثبت قدروں اور نظریات کا حامل ہے اور وہ کہتا ہے کہ آج تک نارمل انسان، مسرت اور خوش آئند زندگی ہی کو تلاش کرتا رہا ہے۔ اس لیے ایک نارمل زندگی، حسین حقیقت اور حظ تلاش کرتی ہے۔ Morbidity اور مریضانہ تصورات، زندگی کا مقصد نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ انسان اپنی زندگی میں ارتقاء اور بہتر زندگی کی تلاش میں بہت دنوں تک جی لیا، اب اسے تنزل کی فکر کرنا چاہیئے۔ تنزل بھی زندگی کا ایک رُخ ہے۔ دنیا میں بہت رہ چکا اب اسے زندگی کی چہل پہل چھوڑ کر، حرماں نصیبی اور تنزل حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور جوگیوں کی طرح انسانوں کو چھوڑ کر جنگل اور پہاڑوں کی کھوہ میں چلا جانا چاہیئے کہ آخر وہ بھی گرہست اور بان پرست کے بعد زندگی کی ایک منزل ہے۔ لیکن ابھی تک ایسے تنزل تلاش کرنے والوں کی عملی جماعت نظر نہیں آتی وہ جو اپنے کو Decadent کہتے تھے وہ بھی شعر و ادب کی منزل میں چاہے جیسے تجربے کرتے رہے ہوں مگر عملی زندگی میں وہ کبھی تنزل کے خواہاں نہیں ہوئے کم از کم مجھے کوئی ایسا نارمل انسان نہیں ملا جو اپنے تنزل کا خواہاں ہو۔ اور خوشیوں کو ٹھکرا کر صرف غم کی تلاش کرتا ہو۔ نیکی کے ساتھ بدی انسان کی مجبوری ہے لیکن بدی کو سراہنا اور نیکیوں سے گریز کرنے کو باعث افتخار کوئی نہیں کہتا۔ جو اصلاً بد ہیں وہ بھی چاہتے ہیں کہ انہیں نیک نام مشہور کیا جائے۔

ادب میں صرف بدی، صرف محرومیاں اور خوشیوں سے بھاگ کر

1_ Poetry begins in delight and ends in wisdom. Robert Frost.

سرورِ غم کو تلاش کرنا، نارمل انسانی ذہن کا منصب نہیں، یہ ایک طرح کی اعصاب زدگی (Neorosis) ہے مارکسی ادب اور ادیب کا ایسے ذہن اور اس کے پیدا کردہ ادب سے کوئی واسطہ نہیں، مارکسی ادیب ایسے غم، ایسی محرومی اور ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیش تو کرتا ہے مگر وہ اس کا طرفدار نہیں ہوتا۔ وہ Morbidity اور Abnormality کو ادب کی سچی تصویر اور اس کے سہارے زندگی کی حقیقی پیشکش نہیں سمجھتا جبکہ غیر مارکسی ادیب جدت کی تلاش میں اس Morbidity اور Abnormality (اداسی، مایوسی) کو ادب اور زندگی کا ایک نیا تجربہ سمجھتا ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ "کھیل ختم ہو چکا"[1] "بادشاہ مر چکا"[2] "گوڈو نہیں آئے گا"[3] "انسان اپنے سروں پر سینگ اگا کر فنا کے غاروں کی طرف روانہ ہو چکے ہیں"[4] "اب زندگی میں کچھ نہیں رہا اس لیے اب آخری سانس کا انتظار کرو" "پلیگ"[5] ہی زندگی کی حقیقت، فنا کی نیند سو جاؤ۔ "امید افزا اور خوش آئندہ زندگی کا انتظار کرنا انسان کی تحقیر ہے" کیوں کہ انسانیت کی قلب ماہیت (Metamorposis) ہو چکی ہے[6]۔ زندگی کی خوش آئندہ کہانی یا امید محض دھوکہ ہے اور یہ حقیقت نگاری نہیں بلکہ خیال پسندی ہے کیوں کہ کوئی شئے اب زندگی میں دلچسپی پیدا نہیں کر سکتی۔ نہ زندگی کوئی ایسی شئے ہے جس میں دلچسپی لی جا سکے۔ مارکسزم اس اظہار اور اعلان کو حقیقت نگاری نہیں مانتی۔ مارکسی ادیب کے نزدیک حقیقت صرف مادی ہوتی ہے یا مادہ سے اس کا علاقہ ہوتا ہے کیوں کہ بغیر مادے کے خیال کا بھی وجود ممکن نہیں۔ یہ بات حالی نے بھی مقدمہ میں کہی تھی اور مارکسی حقیقت نگار بھی کہتے ہیں۔ اس میں کسی بھی طرح کی دوئی نہیں اور نہ کسی مارکسی ادیب کے یہاں اس سلسلے میں اقرار انکار کی کشمکش ہے اور اگر کہیں ایسی بات ہے تو مارکسزم کی تفہیم میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ مادے کی ترقی اور اس کی تفہیم کی جیسے جیسے پرتیں کھلتی جاتی ہیں، روحانیت اور مذہب کے بہت سے توہمات دور ہوتے جاتے ہیں۔ کم از کم ایسے توہمات جو لاعلمی اور جہالت کے سبب، مذہب سے وابستہ کر دیئے گئے تھے سائنس کے انکشافات اور اپلائیڈ سائنس کے تجربے مادے کی طاقت کو روز بہ روز منواتے جاتے ہیں اور اس طرح زندگی کے بہت سے رموز و نکات انسانوں پر منکشف ہو رہے ہیں۔ مارکسی ادب اور ادیب اس حقیقت سے انسانوں کو وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کے تمام امکانات سے بہرہ مند اور لطف اندوز ہونے کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ زندگی سے صرف محرومیوں کا سبق لینے والے اپنے گرد و پیش پر ذرا نظر ڈال کر دیکھیں کہ انسان حیات ارتقار کی منزل ہے یا موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ کچھ لوگوں کو ذاتی محرومیاں ہو سکتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی مادے کے نئے انکشاف اور حرکت سے زندگی کے لیے بہتر وسائل اور صورتیں مہیا کرتا جاتا ہے۔ بیل گاڑی سے ریل گاڑی پھر ہوائی جہاز، جمبو جیٹ اور راکٹ کی خلائی پرواز سے چاند تک پہونچ لینا، انسان کا ارتقاء ہے، زوالِ آدم خاکی نہیں۔ انسان ارتقاء کی منزل میں ہے۔ اسے محرومی کی طرف کھینچنے والے ایک طرف تو محرومیوں، نارسائیوں اور تنہائی کا رونا روتے ہیں۔ مادے کی اہمیت کا انکار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف مادے اور سائنسی انکشافات کے برکات سے فیض یاب بھی ہوتے رہتے ہیں۔ وہ جو مذہب کو اصلِ حیات اور زندگی کی سچی حقیقت سمجھتے ہیں وہ بھی اور جو خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں وہ بھی ان فیوض سے فائدہ اٹھاتے ہیں، آج کوئی مذہبی پیشوا مہیش یوگی سے لیکر سیدنا برہان الدین تک ایسا نہیں جو ریل، ڈاک، تار، ہوائی جہاز، موٹر، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو وغیرہ کا استعمال نہ کرتا ہو۔ کوئی

---

1. END GAME 2. EXIT KING 3. WAITING GODOT 4. RHENOSROS
5. PLAGUE 6. KAFKA'S METAMORPHOSIS

ان اینٹی ہیرو جوان چیزوں کا استعمال چھوڑ دے کہ یہ سب مادّے اور سائنس کے کرشموں سے وجود میں آئے ہیں ۔ یا کوئی اندھیرے اور محرومیوں کو زندگی کی اصل حقیقت سمجھنے والے ادیب ہی ان تمام چیزوں کا استعمال نہ کریں کہ ان کے استعمال سے زندگی کی طرف ان کے نقطۂ نظر کا بطلان ہوتا ہے ۔ یہ سب کچھ انسان کے ذہنی ارتقاء کا ثبوت ہیں ۔ جبکہ ان کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ انسان ختم ہو چکا ہے، اس کی تمام صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں ۔ صرف محرومیاں باقی ہیں اور یہی آخری صداقت ہے ۔ بس یہیں سے مارکسزم کا اختلاف شروع ہوتا ہے ۔

مارکسزم کسی آخری صداقت پر یقین نہیں رکھتی بلکہ انسان کے روز افزوں تجربے نئی نئی صداقتوں کو تلاش کرتے جاتے ہیں اور زندگی کا متناہی اور تغیر پذیر یہ سلسلہ جاری و ساری ہے ۔ مارکسزم نہ تو انسانوں کو روایتوں کا اسیر بناتی ہے اور نہ انہیں تجربے کرنے سے روکتی ہے ۔ اور نہ جبریت کی قائل ہے ۔ جو فلسفہ عملی زندگی میں جبریت کا قائل نہ ہو وہ فکر پر جبر کے پہرے کیوں کر بٹھا سکتا ہے کہ فکر عمل کی پہلی منزل ہے ۔ انسان ایک محشرِ خیال ہے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ ۔ صرف اپنے تحت الشعور یا کسی لمحاتی موڈ یا نیوراتی کیفیت کو اصل انسان کا مزاج تصور کر لینا اور اس بہانے پورے سماج کے مزاج کو اس لمحاتی موڈ اور نیوراتی کیفیت سے آسیب زدہ خیال کرنا نہ سماج کا صحیح ادراک ہے اور نہ اس کے فکر و فن کا مناسب اندازہ ۔ ہاول (HOWL)، کاسٹل (CASTEL) یا آؤٹ سائڈر کی فکر ہماری فکر اور ہمارے مسائل کی بازگشت نہیں ہم اس سماجی انتشار سے دوچار نہیں ہیں جن سے یہ تخلیقات گزرتی ہوئی دکھائی جاتی ہیں ۔ بُعدِ مکانی کے ساتھ جذباتی ادراک، مسائلِ حیات، تہذیب، رسم و رواج طریقِ زندگی اور بُعدِ زمانی کی ایک بلند دیوار ہمارے درمیان حائل ہے ۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھے بغیر کسی ادب پر محاکمہ کرنا، کم نظری کی دلیل ہے ۔ تاریخی جذباتی اور شعوری ارتقاء میں بہت سی باتیں شخصی ہو سکتی ہیں مگر مجموعی طور پر ارتقاء کی یہ منزلیں ملک گیر پیمانے پر آتی ہیں جس سے فرد کے ذہن کی آبیاری ہوتی ہے اور وہ اپنے انفرادی ارتقاء اور شعور کی جہتیں تلاش کرتا ہے ۔ ذہنی رویّہ پہلے کسی قوم اور کسی سماج کا بنتا ہے اور تب حالات اور امکانات کے تحت افراد اپنے جذباتی اور فکری ذہن کی تشکیل کرتے ہیں پھر بعد کو جمالیاتی اور ادبی قدریں بھی انہیں حالات کے تحت، انہیں راستوں سے بنتی ہیں ۔ یہ انفرادی، اجتماعی venture ہوتا ہے شخصی نہیں ۔

مارکسی نقطۂ نظر تاریخ اور حالات کو بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ کسی فردِ واحد یا ادیب کا کوئی محاکمہ اس کے حالات سے اسے کاٹ کر نہیں کیا جاتا ۔ وقت اور تاریخ ادیب کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں، تب جا کر تخلیق صورت پذیر ہوتی ہے ۔ پھر ادیب خود بھی حالات کے تحت بدلتا جاتا ہے ۔ لینن اسی لیے تاریخی نقطۂ نظر کو بے حد سائنٹیفک اور عملی اصول سمجھتے تھے ۔ 1919ء میں ایک لکچر میں انہوں نے کہا تھا کہ سب سے اہم چیز ہے

"TO examine every question from the stand point of law the given phenomenon arose in history and what are the principal stages in its development, and from the stand point of its development, what it has become to day"

(Lenin's Collected works. v. 29, P. 473)

اگرچہ ذہنی انقلاب تاریخ کے لیے پہلے راستہ بناتا ہے لیکن پھر بھی تاریخی حالات ذہن کو ایک نئے انقلاب کے لیے تیار کرتے ہیں ۔ روایتیں تاریخ کا مردہ حصّہ ہیں لیکن تاریخیت ایک زندہ عضو کی طرح حالات کا Re-Assessment کرتی رہتی ہے جو ادیب کے ذہن کو اپنی روشنی اور انجام کی وراثت دے کر نئے تجربوں کے لیے اکساتی رہتی ہے اسی لیے مارکسی نقطۂ نظر ہر ماضی میں ترقی پسندی اور ہر ترقی پسندی میں ماضی کے تہذیبی اور سماجی وسیلوں سے کام لیتا رہتا ہے ۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے تاریخی موڑ ہندوستانی

ادب اور خصوصاً اردو ادب کے مزاج کو جو عوامل ایک نئی سمت کی طرف گامزن ہونے میں مدد کرتے ہیں ان کے نمونے اردو کے ادبی سرمایے میں بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ ؎

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے ـــ (غالب)

صرف قافیہ پیمائی اور حدیثِ دل نہیں "رنجِ گراں نشیں" اور "صبرِ گریز پا" غالب کے دور کی تاریخ اور ان کے سماجی حالات کا انتشار بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس شعر کو ایک تمثالی فکر سمجھنا چاہیے۔ یہ مجرد تصور اور نادر ترکیبوں کا اظہارِ خیال نہیں۔ ان کی فکر کا پرتو غالب کی شاعری میں موقع نکال کر ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جس میں محسوسات کی حیرت ناکیاں اور محرومیاں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ حضور شاہ میں شعر و سخن کی آزمائش ہے، تاکہ غزل میں غالب کا قلم جو مختلف اشعار میں تصویریں پیش کرتا ہے وہ ان کی محرومی اور مجبوری کی تصویریں ہیں جو ان حالات کی پروردہ ہیں جن میں غالب گرفتار رہے تھے۔ ان اشعار میں محسوسات نے حالات کو تقریباً متشکل کر کے اپنے درد و غم کے اظہار کے لیے راستہ نکالا ہے۔

میرا مطلب ان اشعار سے ہے ـــ ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

یہ اشعار روایتی نہیں۔ یہ اس وقت تک پیش نہیں کیے جا سکتے جب تک کہ شاعر بہ حیثیتِ خاص "خارجی" سماجی حالات سے دوچار نہ ہو۔ انہیں اپنی تفصیلات میں جذب نہ کر چکا ہو۔ ایسے ہی حالات سے ایسی حسی تصویریں تجربے کا سلسلہ پر اتر سکتی ہیں اور جن سے خود شاعر اور سامع دونوں کی نفسیات مرتب اور متاثر ہوتی ہے تب جا کر تصویر اپنا دائمی اثر قائم کرتا ہے۔ حالات کی بے یقینی، پورے دور کا استفہامیہ بن کر "دار و رسن" کی آزمائش" اور "تلخیٔ کام و دہن" سے عہدہ برآ ہونے یا ان کا شکار ہو جانے کا سوال اٹھاتی ہے اور اسی طرح یہ تصویریں اپنی جاذبیت اور Telling character ہر دور کے لیے باقی رکھتی ہیں۔

انقلابِ فرانس، صنعتی انقلاب اور روسی انقلاب نے ذہن کو بدلنے اور ایک نئی عقلی جہت اور فکر حاصل کرنے کے لیے جو جست کی ہے، اس سے متاثر تخلیقات اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ڈکنس انگریزی زبان کا پہلا ناول نگار ہے جس نے انگلستان کے متوسط طبقے اور عوامی زندگی میں خود کو اس طرح ڈبو لیا کہ اس کے ناول، اس کی ہمدردیوں اور کچلے ہوئے طبقے کے احساسات کا مظہر بن گئے۔

فیکٹری کے مالکوں کی بددماغی اور مزدوروں کی یونین سے بے اعتنائی، Poor Law، WORK HOUSE SYSTEM، بچوں سے لاپروائی برتنا، حکومت کا غریبوں کے مکانوں کی فکر نہ کرنا، سماج سدھار کی طرف سے بے توجہی، انہیں تمام باتوں سے ڈکنس نے اپنے ناولوں کے لیے مواد فراہم کیا تھا۔ اس نے متوسط طبقے کی زندگیوں کا مطالعہ عمیق نظر سے کیا تھا۔

"انہیں اپنا کچھ کر کے انہیں سطح پر لا کر انہیں تاثرات کے ساتھ معمولی زندگیاں، جنہیں کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ڈکنس کے فکری اظہار کا مرکز بنتی ہیں۔ اس کی حقیقت نگاری کی اندرونی سطح میں روح کی تذلیل کرتی ہوئی مفلسی کی شعوری تصویریں متحرک رہتی ہیں۔ اپنی ابتدائی زندگی کے ناقابلِ فراموش تجربے تھے جنہیں اس نے اپنی حقیقت نگاری میں ڈھالا تھا جو اس کی فنکاری کی کامیابی کا راز بن گئے۔"[1]

انقلابِ فرانس اور صنعتی انقلاب کے اثر سے اس دور کے فکر و فن میں عوامی زندگی سے یہ دلچسپیاں پیدا ہوئیں، جنہیں پس منظر میں رکھے

---

1. History of English literature by Cazamian 1971 Edition P. 1130 —

into their heads"

(collected works P.P. 78-79)

یہ بات اُن جلد بازوں کے لیے کہی گئی تھی جو ایک رات میں سوشلسٹ کلچر لے آنا چاہتے تھے۔ لینن کا انتباہ تھا کہ کلچر ایک تخلیقی عمل ہے جو مسائل کی تحلیل کے بعد، سخت محنت، مستقل کوشش، تلاش اور تاریخی تجربوں سے سبق سیکھنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ادبی قدروں اور ادبی مزاج میں بھی تبدیلی انہیں راستوں سے ہوتی ہے اور مارکسزم ان تبدیلیوں اور اس کے بدلتے ہوئے کردار پر نظر رکھ کر محاسبہ کرتی ہے۔

فرانس کا کلچر بالزک جتنا پسند تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لا بیرے گوریو میں صفحات کے صفحات اس مٹتی ہوئی تہذیب کا مرثیہ معلوم ہوتے ہیں لیکن مارکس کو بالزک بے حد پسند تھا۔ اس لیے نہیں کہ مٹتی ہوئی تہذیب سے مارکس کو ہمدردی تھی، بلکہ بالزک کی حقیقت نگاری کے لیے اور اس تاریخی بہاؤ اور موڑ سے سبق حاصل کرنے کے لیے جس نے فرانس کے صدیوں کے کلچر کو فنا کر دیا۔ گویا بالزک کی تحریریں مارکس کے لیے فسانۂ عبرت نہیں نئے سوشلسٹ کلچر کی تعمیر کے لیے اور اس نکتے کو سمجھنے کے لیے جس سے تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں اور پھر انہیں کی کوکھ سے نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ اُردو میں قاضی عبدالستار کے افسانے اور ان کا ناول "پہلا اور آخری خط" مجھے بے حد پسند ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے دریچے بھی جہاں اُردو کی تہذیب اور اس کے زوال کے نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ کیوں کہ ان صورتوں کو میں [illegible] تاریخ انسان کی اس حقیقت کی اہمیت سے باخبر ہوں لیکن [illegible] ان نقشوں کو [illegible] عظمتِ رفتہ کے سہارے [illegible] تہذیب سے جو اس مٹتی ہوئی تہذیب [illegible] ایسا ادیب [illegible] قاضی عبدالستار [illegible] ان تہذیب [illegible]

بغیر کوئی ڈکنس کے فکر و فن کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ انقلاب سے پہلے کے مایا کووسکی اور انقلاب کے بعد کے مایا کووسکی میں جو ذہنی اور تجرباتی سطح کا فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگوں کو انقلاب سے پہلے کی تخلیقات زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ لیکن ان تمام تخلیقات میں تاریخ کے بہاؤ اور دباؤ کا اثر صاف نمایاں ہے۔ بائرن کی رومانی شاعری کسی حد تک ایک فرد کے نجی مسائل کی شاعری ہے۔ لیکن نپولین کی جنگوں Holy Alliances اور یورپ میں ڈماکریٹس کی باہمی آویزشوں نے اس کے شعری رویے اور مزاج پر بڑا اثر ڈالا۔ اور اسے یہ محسوس ہوا کہ جذباتی اور فکری نظام پر تاریخ اور حالات کا بڑا دباؤ پڑتا ہے۔ عوامی تحریکات، سوسائٹی اور تاریخ کا رخ بدلنے میں بڑی طاقت بنتی ہیں اور تب جا کر چائلڈ ہیرولڈ پلگریمیج میں وہ شکل رونما ہوئی جس نے بائرن کے ذہن کو کچلے ہوئے طبقے کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور اس میں آمریت کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ بائرن کی شاعری میں Pantheism تلاش کرنے والوں کو بائرن کی اس باغی روح کو نہ بھولنا چاہیے جو انسانی حقوق کے لیے اسے میدانِ جنگ تک کھینچ لائی۔ اور جن کے لیے وہ میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

مارکسی فکر ادبی مزاج کی تبدیلیوں کا سرا کلچر سے بھی جوڑتی ہے۔ کلچر کا تعلق بہت کچھ قوموں کے مزاج اور تاریخ کے بہاؤ سے ہے جس میں تبدیلی انفرادی حیثیت سے نہیں آتی۔ اسے حالات، وقت اور تاریخ کا مبہم دباؤ مزاج بنا کر بدلتے ہیں۔ یہ تبدیلی اوپر سے لادی نہیں جا سکتی۔ ۱۹۲۳ء میں لینن نے جوان ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:—

"In matter of culture, haste and Sceping measures are most harmful. Many of our young writers and communists should get this well

پر افسوس کریں تو یہ غیر مارکسی رویّہ ہے۔ عصری ادب کے پچھلے شمارے میں ایک نوجوان اپنی کنول کا افسانہ "بند راستے" شائع ہوا۔ پھر الہ آباد کی ایک ادبی محفل میں علی گڑھ کے ایک نوجوان شارق ادیب نے ایک فسانہ.... سنایا۔ ان دونوں افسانوں کا موضوع بھی اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کا زوال ہے۔ لیکن یہ کہانیاں صرف زوال تک کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ اس مٹتی ہوئی تہذیب پر جو نئی تہذیب بننا شروع ہو گئی ہے، دیہات میں جو نئی تبدیلیاں آرہی ہیں، جو نیا مسلم سماج بن رہا ہے، جو نئی مفاہمت ہو رہی ہیں اسی کی کہانیاں ہیں۔ اور ظاہر کہ زندگی اور اس کی پیش کش کی طرف ادیب کا رویّہ ہی ہمارے ادبی اقدار اور رویّے کا تعین کرتا ہے۔ زندگی کے ارتقاء سے محبت کی طرف، ادیبوں کی دلچسپیاں ہیں یا زوال اور محرومیوں کی طرف۔ تاریخ کے پیچ و خم کا اندازہ کیے بغیر یا ان سے گذرے بغیر ان تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ادب کے محاسبے کے وقت، مارکسی ادیب، تاریخ اور تبدیلیوں کے مطالعے اور ان کے اتار چڑھاؤ کو نظر انداز نہیں کرتا کیونکہ کوئی تخلیق عمل ان صورتوں سے الگ نہیں ہوتا۔

مارکسی ادیب تخلیقی عمل کی سریت اور اسرار و رموز کو علیحدگی ISOLATION میں نہیں سمجھتا بلکہ ہر تخلیق کا سلسلہ کسی نہ کسی نظریئے یا ادبی عقیدے سے وابستہ سمجھتا ہے۔ ادب ہو یا زندگی، بغیر وابستگی اور کمٹ منٹ، کے دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی سے لیکر جماعتِ اسلامی، اور جن سنگھ تک اور تصوف سے لیکر تصوریت (IMAGISM) اور ٹی ایس ایلیٹ کے ادبی نظریوں تک ہر جگہ کسی نہ کسی نظریہ، عقیدہ یا فنیشوں کا کارفرما ہے۔ رواقی فلسفیوں STOIES سے نطشے تک، جن میں افلاطون اور فیثا غورث بھی شامل ہیں سبھی اس نقطۂ نظر کے جاننے والے تھے کہ یہ کائنات ایک دائرے میں گھومتی ہے اور دنیا میں کچھ نیا نہیں ہے۔ سب کچھ تاریخ اور وقت کے ساتھ بدل بدل کر واپس آتا ہے۔ یہ فلسفی ہندسں اور ادیب جو کچھ پیش کرتے رہے اس نظریئے کے تحت پیش کرتے رہے اور اس نظریئے سے وابستہ رہے۔ شاہی سے نوکر شاہی اور فاشزم سے مارکسزم تک انسانی ذہن کی عجیب و غریب تاریخ پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں سیاسی اور ادبی سبھی طرح کے نظریات بنتے بگڑتے رہے ہیں۔ کیا بغیر وابستگی، جہد اور جہت کے کسی فکر کو فروغ مل سکتا ہے؟ نظریہ پہلے بنتا ہے اور سمتیں بعد کو متعین ہوتی ہیں۔ کسی طرف چلنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ چلنے والے کو اپنے گھر کی طرف جانا ہے یا بازار کی طرف۔ اس لیے تخلیقی عمل اپنی تکمیل کی منزل میں چاہے کتنے ہی پراسرار پردوں اور ذہن کے نہاں خانوں سے گذرے لیکن جب یہ تخلیقی فکر کی ادراکی سطح Congnative surface پر آتی ہے تو اپنی سمتیں اور اپنے مافی الضمیر کے ساتھ آتی ہے۔ یہ نہیں کہ تخیل کے دھندلکوں یا سریت کے اعماق میں اس طرح گم ہو جائے کہ قاری اپنے قاموسی علم، بصیرت اور ذہن رسا کے باوجود ہاتھ پاؤں مارتا پھرے لیکن کچھ اس کے ہاتھ نہ آئے۔

مارکسی ادیبوں نے سب سے زیادہ اس پر زور دیا ہے کہ تفہیم و ترسیل کی کھڑکیاں کھلی رکھی جائیں۔ اگر کوئی تاثر فکر اور انداز بیان قاری پر اپنے محسوسات کو منتقل نہیں کر سکا اور کسی پیشکش میں فن کار کی ہمدردیوں، اختلاف، سماجی جانب داریوں کا پتہ نہیں چلتا تو ایسا فن کار اپنے فن اور تخلیقی عمل میں ناکامیاب ہے۔ تخلیق کی سطح اگر ترسیل سے ہمکنار نہیں ہوئی تو ادب کی تخلیق ایک لایعنی عمل بن جاتا ہے۔ مارکسی ادیبوں نے اس نقطے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، احمد ندیم قاسمی، فیض، سردار جعفری، محمد حسن اور قاضی عبدالستار سب کی تخلیقات یہی نتیجے برآمد کرتی ہیں۔ پھر مارکسی نقطۂ نظر قدیم ادب کی تفہیم کے لیے بھی انہیں معیاروں پر اصرار کرتا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر طبقاتی طرفداری کا بھی قائل ہے۔ اگر اس سے سماجی مفاد وابستہ ہوتا ہے وہ غیر مارکسی ادیبوں کی ادبی خوبیوں کو بھی سراہتا ہے۔ اگر ان سے زندگی کا کوئی گوشہ منور ہوتا نظر آتا ہے۔ مارکس کی طرح اینگلز بھی بالزاک کو بیحد پسند کرتے تھے۔

بالزک کے متعلق ایک جگہ انھوں نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے :۔

" بالزک سیاسی عقیدے میں شاہیت کا ازروئے قانونی حامی ہے لیکن اس کی اعلیٰ تصانیف اس وقت کی اچھی سوسائٹی کے زوال کے مرثیے ہیں، اس کی ہمدردی اس طبقے کے ساتھ ہے جو موت کی دستاویز پر اپنی مہر لگا چکا ہے۔ بایں ہمہ اس کے طنز اور زہرخند میں شدت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ اس طبقے کے مردوں اور عورتوں کا ذکر کرتا ہے جنہیں وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے یعنی شرفا۔ اس طرح بالزک گویا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی طبقاتی ہمدردیوں اور سیاسی تعصبات کے خلاف قدم اٹھائے اور اس ضرورت کو محسوس کرے کہ اس کے محبوب شرفا اس انجام کے مستحق تھے۔ میں اس چیز کو حقیقت نگاری کی سب سے بڑی فتح سمجھتا ہوں "

(ترجمہ : ممتاز حسین از نقد حیات)

اس نقطۂ نظر کے ساتھ جب مارکسی نقاد اردو کے کلاسیکی فن پاروں کو جانچنے بیٹھتا ہے تو فسانۂ آزاد کا مطالعہ وہ نتیجے برآمد کرتا ہے جو "نوچی ایک مطالعہ" کی شکل میں احتشام حسین، "اردو شاعری کا مزاج اور غالب کی شکست کا تجزیہ" میں ممتاز حسین اور "دلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر" میں ڈاکٹر محمد حسن نے کلاسکی ادب کی نئی تفہیم سے نتیجے برآمد کیے ہیں۔ حال ہی میں جامعہ ملیہ کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر اطہر انصاری نے اردو کے شہر آشوبوں کو تاریخی تجزیئے اور تاریخ کے مارکسی مطالعے کی روشنی میں پیش کیا ہے جس سے شہر آشوبوں کے مطالعے کے لیے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس طرح "نظریہ" اور "وابستگی" سے مارکسی ادیب اور نقاد نہ صرف نظریہ سازوں اور ادب کے نقادوں کو خالی نہیں سمجھتا بلکہ ان فن کاروں کو بھی کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے وابستہ سمجھتا ہے جو "وابستگی اور نظریہ" کا انکار کرتے ہیں۔

مارکسی ادب میں سب کچھ زندگی کے رشتے ہی سے کہا جاتا ہے، جو اقتصادی صورتوں سے لیکر اندرونی و بیرونی طبقاتی جنگوں تک اپنے دائرے کو وسیع کیے ہے۔ اس میں اس محدود حلقۂ فکر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو کہتا ہے کہ "ادب کی ایک بالکل آزاد زندگی ہے جس پر حالات یا اقتصادیات، تاریخ وغیرہ کسی کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ادب "محض جذبات اور نفسیات کی ملی جلی شکل سے وجود میں آتا ہے"۔ مخالفت اور موافقت سے الگ ہو کر سوچا جائے تو سب کا رشتہ زندگی سے ٹوٹتا نہیں۔ زندگی جو ہر لحظہ تغیرات سے دوچار ہوتی رہتی ہے اپنی فطرت اور جبلت بھی جلد یا بدیر بدلتی جاتی ہے اور طبقات اپنی بقا کے لیے جہدِ مسلسل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس کی توڑ پھوڑ (Morphology) میں یہ دائرہ نفسیات اور جذبات سے ہوتا ہوا پھر زندگی کے رشتوں میں جاکر مل جاتا ہے۔ اس بڑے دائرے کے لپیٹ میں چھوٹے چھوٹے بھنور وقتی اور لمحاتی دھند سے ابھرتے ہیں لیکن یہ بھنور اس بڑے دائرے کی لپیٹ سے باہر نہیں نکل پاتے جو زندگی اور اس کے طبقاتی وجود سے وابستہ ہے۔ میراجی، ن م راشد سے باقر مہدی، عمیق حنفی سے ظفر اقبال تک سارے ذہنی اور فکری اتار چڑھاؤ زندگی اور فن سے اس کے رشتوں کے محور کو نہیں چھوڑ پاتے اور جہاں یہ ذہنی فکر اپنے مدار سے الگ ہو جاتی ہے، وہاں تخلیقات گونگے کا گڑ بن کر رہ جاتی ہیں۔ مارکسی ادب میں تخلیق کا سرچشمہ زندگی ہے اور ادب کی توجیہہ زندگی سے الگ ہو کر نہیں کی جاتی اور اس مطالعہ سے جو بھی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسے من و عن پیش کرنا مارکسی نقاد اپنے مطالعے کا فریضہ سمجھتا ہے۔ اس کی توثیق کے لیے چند مثالیں بھی دیکھتے چلیں۔ باقر مہدی کے مجموعے "ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں" میں ایک بچے کی آواز کا ایک بند ملاحظہ ہو :۔

امیر شاعر

پرانے نعروں، ہزار چالوں سے

انقلاب کو قید کرنے کی فکر میں ہیں

انہیں بتا دو کہ سرکشوں کو تمہاری ہر چال کی خبر ہے
ہماری آواز بازار کے شور میں گم کبھی نہ ہوگی،
گم کبھی نہ ہوگی۔

اس نظم کے عنوان سے لیکر نظم کے آخری مصرعے تک سیاسی اور سماجی حالات کا جو انتشار ہے اسے پس پشت ڈال کر کوئی نظم کی اندرونی اور بیرونی دونوں آوازوں کو نہیں پا سکتا۔ انقلاب کو قید کرنے کی فکر میں کون ہے! اور سرکش کون لوگ ہیں جو تمام چالوں سے واقف ہیں، ان باتوں کا تجزیہ کیے بغیر نظم سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

پریم چند کی تخلیقات میں فن اور زبان کے بہت سے کھانچے ہیں۔ پریم چند، جہاں تک فن کی ہیئتی صورتوں کا تعلق اور کسی حد تک موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں بھی، اوپری طبقات کی دلچسپیوں اور معیاروں کی تسکین نہیں کر پاتے لیکن پریم چند نے ہندوستان کی تحریک آزادی اور اس وقت کی ملی کشمکش سے رشتہ جوڑ رکھا تھا۔ انہوں نے چوگان ہستی، میدان عمل اور گئودان میں جو کچھ پیش کیا ہے اسے چھوڑ کر کوئی منشی فیاض علی کے انور اور شمیم یا سرشار اور راشد الخیری کے ناولوں سے ہندوستان کی سماجی اور اقتصادی کشمکش میں پھنسی ہوئی زندگیوں کا اگر اندازہ کرنا چاہتا ہے تو وہ ہندوستان کی اصل زندگی کے دھارے سے کٹ کر کم آب چشموں میں خود کو قید کر لیتا ہے۔ اس وقت کے ہندوستان کی زندگی کا اندازہ مرزا سجاد بیگ دہلوی کے "دلفگار" اور "تمنائے دید" مجنوں گورکھپوری کے ناول "زیدی کا حشر" ہمایوں مرزا کے "خواب پریشاں" یا نیاز فتح پوری کے "شہاب کی سرگزشت" یا "ایک شاعر کا انجام" سے نہیں ہو سکتا۔ ایک مارکسی ادیب اور نقاد کو اس فرق کو سمجھنا لازمی ہے۔

ہندوستان کے عوام کی متحرک زندگی کی تصویریں، پریم چند کے ناولوں ہی میں ملیں گی۔ اور یہی عصری آگاہی اور وقت کا شعور ہے۔ یہ باخبری، زندگی کو فیض پہنچانے والے ادیب کے لیے لازمی ہے۔ بیدی

کا پان شاپ، دس منٹ بارش میں، کرشن چندر کا خونی ناچ، حسن اور حیوان، کالو بھنگی، مہالکشمی کا پل، منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون اور بابو گوپی ناتھ، اور عصمت کا کیڈل کورٹ، جڑیں، ناول ٹیڑھی لکیر سب عصری شعور ہیں ــ جبکہ صادق سردھنوی، مائل ملیح آبادی، نسیم حجازی، رشید اختر ندوی، ایم اسلم، پروفیسر کرشنا کماری، بیگم شاہنواز اور ان کا ناول حسن آرا، ضیا بانو کے ناول فغان اشرف، انجام زندگی، خاتون اکرم وغیرہ عصری شعور کی نمائندگی نہیں کرتے، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی کسی نہ کسی زندگی کی نمائندگی تو کرتے ہی ہیں۔ یہ بات وہی ہوئی کہ کوئی رائیڈر ہیگرڈ اور پیری میسن سیریز کے لسٹ سیلرز ناولوں کو ای، ایم، فارسٹر، شولاخاف، ہمنگ وے اور بالزک کے مقابلے میں اہم سمجھے کہ اول الذکر بھی تو کسی نہ کسی طبقے کی نمائندگی تو کرتے ہیں۔ وہ تعداد میں بھی زیادہ چھپتے ہیں اور انہیں زیادہ لوگ پڑھتے بھی ہیں، ان میں جملوں کی ساخت اور چٹپٹی یا تجزیاتی باتیں بھی بہت ہوتی ہیں لیکن پرکھنے کی چیز یہ ہے کہ زندگی کی طرف ان ناول نگاروں کا مجموعی رویّہ کیا ہے ــ اگر فن کا اندازہ صرف محاورے، روزمرّہ، اچھی تشبیہات اور تراشے ہوئے استعاروں سے ہی لگایا جاتا ہے تو انشا اور رنگین کے ساتھ ساتھ شاگردانِ آتش و ناسخ سے بہتر چاروں کھونٹ برابر شاعری کس کے یہاں مل سکتی ہے؟

ہر دور کے ادبی مسائل میں ان باتوں کو سمجھے بغیر کوئی شخص اس دور کی دانشورانہ جستجو میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ادب میں یہی جستجو اور تفہیم، مارکسزم کا ادبی معیار متعین ہیں۔ کوئی ادبی صداقت سماجی صداقت کے بغیر نہ اثر پیدا کرتی ہے اور نہ اس میں وہ جادو جاگتا ہے جسے تخلیق کی بلندی اور فن کے کیف و کم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سماجی صداقتیں ہی احساس کی رگوں کو چھوتی ہیں اور اسی وجہ سے فکر میں بالیدگی آتی ہے۔ جس کسی شاعر یا ادیب میں سماجی صداقت کو تہذیب کر کے بیان کرنے کا فن جتنی چابکدستی سے سمویا ہوا ملے گا، اسی قدر اس میں شعری اور

اَدبی صداقت گہری، اثر انگیز اور صدیوں کو عبور کرتی ہوئی انسانوں کے ساتھ باقی رہتی ہے۔ مسلمانوں کے بکھرتے ہوئے تار و پود اور انگریزوں کی ہندوستان پر حکومت کے دباؤ سے پیدا ہوئے ذہنی کچوکوں نے وہ احساس پیدا کیا جس نے خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ اور ذوق و شوق کو جنم دیا ورنہ پیارے صاحب رشید کی فنی بناوٹ نگار کی شاعری، اقبالؔ کی شاعری سے اس معاملے میں وقیع اور مزیّن (Decorated) شاعری ہے۔ اچھی شاعری اچھے فن اور احساس میں گہرائی، عظیم موضوع اور بلند مسائلِ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ فن کا جادو بھی خالص فنی اور شعری صداقت سے نہیں جاگتا کیوں کہ شعری صداقت مسائلِ حیات سے الگ ہو کر عظمت اور اثر انگیزی نہیں پیدا کر سکتی، ورنہ مومنؔ اور ذوقؔ غالبؔ سے بڑے شاعر ہوتے اور اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی اور محسنؔ کاکوروی کا فنی کمال لکھنؤ کے پورے شعری سرمائے پر بھاری ہوتا۔

مرثیے کے عروج کا سبب ایک خاص دور میں، سیاسی اور معاشی انتشار کے راستوں سے آئی ہوئی مذہبی احیائیت بنتی ہے۔ جس پر میرانیسؔ کے محسوسات کی جذباتی اور فنی گرفت اسے وہ عظمت بخشتی ہے جو کسی اور سے ممکن نہ ہو سکی۔ یہی فنکار کی انفرادیت ہے، جو انسانی ذہن کی پراسرار طاقت اور فرد کے آئی۔کیو (I.Q.) سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جن حالات نے ایک خاص موضوع کو خاص ڈھنگ اور فن کے ایک خاص معیار سے گزارنے پر شاعر یا ادیب کو مجبور کیا، اسے دور کی مجبوری یا صداقت جو چاہے کہہ لیا جائے کہ بغیر اس جبر کے فن عظیم نہیں ہوتا۔ میرانیسؔ کے مرثیوں میں فن کے ساتھ اودھ کی وہ تہذیب بھی بولتی ہے جو حفظِ مراتب، رکھ رکھاؤ، خودداری، عزتِ نفس اور فن کے مروّجہ معیاروں سے ہوتی ہوئی انفعالی طور پر فنا میں اپنے لیے بقا تلاش کرتی ہے اور کنجِ عزلت میں مثالِ آسیا گوشہ گیر رہنے کو شاہوں کے دربار جانے سے بہتر سمجھتی ہے۔ ان تمام باتوں کے پس پشت کیا ہے؟ اس کی کھوج اور اس کا تجزیہ کیے بغیر مارکسی نقاد، انیسؔ کے مطالعے میں کسی واقعی نتیجہ پر پہنچا، میرانیسؔ کی صحیح تفہیم نہیں سمجھتا۔ ان باتوں کی تلاش کے بغیر انیسؔ کا مطالعہ ناقص ہے۔

کسی بھی فن کار کا محاسبہ کرتے ہوئے، اس کے فن کے جادو سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ساتھ ہی ساتھ دفترِ تاریخ کے پیچ و خم، زندگی کے ادراک اور فن کار کے سماجی مزاج اور مروجہ فنی لوازم کو پس پشت ڈال کر فن جادو بن سکتا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ جو ادیب سڑک پر چلنے والوں کی آوازوں، اپنے دور کی روحوں کے اندرونی خلفشار اور عصری آگہی سے بے خبر ہے وہ کبھی ادب کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ پھر اسے ادب کے منبر سے نیچے اتر آنا چاہیے کہ وہ اس عظیم منصب کا حقدار نہیں ہے۔ ادب کا مقصد صرف جذبات کی بازآفرینی نہیں ہے۔ نہ ادب کا منصب صرف حظ اور تزئین ہے۔ اگر ادب نے اپنا رشتہ اپنے گرد و پیش سے توڑ لیا ہے تو ایسا ادب نا مناسب، غیر حقیقی اور گمراہ کن ادب ہے جو انسانوں کو — Organic wholeness سمیت ان کی دانشورانہ طاقت کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ادب زندگی کی تہذیب ہے۔ اسے صرف تحیر زا اور بے مقصد سمجھنا، کم نظری اور ادب کے صحیح منصب سے بے خبری کی دلیل ہے۔..

▲▲

ایک ضروری اعلان

ہم زبان کے لیے عصری ادبی مسائل پر مضامین بھیجیے — تعارف، انٹرویو، سوانحی خاکے اور شخصی مطالعے شائع نہ ہو سکیں گے۔

(ادارہ)

اقبال اور کلیم الدین احمد

حسین الحق
شاہ بازار، سہسرام (بہار)

میرا موضوعِ بحث کلیم الدین احمد کا مضمون "اقبال اور عالمی ادب" (مطبوعہ آہنگ) ہے۔ لیکن اُس کے متن کے بارے میں باتیں کرنے سے پہلے کچھ حاشیہ آرائی کرنا چاہتا ہوں اور اس حاشیہ آرائی کی ضرورت بھی میں اس لیے محسوس کر رہا ہوں کہ بنیادی طور پر میں خود بھی اقبال کے فکر و فن کے سلسلے میں اپنے آپ کو اُن کے معتقدین سے زیادہ ان کے معترضین کے قریب پاتا ہوں۔ لیکن اس مضمون کے مطالعے کے بعد مجھے کلیم صاحب سے اختلاف کے کچھ پہلو نظر آئے لہٰذا میں ایک عجیب اور دلچسپ صورتحال سے دوچار ہوں کہ اصولی طور پر کلیم صاحب سے متفق ہوتے ہوئے بھی جزویاتی تشریحات کے سلسلے میں اُن سے اختلاف کر رہا ہوں۔

اور اختلاف کی ضرورت بھی اس لیے پیش آئی کہ طالب علمانہ طور پر کلیم صاحب ہی کی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" اور "اُردو شاعری پر ایک نظر" سے اکتسابِ فیض کے نتیجے میں مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی ہے کہ تنقید، یہ جہاں غیر جانبداری شرط ہے وہاں کسی دعوے کے لیے دلیل بھی شرط ہے' کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ دوسری روشن حقیقت جس کا انعکاس مجھ پر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی فن کار کی خامیاں بیان کی جا رہی ہیں تو اس بیان کو نہ تو شرقیہ ہونا چاہیے اور نہ صرف "عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی خواہش کا عکاس" بلکہ واقعی، موضوعِ بحث فن یا فن کار کی خامیوں کے بارے میں ناقد کے دل کو بھی مطمئن ہونا چاہیے۔

تنقید صرف خارجی عمل نہیں ہے۔ تنقید کا تعلق تخلیق کی داخلیت سے اتنا ہی گہرا ہے جتنا خود خالق کا' لہٰذا جب تک، ناقد بھی خود اس تخلیق کے باطن تک نہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر خود ناقد کا باطن بھی وہی نتائج اخذ نہ کرے (جو خارجی عمل کے نتیجے میں پیش کیے جا رہے ہیں) اُس وقت تک ناقد کی تنقید میں وہ تنقیدی (یا تخلیقی) زور پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک (تخلیقی یا تنقیدی) فن پارے کی عظمت کا ضامن ہے۔

"اقبال اور عالمی ادب" میں کلیم صاحب کے ساتھ بھی یہی مشکل آن پڑی ہے کہ اس تنقید کا داخل اُن اختلافی پہلوؤں کا ساتھ دیتا نظر نہیں آتا جن کی طرف کلیم صاحب نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ بہرحال! جیسا کہ میں عرض کر چکا' میں متن کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے

تھوڑی سی حاشیہ آرائی کی اجازت چاہوں گا۔

میرے نزدیک اقبال کی فکر اور فن دونوں متنازعہ فیہ ہے۔ جہاں تک فکر کا سوال ہے اس پر کئی قسم کے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور جمیل مظہری ان کی "عسکری حسیت" سے شاکی ہیں، باقر مہدی اور اصغر علی انجینئر وغیرہ (بحوالہ جواز شمارہ ۱۳) اس بات پر نالاں ہیں کہ اقبال جیسے دانشور نے صرف اسلام کے ضمن میں باتیں کی ہیں۔ جو متذکرہ بالا حضرات کی نظر میں خود ایک سرمایہ دارانہ رویّہ رکھنے والا مذہب ہے، اور فراق اقبال کے ذہنی تضادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال ذہنی طور پر علاحدگی پسند یا فرقہ پرور ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ اور حضرات بھی اقبال کی فکر پر اعتراض کر چکے ہیں، ایک عام چلتا پھرتا اور بہت مشہور اعتراض اقبال پر یہ ہے کہ وہ اسلامی شاعر ہیں لیکن جب میں نے ان کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ وہ مسلمانوں کے شاعر تو کہے جا سکتے ہیں مگر اشیاء اور حیات کی طرف ان کا جو رویّہ ہے یہ رویّہ انہیں خالص اسلامی شاعر کے منصب سے نیچے گرا دیتا ہے، یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی شاعر اور مسلمانوں کے شاعر کے درمیان معنوی طور پر وہی فرق ہے جو اسلامی ملک اور مسلم ملک کے درمیان ہے۔

تو میں ان کی فکر کے سلسلے میں عرض کر رہا تھا، ایک اہم نکتے کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے کہ اقبال کے یہاں بعض غیر اسلامی افکار کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً شاہین ہی کے تصور کو لیا جائے۔ شاہین جو خصوصیات اقبال نے اپنی شاعری اور خطبات میں واضح کی ہیں اُن کے مطابق شاہین زندہ کھاتا ہے، اس زندہ کھانے کے رویّے کو اقبال کے اس شعر سے اور زیادہ تقویت ملتی ہے ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا یہ اک بہانہ

اور آپ اس رویّے کو اسلام کے نظریۂ رحمت کے مقابل رکھ کر غور کیجیے تو غالباً ہر اوسط فہم والا یہ تسلیم کرے گا کہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والے نبیؐ کا اسلام صرف لہو گرم رکھنے کے لیے جھپٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کے رویّے کی حمایت نہیں کر سکتا اور ایسا رویّہ رکھنے والے شاعر کو اسلامی شاعر کہنا قطعی غلط ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف باتیں کر رہا ہو۔

اُن کی فکر کا دوسرا متنازعہ فیہ پہلو حرکت سے متعلق ہے ۔۔ "تحرّک" اقبال کی کمزوری ہے۔ اقبال کو جہاں بھی تحرک نظر آتا ہے وہ اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں، حد یہ ہے کہ اس تحرّک کی تلاش میں وہ ہٹلر، مسولینی اور ابلیس کی تعریف میں بھی رطب اللّسان ہونے لگتے ہیں لیکن یہ رویّہ نہ تو صحت مند ہے اور نہ اسلامی، اسلام ہو یا کوئی بھی صحت مند اصلاحی، فلاحی یا مذہبی نظریہ کسی کے یہاں بھی "مجرّد تحرّک" کی حمایت کے نشانات تلاش نہیں کیے جا سکتے، بالخصوص اسلام میں صرف وہی تحرک معتبر ہے جو "تحرک بالخیر" ہو، یا "مجرّد تحرّک" کی حمایت کرنے والے کسی فرد یا کسی شاعر کو اسلامی شاعر کہنا خود اسلامی بنیادوں اور اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

اُن کی فکر کا تیسرا متنازعہ فیہ پہلو حضرت محی الدین ابن عربی اور حافظ کی مذمت سے متعلق ہے۔ گو کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی کتاب "حافظ اور اقبال" میں دونوں کے درمیان مماثلت کے بہت سے پہلو تلاش کیے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اقبال ابن عربی اور حافظ دونوں سے بہت خفا ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں مولانا روم اور حضرت مجدّد الف ثانی وغیرہ کی خوب تعریف کی ہے۔ اور ان بزرگوں سے فیضیاب ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے مگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض ایسے تصوّرات جن کی خاطر ابن عربی اور حافظ کو اقبال مطعون کرتے ہیں تقریباً ویسے ہی تصوّرات مولانا روم کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ابن عربی کے غیر اسلامی تصوّرات سے اقبال بہت خفا ہیں لیکن خود مولانا روم کے بہت سارے اشعار میں

وحدت الوجود کی حمایت کی وہ انتہا ہے جو انہیں ویدانت کے نظریۂ توحید کے قریب کر دیتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اصولِ فقہ کی بنیادوں پر وجودِ باری تعالیٰ کا ویدانتی تصور قطعی مُشرکانہ اور غیر اسلامی ہے، اور یہی نہیں بلکہ مولانا روم نے یہ کہہ کر
ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ایم
ما چو سبزہ بارہا روئیدہ ایم
واضح طور پر ہندو مذہب کے عقیدۂ تناسخ کی حمایت کی ہے، تعجب حیرت اس بات پر ہے کہ ابنِ عربی اور حافظ تو صرف اسی لیے مطعون کیے گئے کہ ان کے تصورات مشرکانہ اور غیر اسلامی تھے مگر ان ویدانتی تصورات کی موجودگی میں بھی مولانا روم کے آگے اقبال کا سر عقیدت سے خم ہو جاتا ہے اور یہ ان کے ذہنی اور فکری تضاد کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کی فکر کا یہ تضاد اس کی فکر کی کمزوری ہے قوت نہیں۔

اختلاف کا ایک اور پہلو اس کے یہاں علامتوں کے استعمال کے سلسلے میں نمایاں ہوتا ہے۔ موجودہ علامت نگاری کئی سطحیں رکھتی ہے اس کی ایک سطح تخلیقی بدل کی ہے، دوسری تمثیل انکار کی اور تیسری استعارے کی سرحدوں سے اشتراک کی۔ لیکن ہر علامت کے سلسلے میں ایک قدرِ مشترک ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ جو علامتیں کسی ایک شاعر یا مختلف شاعروں کے ذریعہ اپنے ایک مخصوص اور متعین معنوں میں استعمال کی جاتی رہی ہیں اب اگر انہیں کسی دوسرے معنوں میں استعمال کیا جائے تو یہ شاعر کا عجزِ بیان ہے۔ مثلاً جوئے شیر نکالنے کی ترکیب اپنی ابتدا سے ہی مشکل مہم سر کرنے کے ہم معنی ہے۔ اب اگر آج کوئی شاعر اسے دوسرے معنوں میں استعمال کرے تو یہ یا تو جوئے شیر کی پوری روایت سے ناواقفیت کا ثبوت ہوگا یا عجزِ بیانی کا۔

ایسی ہی ایک عجیب صورتِ حال سے اقبال کی شاعری کے مطالعے کے وقت واسطہ پڑتا ہے۔ مردِ مومن کے لیے اقبال نے چند علامتیں وضع کی ہیں مثلاً شاہین اور شہباز وغیرہ اور ظاہر ہے کہ وہ شاہین اور شہباز جو مردِ مومن کی علامت ہے بذاتِ خود ایک ایسی ہستی کی علامت ہے جو کمل ایمان، قوتِ خیر اور علم و دانش کا سرچشمہ ہے، کمزوروں کے کام آتا ہے، ظلم اور ظالموں کا قلع قمع کرتا ہے اور ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیتا ہے اور اب مردِ مومن کی علامت شاہین اور شہباز کی ان خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقبال کا یہ مصرعہ بھی ملاحظہ کریں کہ
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
اور غور فرمائیے کہ یہاں یہ شہباز کیا اس مردِ مومن کی علامت ہے جو مظلوموں کا ساتھ دیتا ہے یا اُس لٹیرے اور ظالم اربابِ اقتدار اور قوت کی علامت ہے جو مظلوم افراد اور قوموں کی علامت ممولے پر ہمیشہ جھپٹتا رہتا ہے۔

اور اس تضاد کو پیشِ نظر رکھیے تو اقبال کا سارا مردِ مومن، شاہین اور شہباز کا تصور سر کے بل کھڑا ہو جاتا ہے اور اس متضاد صورتِ حال میں ایک بڑا اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی فکر اس قابل ہے کہ اُس پر اعتبار کیا جائے؟

تو یہ تھی میری حاشیہ آرائی جس کی آرائش مندرجہ بالا صفحات میں کی گئی اور اس کی ضرورت جیسا کہ میں عرض کر چکا اس لیے پیش آئی تاکہ کلیم الدین احمد سے اختلاف کے صلے میں مجھے اقبال کے مریدوں معتقدوں یا مدّاحوں کی صف میں نہ رکھ لیا جائے۔

جہاں تک کلیم صاحب کا سوال ہے میں بھی اپنی پچھلی چار یا پانچ نسلوں کی طرح ان طلبائے علم میں سے ہوں جنہوں نے کلیم صاحب کی کتابوں سے اپنے ذہنوں کی تربیت کی ہے۔ اور کلیم صاحب کی میری نظروں میں اہمیت کی چند وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بت توڑے ہیں مُردوں کی پوجا نہیں کی ہے اور ان کے اس ابراہیمی رویّے نے یقیناً اُردو ادب کو بہت فائدہ پہنچایا اور اسی تاثر کے ساتھ میں نے ان کے مضمون "اقبال اور عالمی ادب" کا مطالعہ شروع کیا کہ یہ اس شخص کا مضمون ہے جس نے "اُردو تنقید پر ایک نظر

اور اُردو شاعری پر ایک نظم کے ذریعہ پورے اُردو ادب کے سوچنے کا انداز بدل دیا، مگر مضمون کے خاتمے پر عجب انفعالی کیفیت طاری ہو گئی اور بار بار یہی احساس ستاتا رہا کہ شاید اُردو تنقید کے ابراہیم کے افراد اب گُم ہو گئے ہیں۔

جہاں تک اقبال کے فن کا سوال ہے اُردو ادب میں اس سلسلے موافقانہ اور مخالفانہ دونوں قسم کی رایوں کا انبار لگا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جگن ناتھ آزاد اور عبدالمغنی جیسے اقبال کے عقیدت مند بھی اس بات پر اب خموشی اختیار کرنے لگے ہیں کہ اقبال کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں پیغام شعر پر اور مقصد فن پر غالب آگیا ہے، ہمارے سامنے مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ ے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

وغیرہ وغیرہ، ایسے اشعار کی اقبال کے یہاں کمی نہیں ہے۔ کرشن اور میر کی طرح اقبال کے یہاں بھی رطب ویابس دونوں ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ صرف ایسے کمزور اشعار کی بنیاد پر اقبال کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جاسکتا اور ان کے اچھے اشعار کی وجہ سے خراب اشعار اور بیانِ منظوم کی بہتات کا الزام اُن کے سر سے ہٹ سکتا ہے۔

بہرحال! بات جو بھی ہو لیکن جہاں تک کلیم صاحب کے اس مضمون کا سوال ہے وہ اپنے اس مضمون میں متضاد کیفیات کا شکار نظر آرہے ہیں اور آل احمد سرور کے "ہاں بھی اور نہیں بھی" والے انداز کے قتیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ تقریباً ساڑھے چھ صفحات کے اس مضمون میں کلیم صاحب نے صرف دو صفحات میں کچھ مغربی شاعروں کے حوالے دیئے ہیں، مغربی شاعری کی عظمت اور معیار کے بارے میں کچھ باتیں کی ہیں اور بار بار یہ کہا ہے کہ "اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں" کوئی مغربی شاعر اقبال سے متاثر نہیں اور نہ کسی نقاد نے اُن کی نظموں کی شعریت کی تعریف کی ہے۔ اگر اقبال کا کسی انگریزی شاعر سے مقابلہ کیا جائے تو ان کی اچھی اور کامیاب نظمیں بھی تنگ داماں نظر آئیں گی۔ وغیرہ وغیرہ — اور بقیہ ساڑھے چار صفحات اقبال کی نظموں کے حُسن اور اس کے فن کی باریکیاں بتانے کے سلسلے صرف کیے گئے ہیں۔ لہٰذا موجودہ صورت حال میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کلیم صاحب اقبال کی حمایت میں بول رہے ہیں یا مخالفت میں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ متنازعہ فیہ بات کلیم صاحب نے یہ کہی ہے کہ اصل معیار مغربی معیار تنقید اور مغربی معیار شاعری کا ہے۔ آج تک تو اُردو والے صرف مغربی ناقدوں اور فنکاروں کا نام بیچ بیچ کر دھونس کھاجاتے تھے اور اب کلیم صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مشرق کا سارا معیار ادب و تنقید بھی غلط؟

کلیم صاحب مغربی ادب کے عالم ہیں اور سُنا ہے کہ فرانسیسی بھی جانتے ہیں اور جدید ادب کے فروغ کے اس دور میں تو فرانسیسی جاننے والا نا قدار دو والوں کے نزدیک ارسطو سے تھوڑا ہی کم رہتا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے تو کلیم صاحب جو فرما دیں وہ مستند ہے مگر پھر بھی میں بصد ادب و احترام ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ معیار کی عظمتوں اور پستیوں کا یہ پیمانہ انہوں نے کیسے وضع کر لیا؟ اور جس پیمانے کی وہ بات کرتے ہیں اس پیمانے پر کونسا مشرقی فنکار پورا اُترتا ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ مغربی معیار ادب و تنقید کی شکل بھی نوبل پرائز کی ہے۔ چونکہ ان کی پروپیگنڈہ مشنری طاقتور اور بارسوخ ہے اس لیے خرد کا نام جنوں رکھ دیں یا جنوں کا نام خرد نوبل پرائز تو ملِ ہی جائے گا۔

اچھی شاعری میں جس طرح "تحتِ نغمہ" بھی کچھ رہتا ہے

اُسی طرح اچھی تحریر میں "تحتِ تحریر" بھی کچھ نہ کچھ چھپا ضرور رہتا ہے۔ بشرطیکہ اُس تحتِ تحریر تک پہنچا جا سکے۔ کلیم صاحب کی تحریر کی پختگی سادگی اور توانائی سے تو کوئی متعصب یا جاہل ہی انکار کر سکتا ہے۔ اور یہی توانائی اس "تحتِ تحریر" کو بھی واضح کر رہی ہے جسے کلیم صاحب احاطۂ تحریر میں نہیں لائے ہیں۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ یہ تحتِ تحریر مجھے بار بار اس کا احساس دلاتا ہے کہ شاید کلیم صاحب کا دل اقبال کی شعری عظمت کو تسلیم کرتا ہے مگر چوں کہ خود ان کے پیشِ نظر ان کا اپنا IMAGE " اردو شاعری پر ایک نظر" والا ہے جو کسی شاعر کو بخشتا نہیں ہے لہٰذا جب وہ اقبال پر لکھنے چلے تو حسبِ روایت انہوں نے ابتدا اقبال کی نفی سے کی لیکن کچھ ہی دور چل کر قلم کمبخت قابو سے باہر ہو گیا اور اقبال کی دس اردو نظموں ("خضرِ راہ"۔ "ایک آرزو"۔ "فرمانِ خدا" "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو"۔ "روحِ ارضی کا آدم سے خطاب"۔ "جبریل و ابلیس" "لالۂ صحرائی"۔ "شاہین" "ساقی نامہ") اور چھبیس فارسی نظموں کی تعریف میں وہ ناقد رطب اللسان ہو جاتا ہے جو بڑے بڑوں کو منہ نہیں لگاتا۔

اور ساتھ ہی ان کے بیانات کو بھی سامنے رکھیے کہ "یہ تجزیہ سرسری سا ہوگا" "یہ کام کچھ آسان نہیں اور اس مختصر وقت میں اس میں کامیابی معلوم"، "اس مہلتِ کم میں ان نظموں کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکتا" وغیرہ وغیرہ ــــ

اب دو باتیں غور طلب ہیں، اگر اس مہلتِ کم اور اس سرسری جائزے میں مجموعی طور پر چھبیس نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ تو اگر تفصیلی جائزے کی فرصت نکالی جائے تب کیا صورتِ حال ہوگی؟ اور دوسری بات یہ کہ چوں کہ کلیم صاحب مغربی معیارِ ادب و تنقید کی باتیں بار بار کرتے رہے ہیں تو انہیں تو اس زبان سے ضرور واقفیت ہوگی جو بقول کلیم الدین احمد ہی "مغربی تنقید میں مستعمل ہے" اور غالباً وہی زبان وہ اپنی تنقید میں استعمال بھی کرتے ہوں گے۔ لہٰذا اب اگر اسی زبان اور لہجے میں مختصراً اقبال کی چھبیس کامیاب نظموں کی تحسین کی جا سکتی ہے تو کیا تفصیلی مطالعہ کے بعد اقبال ان معیاروں پر بالکل پورے نہیں اتر سکتے ہیں جن کا تذکرہ کلیم صاحب نے کیا ہے؟

غالباً تب یہ سوال اُٹھے گا کہ پھر بھی تو یہ ساری بات "بہ زبانِ اُردو" ہوگی۔

تو میں بصد ادب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بھوبھوتی، کالی داس اور فردوسی کو مغربی ادب والے تسلیم نہ کریں تو کیا یہ بھوبھوتی، کالی داس اور فردوسی کے معیار کی پستی کا ثبوت ہے۔ یا مغربی نقادوں کی تنگ نظری اور کم علمی کا۔

لہٰذا یہ تو صحیح ہے کہ اقبال ہی نہیں اُردو کے تمام بڑے فنکاروں کی تخلیقات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیئے مگر اس رویّے کو من و عن تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مغربی زبانوں میں ان کے تراجم شائع نہیں ہوئے اور مغربی نقادوں نے اُن کی عظمت تسلیم نہیں کی تو ہمارے نزدیک بھی ان کی عظمت مشتبہ رہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کلیم صاحب جیسے ذی علم اور جیّد نقاد خود ہی مغربی شاعروں سے اقبال کا موازنہ کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ عالمی ادب کے پس منظر میں اقبال کا کیا مقام ہے:
اگر اس موازنے میں اقبال بالکل نیچے چلے جائیں تو بھی کوئی بات نہیں اور اگر سارے مغربی شعراء سے بھی بلند ہوں تو بھی کوئی بات نہیں۔

مگر بہرحال! مغرب سے مرعوب ہونے کا رویّہ صالح نہیں کہا جا سکتا

اور اب ایک آخری سوال کلیم صاحب سے کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صرف منفی رویّہ ہی تنقید کا صحیح رویّہ ہے ــــ؟؟

اور اگر ہے بھی تو ایسا رویّہ کس کام کا جس کی حمایت میں دلیل پیش کرتے ہوئے ساڑھے چھ صفحات کے مضمون میں ساڑھے چار صفحات صرف اپنے ہی دعوؤں کے رد میں صرف کر دیئے جائیں؟

▲▲

سرگوشی

رشید امجد
اے ۱۸۵ نانک پورہ — راولپنڈی (پاکستان)

پچھلے کئی دنوں سے میں شام کو بہت دیر سے گھر لوٹنے لگا ہوں،
چمکیلے راستوں اور نیم سنسان سڑکوں سے اب مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے جانے کیا بات ہے؟

اب گھر کی طرف واپس آتے ہوئے میں بار بار سہم جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے اس نیم سنسانی میں کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ مجھے ان راستوں پر رات گئے تک پھرتے رہنے اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر گھنٹوں دوستوں سے بحثیں کرنے کی پرانی عادت ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ یہ سڑکیں ان کی نیم سنسانی اور چمکیلے سائن بورڈ میرے وجود ہی کا حصہ ہیں۔ اور میں ان میں گھومتے پھرتے ہوئے اپنے آپ سے دور نہیں ہوتا۔ لیکن پچھلے چند دنوں سے میں خود کو علیحدہ اور بکھرا ہوا سا لگنے لگا ہوں جیسے ان سارے سنسان راستوں میں خوف گھات لگائے میرا انتظار کر رہا ہے اور میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کی بانہوں کی دسترس سے دور نکل جانے کی کوشش میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف آتا ہوں۔ چوک کا پہلا موڑ… تو ہا! میرے جسم پر کسی ان دیکھے ہاتھ کی پوریں دستک دیتی ہیں۔ میں اس موڑ سے بھاگ کر اور آنکھیں بند کر کے گذرنا چاہتا ہوں کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس کی بائیں دیوار کے ساتھ ایک شخص کیل میں ٹنگا ہوا ہے۔

میں شالیمار کیفے سے اٹھ کر حسب معمول بحث کرتا ہوا گھر آ رہا تھا۔ بڑے چوک میں اور جب دونوں اپنے اپنے راستوں پر مڑ گئے تو میں گھر کی طرف مڑنے والی سڑک پر ہو لیا۔ موڑ مڑتے ہی میری نظر اس پر پڑی۔ چاندنی کے پھیلے ہوئے دائرے میں وہ سامنے والی کچی دیوار کے ساتھ کیل سے ٹنگا ہوا تھا۔ کیل اس کے سینے میں سے ہوتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی تھی اور خون کی ایک پتلی سی دھار اس کے سینے کی گلی میں سے نکل کر اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان گم ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں کرب سے پھیلی ہوئی تھیں اور مٹھیاں تشنج کے مریض کی طرح سکڑ کر دیوار کی نیم گیلی مٹی میں کھبی ہوئی تھیں۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ خلا ہی میں رہ گیا۔ میں غیر ارادی طور پر چند قدم اس کے قریب آ گیا۔ دفعتاً اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں حرکت ہوئی اور ایک تیز سرگوشی میرے گرد جال بننے لگی۔

بسنو ــــ

لیکن میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔ کیوں کہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ جس کریانہ شاپ سے مجھے بچے کے لیے دودھ اُدھار لینا ہے اس کے بند ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔ گھر سے آتے ہوئے میری بیوی نے بڑی بے چارگی سے مجھے خالی ڈبہ دکھایا تھا، منہ سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی خاموشی کے پیچھے لفظوں کا ایک ڈھیر سسک رہا ہے۔ دراصل ہمارے لفظ اب اتنے پھیکے اور مرجھائے ہوئے ہیں کہ ہم انہیں ادا کیے بغیر ہی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں۔

دکاندار نے ڈبہ دینے سے پہلے پچھلے سودے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس خدشہ کا اظہار بھی کہ اس دفعہ میرے کھاتے میں رقم کا اندراج کافی زیادہ ہے۔ اسے ہمیشہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اُدھار کی رقم زیادہ ہو گئی تو میں پہلی پر کچھ بتایا نہ کروں۔ اسی لیے وہ کئی بار مجھے کہتا ہے کہ "فلاں چیز ختم ہو گئی ہے۔ اور اگر میں اسے کہوں کہ وہ سامنے ہی تو رکھی ہے تو وہ بڑے راز دارانہ لہجہ میں بتاتا ہے کہ یہ برانڈ جعلی ہے۔ اور بھلا مجھ جیسے رزق کے گاہک کو وہ ایسی گھٹیا چیز کیسے دے سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے کیوں کہ جب اسے کوئی چیز دینا ہوتی ہے تو جعلی کو بھی اصل ثابت کر دیتا ہے لیکن میری مجبوری اس سے اتفاق کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے سرمائے کی وصولی کی حدوں سے واقف ہے اور مجھ جیسے تنخواہ دار کی رسی کی لمبائی بھی جانتا ہے شاید اسی لیے پہلے دکاندار کے مقابلے میں وہ پچھلے پانچ سال سے اپنی جگہ نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کی دکان کا پھیلاؤ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

دودھ کا ڈبہ لیے جب میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو مجھے ایک لمحے کیل پر ٹنگے ہوئے اس شخص کا خیال آیا اور سرگوشی کا جال میرے گرد لفظ بننے لگا ——

"سنو ——!"

میں نے سر جھٹک کر اُسے دور پھینکنا چاہا، مگر میری بیوی اب سیڑھیوں کے وسط میں آ گئی تھی۔

"چائے بھی ختم ہونے والی ہے، صبح شاید ہی پوری ہو۔"

میں اُلٹے قدموں پھر دکان پر آیا، چائے کا ڈبہ لیتے ہوئے پھر وہی سرگوشی،

"سنو ——"

میں نے گردن موڑی،

"اس بار حساب کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے، دراصل قیمتیں بھی تو بہت چڑھ گئی ہیں۔"

"تنخواہ بڑھنے کی کوئی اُمید نہیں۔" میری بیوی دال کی پلیٹ میرے آگے کھسکاتے ہوئے مجسم سوال بن گئی ہے۔

اس کی خالی جھولی میں ڈالنے کے لیے میرے پاس کوئی لفظ نہیں۔ لفظ تو شاید ہیں لیکن مجھے خود احساس ہے کہ میرے یہ لفظ صرف بھوک ہی بھوک ہیں، چوسا ہوا بھوک۔

"تم تو کہتے تھے اس مہینے کے آخر میں اعلان ہونے والا ہے"

آج اس کی کمان میں سوال ہی سوال ہیں اور میرے پاس ڈھال ہے ہی۔

میں سر جھکائے کھاتا رہتا ہوں، بغیر کسی ذائقہ کے، بغیر کسی احساس کے، اور کیل سے لٹکا ہوا آدمی اپنی کرب زدہ آنکھیں پھیلا کر سرگوشی کرتا ہے۔

"سو جاؤ خاموشی سے۔" میں بیوی کی طرف پیٹھ کر کے خلاء میں اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے چہرے پر شناسائی کی لکیریں ڈھونڈتا ہوں اور انگلیوں پر وہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے گنتا ہوں جنہیں اس مہینے ابھی دکاندار سے اُدھار لانا ہے۔

اگلی رات میں "ا" اور "ب" دونوں کو وہ جگہ دکھاتا ہوں جہاں میں نے کیل میں ٹنگے ہوئے اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں خالی دیوار کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں، پھر مجھے —— اور چپ چاپ اپنے راستوں پر مڑ جاتے ہیں۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچتا ہوں اس پھیلے ہوئے شہر میں میں کس جگہ کھڑا ہوں۔

"میں کون ہوں؟" ـــ میں خود سے سوال کرتا ہوں۔

"سنو ـــ" سرگوشی شوکتی ہے۔

"میں کیا ہوں؟ ـــ اس شہر میں میں کس جگہ کھڑا ہوں" میرے چاروں طرف چمکیلے اور بوسیدہ دونوں قسم کے بورڈ اپنی اپنی کیلوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

"ان کے درمیان میں کیا ہوں؟"

"سنو ـــ"

مجھے یاد آتا ہے میں دکان کے باہر کھڑا ہوں۔ جانے کب سے، شاید جب سے میں پیدا ہوا ہوں۔ میں اسی دکان کے باہر کھڑا ہوں یا شاید میں پیدا ہی اس کے باہر ہوا ہوں، شاید میرا باپ بھی اسی کے باہر کھڑا رہتا ہوگا۔ تو کیا یہ دکاندار ہمیشہ سے یہیں ہیں۔ صرف میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں

سوال ـــ سوال ـــ سوال

لیکن میرے پاس تو پہلے ہی ڈھیر سارے سوال ہیں۔

میں چپ چاپ اندر جاتا ہوں گدی کے پاس چند لمحے رک کر دکاندار کے رویّہ اور ایمانداری کی تعریف کرتا ہوں۔ پھر اسے اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ اس کی قیمتیں بازار سے کم ہیں۔ مجھے معلوم ہے یہ سفید جھوٹ ہے۔ مجھ جیسا پیسے پر ادھار لینے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کم تولتا ہے اور بازار سے زیادہ قیمت وصول کرتا ہے لیکن میں کیا کروں جس رسّی سے بندھا ہوں اس کی ڈھیل یہیں تک ہے۔ آخر میں میں اس سے نمک کا ایک پیکٹ، چینی اور بلیڈ مانگتا ہوں وہ یہ چیزیں دینے سے پہلے پھر بقایا کے خدشے کا اظہار کرتا ہے۔ گھبراتے ہوئے میں سوچتا ہوں ان میں سے کوئی چیز فالتو نہیں۔ بلیڈ بھی نہیں۔ شروع شروع میں میں کئی کئی دن شیو نہیں کرتا تھا، لیکن میرا سپرنٹنڈنٹ کہتا ہے ـــ "یہ دفتری ایٹی کیٹس کے خلاف ہے"

سونے سے پہلے مجھے پھر اس شخص کا خیال آتا ہے خدا جانے وہ کون ہے کس نے اسے اس بیدردی سے دیوار پر لٹکایا ہے اور اب خدا جانے کون اسے اتار کر لے گیا ہے؟

سوال ـــ سوال ـــ سوال

اور مجھ جیسے لوگ تو ساری زندگی جواب ہی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

"سنو ـــ"

ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا ٹائپسٹ بڑے کرب کیساتھ مجھے دیکھ رہا ہے۔

ایک لمحے کیلئے مجھے گمان ہوتا ہے شاید اس نے بھی اس شخص کو دیکھا ہو۔

"تم نے کوئی سرگوشی سنی ہے؟"

میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں، وہ دونوں ہاتھ دبائے بڑی لجاجت سے سرگوشی کرتا ہے۔

"تمہارے پاس ایک روپیہ ہو تو ـــ دراصل میرے پاس واپسی کا کرایہ نہیں؟"

"سنو ـــ"

ہم کون ہیں اور اس شہر میں کہاں کھڑے ہیں؟

رات بھیگ کر تاریکی میں پوری طرح لتھڑ چکی ہے۔ میں اسی موڑ پر دیوار کے سامنے کھڑا ہوں۔ وہ میرے بالکل سامنے کیل سے ٹنگا ہوا ہے اور خون بوند بوند نیچے گر رہا ہے۔

"سنو ـــ"

سرگوشی میرے پاؤں میں پھندا ڈالے بیٹھی ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور بند مٹھیاں پھیل گئی ہیں۔ اس کی پھیلی ہتھیلیوں پر کھدی ہوئی دونوں تصویریں مجھے اچھی طرح نظر آرہی ہیں۔ ایک تصویر میری اور میری بیوی کی شادی کے موقع کی ہے۔ دوسری میں اس کی گود میں بچہ ہے۔ اور میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا ہوں۔ میں سر نیچے کیے ٹپ ٹپ

گرتی خون کی بوندوں کو دیکھ رہا ہوں ۔ میں سر اٹھا کر اس کا چہرہ نہیں دیکھتا ۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ۔

بسنو ـــ

سرگوشی سڑک پہ سے ہوتی ہوئی سارے شہر میں پھیلی جا رہی ہے ـــ

بسنو ـــ بسنو ـــ بسنو ـــ

پچھلے کئی دنوں سے میں شام کو جلدی گھر لوٹنے لگا ہوں ۔ چمکیلے راستوں اور نیم سنسان سڑکوں سے مجھے اب ڈر سا لگنے لگا ہے ۔ جانے کیا بات ہے اب گھر کی طرف آتے ہوئے میں بار بار سہم جاتا ہوں ۔ میرے کان ہر وقت کھڑے رہتے ہیں اور آنکھیں کسی کے انتظار میں کھلی ہوئیں ۔

جانے میرے کان کس خبر کو سننے کے منتظر ہیں اور میری آنکھیں کس کا انتظار کر رہی ہیں ؟ ▲▲

باہر کا مسافر

عبدالصمد

شعبۂ سیاسیات، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

........پہلے سُرخ بارش ہوئی پھر سفید ——— لیکن سفیدی سُرخی کو ذرا نہ دھو سکی۔ اس چیز نے مجھے چونکا دیا اور میں فوراً چوکس ہو گیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

میں تین طرف سے گھیر لیا گیا۔

میرے سامنے چند نشانات ہیں جو آگے جاتے ہوئے معدوم ہو گئے ہیں اور لاکھ آنکھ پھاڑنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ آگے ایسی تاریکی ہے جیسے کئی سورج کو ایک ہی وار سے قتل کر دیا گیا ہو۔

پشت پر ایک بہت ہی مضبوط دیوار کھڑی ہو گئی ہے جو میرے اتنی قریب ہے کہ میری پشت کے تمام اُبھرے ہوئے حصّے اس کی گرفت میں آ گئے ہیں اور میں بڑی مشکل سے سمٹا سمٹایا سا خود کو بچائے کھڑا ہوں۔

دائیں برف کا ایک پہاڑ ہے جس سے پھوٹتی ہوئی حرارت سے میرا بدن تپ رہا ہے لیکن اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے کیوں کہ بائیں جہنم کا دہانہ کھول دیا گیا ہے۔ آگ کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس کی تیز اور سرد لہریں میرے بدن میں چھید کیے دے رہی ہیں۔

راستہ صرف سامنے کا کھلا ہے لیکن صرف چند قدم ——— بہت زیادہ تگ و دو کروں بھی تو صرف چند قدم بڑھ پاؤں۔

میں چیخ رہا ہوں لیکن میری آواز کو پہاڑ نے لپک کر تھام لیا ہے اور اپنے بازوؤں میں چھپا لیا ہے۔ میں رو رہا ہوں لیکن میرے آنسو آگ نے موتی سمجھ کر چُن لیے ہیں۔

دایاں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو آنسوؤں کا کہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ آگ کے شعلوں سے میرا ہاتھ جھلس گیا ہے۔ ایک بہت ہی سرد اور ایک بہت ہی گرم ہاتھ کو اپنے بدن پر پھیرتا ہوں تو قوتِ برداشت روح کی طرح جسم سے نکل جاتی ہے اور میں بہت ہی بے ساختگی کی حالت میں بیٹھ جاتا ہوں۔

کچھ سکون کا احساس ہوتا ہے اور وہ بچھو الگ ہو جاتا ہے جو ٹخنوں کے بیچ میں چمٹ گیا تھا۔ لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے پہاڑ کا دامن اور آگ کی جڑیں زیادہ قریب ہیں تو کچھو پھر اپنی جگہ پر آ جاتا ہے۔

ایک بہت بڑا غضب ہوگیا ہے۔

غیر موجودگی سے فائدہ اٹھالیا گیا ہے اور برف اور آگ نے خالی جگہ پر قبضہ کرلیا ہے۔

میرا مخاطب حد ضروری ہے کہ میں دامن اور جڑ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں اپنی طاقت استعمال کرتا ہوں تو برف اور آگ میرے جسم میں چمٹ جاتے ہیں اور جسم کا ایک حصّہ بن جاتے ہیں لیکن مجھے اس کی مطلقاً پروا نہیں رہتی کہ میں بہرکیف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور مصمم ارادہ کرلیتا ہوں کہ کبھی تھکوں گا نہیں اور اگر ایسا ہوا تو بیٹھوں گا نہیں۔ اس طرح مجھے برف کی پروا رہے گی نہ آگ کی۔

دھم دھم کی آواز آرہی ہے۔

غالباً اوپر والوں نے کوئی حرکت شروع کردی ہے۔

اوپر والے ....

پتہ نہیں کیا صورتِ حال ہے ان کی ——— میں نے جب دیکھا تھا .... لیکن دیکھنے کی اہمیت بھی کیا ہے۔ اس کا بھروسہ بھی کیا ہے۔ میں نے خود کو کیا دیکھا تھا اور اب کیا دیکھ رہا ہوں۔

میں نے جب دیکھا تھا تب وہ ایک بہت اونچے محراب میں رہ رہے تھے جس میں بہت سی کھڑکیاں تھیں ——— وہ محراب دراصل اسی عمارت کا اوپری حصّہ تھا جس کے نچلے کمروں میں سے ایک میں میں رہتا تھا ——— رہوں۔

وہ کبھی کھڑکیوں سے نیچے جھانکتے نہ تھے اور ہم کبھی نظر اٹھاتے نہ تھے۔

ہم دونوں کی اس عادت نے درمیان میں ایک ایسی دیوار کھڑی کردی تھی جو کھڑی تو بہت مضبوطی سے کی جاتی تھی لیکن ڈھائی اس سے بھی زیادہ تیزی سے جاتی تھی۔

اب وہ دھم دھم کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں جیسے کچھ پیٹا جارہا ہو ——— پھر کچھ توڑا جارہا ہو اور اب ———

یہ تو ڈھانے والی بات ہے۔

دھم دھم، دھماکے میں تبدیل ہورہا ہے۔ چاروں طرف سے بس دھماکہ ہورہا ہے۔ ذرّے ذرّے سے دھماکے کی آواز پھوٹ رہی ہے۔

دھمک سے فضا لرزہ براندام ہے۔ ساری دنیا ——— میری دنیا لرز رہی ہے۔ میں لرز رہا ہوں۔ اس کیفیت میں کبھی دائیں ہوتا ہوں کبھی بائیں ——— دائیں برف کا سانپ لپکتا ہے۔ بائیں آگ کا شیر منہ پھاڑ دیتا ہے ——— پیچھے دیوار دھکے دیتی ہے ——— آگے نہیں ہونے ہی کے لیے میں نے سارا زور لگا دیا ہے اور اس طرح تین طرف کا سہہ کر ایک طرف کو بچا رہا ہوں۔

دھمک سے ساری فضا اکھڑ رہی ہے۔ چونے کی پرت کو دھوپ اپنے تیز دانتوں سے اُدھیڑ رہی ہے۔ برف کے ذرّے اور آگ کی چنگاریاں اُڑ اُڑ کر مجھ پر آرہی ہیں۔

یہ ذرّے نہیں ہیں بلکہ تودے ہیں۔

اور یہ چنگاریاں نہیں ہیں بلکہ گولے ہیں اور میرا نحیف و نزار جسم ہے۔ پشت کی دیوار سخت ہے۔ اچھا ہے جو وہ ایسی ہے ورنہ پھر میں کہیں کا نہ رہتا۔

دھمک اتنی تیز ہے کہ دیوار بھی اُچھلنے کی کوشش کررہی ہے۔

لیکن اس پر گرفت سخت ہے کہ کسی طرح وہ جمی ہوئی ہے۔

سارے میں زلزلے کی کیفیت طاری ہے۔ سارا ماحول ہل رہا ہے، ساری فضا کمزور سی ہوکر کسی کے ہاتھوں میں جھول رہی ہے۔

مجھ میں زلزلہ ہو رہا ہے، میں ہل رہا ہوں اور کسی کے ہاتھوں میں جھول رہا ہوں۔

یہ ساری باتیں برداشت کی مٹھی سے باہر نکلی جارہی ہیں۔
پیچھے نہیں جاسکتا کہ ایک سخت دیوار دھکے دینے کیلئے کھڑی ہے۔
دائیں نہیں جاسکتا کہ برف کا پہاڑ ———

بائیں نہیں جا سکتا کہ آگ کا سمندر ——————
آگے کا راستہ مخدوش ——————
صرف چند نشانات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جو نظروں کو صاف دھوکہ
دے گئے ہیں اور پھر ——————
انہیں روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں پوری طاقت سے انہیں پکارتا ہوں۔ گلے میں خراش پڑ گئی ہے اور رگیں
ابھر آئی ہیں لیکن کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہیں دیتا کیوں کہ کیفیات جوں کی توں
ہیں۔

پھر کوشش کرتا ہوں تو آواز واپس نہیں ملتی۔
لگتا ہے کہ آواز اپنا سفر شروع تو کر دیتی ہے لیکن راستے میں برف اور آگ
جیسے راہزن چھپے بیٹھے ہیں جو اپنا کام کر جاتے ہیں۔ مضبوط اور
اپنی جگہ پکی سے قائم دیوار بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔
زلزلہ ہلنے اور جھولنے کی کیفیت جاری ہے۔
میں تمام باتوں سے مایوس ہو کر اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم جانے
کی فکر کرتا ہوں کیوں کہ اس حالت میں جب کہ کوئی بھی چیز اپنی جگہ پہ
قائم نہیں ہے۔ سب سے بڑی فکر یہی ہے۔
لیکن ——— دائیں سے بچا جاتا ہے تو بائیں کی خیر نہیں
اور بائیں کی خبر لی جاتی ہے تو دائیں جاتا ہے۔
پشت پر کی سخت دیوار کسی صورت میں بچاؤ نہیں کر سکتی۔
اور آگے ———........ آگے سے تو بچنا ہی ہے۔
دائیں کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ مجھے اس کا شدت سے سامنا
کرنا پڑ رہا ہے کیوں کہ بائیں بھی منہ پھاڑے ہے۔ برف کا پہاڑ اپنی
جگہ سے کھسک کر مجھ پر چڑھا چلا آ رہا ہے۔ میں اپنی ساری طاقت اس
کو روکنے کے لیے لگا رہا ہوں لیکن پہاڑ پہاڑ ہے اور ذرہ ذرہ۔
پہاڑ کے ساتھ ساتھ اگر میں بھی اپنی جگہ سے کھسک سکتا تو اس
کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن وہاں تو آگ کا سمندر منہ پھاڑے ہے ——

اگر میں ذرا بھی کھسک سکتا تو آگ اور برف کے مقابلے کا ایک خوبصورت
تماشہ دیکھ سکتا تھا۔ اور ہر قسم کے جذبے سے عاری ہے۔
قریب تھا کہ میں پہاڑ اور سمندر کے درمیان پس کر رہ جاتا کہ
جیسے کسی نے بہت تیزی سے اچھال کر مجھے دیوار پہ پھینک دیا اور پھر دیوار نے
اتنی ہی تیزی سے مجھے جھٹک دیا۔ اور میں اچھل کر اس دروازے پر آ گرا
جو تاریکی میں گم ہو گیا تھا ——— اس کے اور میرے درمیان
صرف چند نشانات کا فاصلہ تھا اور جسے طے کرتے ہوئے میں آنا ڈر
رہا تھا کہ برف کے پہاڑ اور آگ کے سمندر کے سامنے بھی ڈٹا رہ گیا
تھا۔

پہاڑ اور سمندر آپس میں مل گئے ہیں اور ایک ایسی فضا ابھر کر
سامنے آ رہی ہے جو بالکل نامانوس ہے۔ میں سردی کا عادی ہوں'
گرمی کا عادی ہوں' ان دونوں کی ملی جلی کیفیت کا عادی ہوں لیکن
یہ فضا میرے لیے بالکل اجنبی ہے جس کی تخلیق کا سارا کرب مجھے ہی
جھیلنا پڑا ہے۔

میں نے جلدی سے کنڈی کھولی جسے میں نے اپنے ہاتھوں ہی
سے بند کی تھی اور باہر نکل آیا ہوں' باہر سکون ہے۔ زلزلہ تھم چکا ہے
لیکن ایک عجیب بات ہو گئی ہے کوئی بھی چیز اپنی جگہ پہ نہیں ہے۔
سورج اور چاند اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں۔
پہاڑ سمندر کی جگہ پہ چلے گئے ہیں اور سمندر پہاڑ کی جگہ پہ
کونے کے درخت درمیان میں آ گئے ہیں اور درمیان کے ویرانے
کونوں میں چلے گئے ہیں۔
میرے پڑوسی کا مکان جس کا سایہ میرے مکان پر
پڑتا تھا اور میرے مکان کا سایہ اس پر ——————
وہ میرے مکان کے سائے کے ساتھ دور چلا گیا ہے اور جو میں نے غور کیا
تو پتہ چلا کہ میرا مکان بھی اپنی جگہ پہ نہیں ہے اور اس نے میرے
پڑوسی کے مکان کے سایہ کو ڈھک لیا ہے۔

مجھے خود پر بھی شک ہونے لگا کیا، واقعی میں 'میں' ہی ہوں لیکن کوئی دوسرا ہے نہیں جو اس بات کا صحیح پتہ دے کیوں کہ سبھی جاننے والے گرد و بدل کے چکر میں دوسری طرف چلے گئے ہیں اور جو ادھر آئے ہیں وہ مجھے پہلے سے جانتے ہی نہیں ——

اسی پر حالت میں جوں توں کر کے میں نے پڑوس کے مکان تک کا فاصلہ طے کیا ہے۔

وہاں سناٹا ملا ہے۔ چند بے جان پتلے اپنی اپنی زبانیں ہاتھوں میں لیے کونوں میں کھڑے ہیں۔ میں اندر گھس جاتا ہوں۔ آنگن میں لکڑی اور کپڑوں کا بنا ایک بالشت کا پتلہ اوندھا پڑا ہے، اس کی پشت پہ بندھی ایک چھوٹی سی تھیلی سے چاول اور دال کے دانے نکل کر چاروں طرف بکھر گئے۔ اوپر مطلع کا چہرہ صاف ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ چپکی ہوئی ہے۔ ▲▲

منگل

والف گنگ باخرٹ

مناظر عاشق ہرگانوی

صدر شعبۂ اردو، مارکھم کالج، ہزاری باغ (بہار)

ہفتے میں ایک منگل ہوتا ہے۔ ایک سال میں باون منگل ہوتے ہیں اور جنگ میں کئی منگل آتے ہیں۔

اس منگل کو وہ بڑے حروف لکھنا سیکھ رہی تھی۔ معلمہ نے موٹے کانچ کی عینک لگا رکھی تھی، جس میں فریم نہیں تھا۔ عینک کے کانچ اتنے موٹے تھے کہ اس کی آنکھیں بے حد موٹی نظر آ رہی تھیں۔

بیالیس لڑکیاں بلیک بورڈ کی طرف دیکھ کر لکھ رہی تھیں۔

بوڑھے پرنسپل کے پاس ٹن کا ایک ٹیلر تھا۔ موٹی برتھا پیرس پہنچ گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں ہر باپ سپاہی ہوتا ہے۔

اولا نے زبان سے اپنی ناک کی نوک کو چھوا۔ معلمہ اسے تنبیہہ کر رہی تھی —

"اولا! تم نے "وار" لفظ کے بیچ کا حرف "او" بنایا ہے۔ لفظ "وار" کے بیچ کا حرف "اے" ہوتا ہے۔ جیسے "گریو" لفظ میں حرف "اے" ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے کتنی بار سمجھائی ہے"۔ معلمہ نے کاپی اٹھا کر اولا کے نام کے آگے کراس بنا دیا۔

"کل اچھی لکھائی میں اس جملے کو تم دس بار لکھ کر لانا۔ سمجھ گئی نا؟"

"ہاں —!" اولا نے کہا اور دل میں کوسنے لگی — جاہل، پرانی عینک والی"

باہر میدان میں پڑے روٹیوں کے ٹکڑوں کو کوّے نوچ رہے تھے۔

لفٹننٹ ایلرس کو بٹالین کمانڈر نے بلوا بھیجا۔

"ہر ایلرس، تمہیں اپنا لال رومال اتار دینا ہوگا"

یس سر!"

"اس طرح کا رومال کمپنی ۲ میں پسند نہیں کیا جاتا"

"تو کیا مجھے کمپنی ۲ میں بھیجا جا رہا ہے؟؟"

"ہاں — اور وہاں یہ رومال باندھنے سے تمہارا کام نہیں چلے گا۔ کمپنی ۲ کے لوگ ناپسند چیز کے سلسلے میں سخت برتاؤ کرتے ہیں۔ پوری کمپنی تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔ کیپٹن ہیس اس قسم کی کوئی چیز نہیں پہنتا تھا"

"کیا نیس زخمی ہو گئے ہیں ؟"

"نہیں نہیں، بیمار ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جب سے کیپٹن ہوا ہے نیس بہت سخت پڑ گیا ہے۔ اچھا ایلرسن میرے پرانے دوست، وہاں پہ ذرا ہوشیار رہنا۔ نیس نے انہیں اچھی ٹریننگ دلائی ہے اور وہ رومال باندھنا چھوڑ دو۔ ٹھیک ہے نا ؟"

"بالکل ٹھیک ہے سر"

"ہاں اور رات کو اندھیرے میں تم لوگ جلتی ہوئی سگریٹوں کا ضرور خیال رکھو گے۔ ان چمکتے جگنوؤں کو دیکھ کر کسی بھی نشانے باز کی انگلیاں حرکت میں آسکتی ہیں۔"

"یقیناً سر"

کمپنی ہال کے لیے جاتے وقت سارجنٹ ایلرسن نے اپنا رومال ہٹا دیا۔

پھر سگریٹ سلگا کر اس نے اعلان کیا "کمپنی کمانڈر ایلرسن"

اور ایک گولی داغی۔

ہر ہینسن نے ذرا لینن زیور سے ریشے سے کہا ——

"ڈارلنگ ہمیں اب نیس کے لیے دوبارہ کچھ بھیجنا چاہیئے۔ کچھ سگریٹ، کچھ کھانے کی چیزیں اور کتابیں، یا شاید دستانے کے جوڑے یا ایسی ہی کوئی چیز۔ وہاں بڑے بہت سخت سردی کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے اس سخت سردی کا اندازہ ہے۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم اس کی کتابیں بھیج دیں، ہر ہینسن ؟"

"نہیں! —— یہ تو بالکل غلط ہوگا۔ ہمیں کچھ ہلکی پھلکی کتابیں بھیجنی چاہئیں۔ والٹ وِٹمین یا اسی جیسے دوسرے مصنفوں کی کتابیں۔ نیس کو ہلکی پھلکی کتابیں پسند نہیں، کیوں ؟"

"ہاں —— وہ پڑھ کر ہنسنا بھی خوب ہے۔"

مسز ہینسن نے کہا ——

کیپٹن نیس کو اسٹریچر پر ڈال کر وہ ڈلاؤزنگ اسٹیشن لے گئے۔ دروازے پر ایک نوٹس لگا ہوا تھا:

جنرل ہو یا گرینیڈیر یہاں سب کی حجامت بنتی ہے۔ اس کی بھی بنا دی گئی۔ میڈیکل اردلی کی انگلیاں پتلی اور لمبی تھیں، جیسے مکڑی کے پاؤں۔ انگلیوں کے جوڑ کچھ لال سے ہو رہے تھے۔ انہوں نے کیپٹن نیس کے جسم پر کوئی چیز مل دی جس سے دواؤں کی دکان جیسی بو آرہی تھی۔ پھر مکڑی کے پاؤں جیسی انگلیوں والے اردلی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ایک موٹی کتاب میں نوٹ کیا:

نبض: ۱۱۶ —— بے سدھ یعنی غفلت

اندازہ: ٹائیفس بخار

میڈیکل اردلی نے موٹی کتاب بند کی۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

اسمالکس ملٹری اسپتال — چھوت کی بیماریوں کے لیے

اور اس کے نیچے لکھا تھا: چودہ سو مریضوں کے لیے

اردلیوں نے اسٹریچر اٹھایا۔ زینے پر ہر سیڑھی چڑھتے وقت اس کا حجامت شدہ سر کمبل کے نیچے ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ اس بات کے لیے اسے روسیوں پر بڑی ہنسی آئی تھی۔ ایک اسٹریچر اردلی کو زکام ہو گیا تھا۔

فراؤ نیس نے پڑوسی کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ جب دروازہ کھلا تو وہ خط کو سنبھال رہی تھی۔ اسے کیپٹن بنا دیا گیا ہے۔ کیپٹن اور کمپنی کمانڈر بھی۔ اور وہاں درجۂ حرارت ۴۰ ڈگری تک گر گیا ہے۔ خط نو 9 دن بعد یہاں پہنچا ہے۔

اس نے خط اوپر اٹھا کر دکھایا۔ لیکن پڑوسیوں نے اس پر غور نہیں کیا۔

بریگیڈ ڈاکٹر نے چھوت کی بیماری والے اسمولنسک اسپتال

کے چیف میڈیکل افسر سے پوچھا ـــــــ

"روزانہ کتنے جاتے ہیں؟"

"نصف درجن"

"یہ تو عجیب بات ہے" بریگیڈ ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں، ہے تو سہی" چیف میڈیکل افسر بولا۔ بات کرتے وقت وہ ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

وہ میوزک فلوٹ بجا رہے تھے۔ فادفیس ہونٹوں پر سرخی لگائے ہوئی تھی۔

نرس الزبتھ نے اپنے ماں باپ کو لکھا ـــــ "منگل کو مدد کے بغیر اس سے بچ کر نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

لیکن جب جونیر میڈیکل افسر آیا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنا جھک کر چلتا تھا جیسے اس نے سارے روس کا بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھا رکھا ہو۔

"کیا میں اسے کچھ نہیں دوں؟" ـــــ نرس نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ میڈیکل افسر نے جواب دیا۔

اور پھر وہ کیپٹن غیس کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ باہر زمین پر دھم سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ وہ ہر بار انہیں اس طرح زمین پر ٹیک دیتے ہیں۔ مرے ہوئے انسان کو کیا وہ آہستگی سے زمین پر نہیں رکھ سکتے؟

"وہ ہمیشہ انہیں اسی طرح ٹیکا کرتے ہیں" ان میں سے ایک نے کہا اور اس کے پاس کھڑے کسی آدمی نے گانا شروع کر دیا۔

"جونیر میڈیکل افسر ہر مریض کو دیکھتا گیا۔ وہ ہر روز ہر مریض کو دیکھتا تھا جیسے اس نے سارے روس کا بوجھ کندھے پر اٹھا رکھا ہو۔ باہر اسٹریچر اردلی کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑا" "نمبر چار" ایک نے کہا ـــــ "نمبر چار کو تو زکام ہے"

شام کے وقت اولا اپنے گھر میں بیٹھی بڑے حروف میں لکھ رہی تھی۔ جنگ کے وقت سارے باپ سپاہی ہوتے ہیں۔

اس نے یہ بات بڑے حروف میں دس بار لکھی اور "وار" لفظ کے بیچ کے حرف "اے" کو "گریو" کے "اے" جیسا لکھا ـــ

▲▲

وزیر آغا

سول لائنز ۔ سرگودھا ۔ (پاکستان)

بیکراں وسعتوں میں تنہا

سفر میں ہوں اور کھڑا ہوں
میں چاروں سمتوں میں چل رہا ہوں مگر کہاں ہوں
وہیں ۔ جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نب سے گرا پڑا ہے ؟
میں خود بھی شاید کسی قلم سے گرا ہوا ایک سُرخ قطرہ ہوں
زندگی کی حسین جبیں پہ چمکتی بندیا سی بن گیا ہوں
مگر میں بندیا نہیں ہوں شاید کہ وہ تو تقدیس کا نشان ہے
دلوں کے دھاگوں کی اک گرہ ہے
گرہ ___ جو صدیوں میں بننے والے حسین رشتوں کا آسرا ہے
جو آنے والی تڑپتی صدیوں کی ابتدا ہے
گرہ تو بخشش ہے بشریوں کا مسافروں کا نئی نویلی رفاقتوں کا،
محبتوں کا، اذیتوں کا
مگر میں تنہا ہوں ___ بے کراں وسعتوں میں تنہا
سفید ماضی، سفید فردا، سفید یہ لمحۂ عبادت
کہ جس پہ کوئی نہیں عبارت
سفید ماتھے پہ سُرخ دھبہ ہوں
ابتدا، انتہا کے دھاگوں سے کٹ چکا ہوں !
میں سُرخ دھبہ ہوں
کپکپاتے مہیب عکسوں کا سلسلہ ہوں
تمام چہرے جو تیرے اندر سے جھانکتے ہیں
مرے ہی چہرے کی جھلکیاں ہیں
مرے ہی سینے کی دھڑکنیں ہیں
یہ تیز رنگوں کے تند دریا
جو دکھ کے کوہِ گراں سے رس کر
زمیں کی بنجر اداس سی سلطنت کو چھو کر
اِس ایک بے انت سُرخ نقطہ کے بحرِ ظلمات میں گرے ہیں
مرے ہی بے نام دست و پا ہیں
یہ جگمگاتی سی کہکشائیں جو ابتدا سے
خلا کی ظلمت میں قید باہر کو اڑ رہی ہیں
گرہ میں بنی ہیں
وہیں کھڑی ہیں
وہیں ___ جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نب سے گرا پڑا ہے
وہ ایک قطرہ جو میرا دل ہے
جو میرے عکسوں کا سلسلہ ہے
جو میرے ہونے سے سُرخرو ہے
جو میری پابستہ آرزو ہے !!

محسن بھوپالی

محسن منزل۔ ۴ الف ۱۳/۵ اے، ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

وہ بانسری خموش ہے

کرشن چندر کا قلم
وہ بانسری تھا
——— جس نے امن و آشتی کی لے میں
زندگی کو اک نئے سفر سے آشنا کیا
توہمات کو خیال و فکر کی ڈگر سے آشنا کیا
سسکتی مخلوق کو عظمتِ ہنر سے آشنا کیا

وہ بانسری خموش ہو گئی مگر
وہ لے امر ہے ——— جو
حیات کو نیا شعور دے گئی!
نئے زبور دے گئی!!

عالمتاب تشنہ

پاکستان

ٹرانسپیرنٹ

پھڑپھڑاتا ہوا اک پرندہ
زمیں پر گرا
جسم پر جا بجا گولیوں کے نشاں
خون میں تر بتر
اور پرندے کی وہ موت سے قبل کی جاں کنی
اس شکاری کے ذوقِ ضیافت کی تصویر تھی
جس کی بندوق کی گولیاں
توڑ کر رشتۂ جسم و جاں
چھوڑ کر اپنی بے رحمیوں کے نشاں
ہو گئیں مرقدِ آسماں کی مکیں
(اور میں) اس پرندے کی آنکھوں کی زندہ چمک
دیکھ کر ڈر گیا
مجھ کو وہ سارے جانباز یاد آ گئے
گولیاں جن کے سینے سے ہوتی ہوئیں
وقت کے جسم میں گڑ گئیں
اور جن کا لہو
بابِ تاریخ پر سرخیٔ عہدِ نو بن گیا۔

حرمت الاکرام

رام باغ ۔ مرزا پور ۔ (یو پی)

دیوالی کی شام آنے تک

ذہن کی معصومیت کلبِ بے زباں احساس میں ڈوبا ہوا
سونپ کر بچپن کو خوش انجام کھیلوں کا شعور
مانگتا ہے توتلے خوابوں کا بے پروا غرور
جیسے جیسے آتی ہے نزدیک دیوالی کی رات
ایک بے صوت و صدا ذوقِ پذیرائی لئے
خوشنما ــــــ خوش رو گھروندے
پھوٹتے ہیں کونپلوں کی طرح نخلِ خاک سے
پیکرِ بے مایہ میں خاموش انجانی توانائی لئے
ننھے ننھے یہ گھروندے
نین سکھ جیسی سفیدی کی قبا پہنے
سنبھالے بیل بوٹوں کا غرور
ننھی دیواروں
حسیں محرابوں
اٹھلاتے دریچوں سے عیاں
تمکینِ زیبائی لئے
چاہتے ہیں اہتمامِ خوبروئی کا خراج
نیلے ـ پیلے ـ سبز اور بے رنگ و رنگوں کی ہم آغوشیاں
جھومتی چڑیاں لچکتی شاخساروں کی ہم سرگوشیاں
ڈھونڈتی ہیں خلوتِ دل میں اماں
اور دیوالی کی شام

ان گھروندوں کے لئے
لیکر آتی ہے اُجالوں کا پیام
جگمگا اٹھتے ہیں مٹی کے دیئے

میں کہ شاعر ہوں
اسی صورت بناتا ہوں گھروندے روز و شب
انضمامِ لفظ و معنی کا طلسم آگیں عمل
ننھی دیواروں
حسیں محرابوں
اٹھلاتے دریچوں
کو بنا دیتا ہے اتنا پرکشش، اتنا سجل
جیسے پریوں کے محل
جان تصویروں میں پڑ جاتی ہے
بول اٹھتے ہیں رنگ
بام و در کے عارضوں پر نقشِ معراجِ کمال
طاقچوں سے بارجوں تک پھیلا پھیلا ایک عشوہ کار احساسِ جمال
گنبدوں کی سربلندی کا ملوکانہ جلال

ان گھروندوں کو اڑھا دیتا ہے اِک زرتار شال
لیکن ــــ اِک تیکھا سوال
ناچتا ہے زینہ زینہ، بام بام
ان دیوں کو روشنی
کب ملے گی؟ ــــ آئے گی کب وہ گھڑی؟
وقت ہے اتنا ہی دامن کہ اس کے پاس، روغن
ہے نہ دودھیائی کپاس
محض مٹی کے دیئے تک تک کے رہ جاتے ہیں اس صورت منڈیروں کی طرف
(جیسے کاسہ بھیک کا جس میں نہ ہو سکہ کوئی)
نامرادی کا شجر
جیسے جیسے ہوتا جاتا ہے بلند
بڑھتی جاتی ہیں سیاہی کے پھلوں کی گنتیاں

دیکھتا ہوں راہ کب سے: راہ بدلے کارواں
ساعتِ نامہرباں ہو مہرباں
اور نکہت کوشیِ تیرہ شبی کو دے سکے
چمپئی روغن ــــ کپاسی بتیاں
مسکرا کر کھول دیں آنکھیں یہ مٹی کے دیئے
آئے دیوالی کی رات
(خندہ ساماں ــــ زرفشاں)
ان گھروندوں کا اماوس چاہتا ہے روشنی!

پروین شاکر

اے ۵۶ ایچ، نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

نیگ

صبحِ وصال کی پو پھٹتی ہے
چاروں اور
مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے
شگن کا پہلا پہر
منڈیر پہ آ کر ابھی ابھی بیٹھا ہے
سبز کواڑ کے پیچھے اِک سرخ کلی مسکائی
پازیبوں کی گونج فضا میں لہرائی
کچے رنگوں کی ساری میں
گیلے بال چھپائے گوری
گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی۔

ظہیر غازی پوری

(ریلوے آؤٹ ایجنسی، ہزاری باغ (بہار)

وصال

ہر سمندر
اپنی لامحدودیت میں گم رہا ہے
شور، آوازیں
قیامت خیز سیلِ بے کراں
اس کی اساسِ جاوداں ہے
بے نیازانہ سفر ہے
اس کی خصلت!
کیا غرض اس کو کہ اس کی تہ میں
کتنے بے بہا گوہر چھپے ہیں
قطرہ قطرہ ــــــ دریا دریا
اپنی ہستی بانٹتا ہے
سنگ ریزوں سے صدف تک
ہر خزانہ وارتا ہے
فکر و جذبہ کے پیمبر کی طرح۔

پس منظری

آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے
یہ غلط ہے
کس نے دیکھا ہے
میرے اندر
میری پس منظری کو

بدبخت

سب کے چہرے پر لکھی تحریر
جو پڑھتا ہے
وہ تنقید کر سکتا نہیں
بے لوث ہے کتنا
کچھ اس کے دکھ کو سمجھو؟

شاہد میر

گورنمنٹ کالج۔ بانسواڑہ۔ (راجستھان)

نظمیں

۱

تم گھنی روشنی کی حدوں سے
نکل کر ابھی آئے ہو
چند لمحے رُکو
تب چلے گا پتہ
اس قدر میرے گھر میں اندھیرا نہیں !!

۲

"گیان" کی دھوپ
ڈھل بھی گئی
اور سورج سکارتھ
ذہن کی چوٹیوں سے پرے جا گرا
پھر بھی میرے لہو کا سمندر ابھی سُرخ ہے
سارا منظر ابھی سُرخ ہے

۳

شام آنے تو دو
رفتہ رفتہ تھکن دور ہو جائے گی
ایک نشہ سا چھا جائے گا جسم کے سارے اعصاب پر
آرزوئیں رکھیں گی قدم
بستر خواب پر
دھوپ ڈھلنے تو دو
شام آنے تو دو
اپنے ہونٹوں پہ وہ نام آنے تو دو ۔

۴

اس کا سارا بدن ریت ہے
ریت کو انگلیوں سے کریدو ذرا
شکل پھر کوئی ہموار مِل جائے گی
لمحہ لمحہ پھیلتے ہوئے آب کی
تیز رو دھار مِل جائے گی !

۵

(والد کے انتقال پر)

کل تلک ایک ننھا سا پودا تھا میں
اک گھنے سے شجر کے تلے
سانس لیتا ہوا
جسم سورج کی کرنوں سے محفوظ تھا
بارشوں کا اثر مجھ پہ ہوتا نہ تھا
آج ہواؤں کے طوفان میں
سر پہ سایہ تھکن
وہ شجر گر گیا
آج محسوس ہونے لگا زندگی کی حقیقت ہے کیا
سر پہ سائے کی قیمت ہے کیا ؟ ؟

شاہد کلیم

سنٹرل ایکسائز آفس ۔ گیا (بہار)

شب بیداری کا نوحہ

صبح نے پھر
مرے دروازے پہ دستک دی ہے
ننھے بچّوں کی صدا پھیلی ہے گھر آنگن میں
چیختے چیختے گذری ہے سواری گاڑی
شور و ہنگامہ و نعرہ کی ہوا پھیلی ہے

ایک اچھا سا مکاں ـــــ
خوبصورت سی کوئی کار ـــــ کوئی اسکوٹر
ننھے بچّوں کا بدن فر کے لباسوں میں سجے
پاؤں سے بیوی کی پازیب کی جھنکار اٹھے۔

ان گنت خواب ہیں ـــــ
ان خوابوں کو آنکھوں میں بھروں
نیند کی چھاؤں میں کچھ دیر کو
آرام کروں
سائرن مجھ کو کسی شب
نہ بلائے تو سہی ۔

دشت بے موسم نہیں

موسمِ گل دشت سے گذرا نہیں ہے کیا کبھی ؟
ابرِ باراں ٹوٹ کر برسا نہیں ہے کیا کبھی ؟
ہر طرف خارِ مغیلاں کے شجر ہی
اُگ رہے ہیں ـــــ
ذائقہ خارِ مغیلاں کا زبانوں پر لئے
شہر سے اونٹوں کی ٹولی
دشت کی جانب روانہ ہو رہی ہے
گھنٹیوں سے لحظہ لحظہ
یہ صدائیں آرہی ہیں ـــــ
دشت بے موسم نہیں ۔

اکبر مرزا

۱۶۴، ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں (ناسک)

لہو کا ذائقہ

اے علی گڑھ!
تیرے علم وفن کے گہوارے پہ بادل زہر کے
اس طرح چھائے
کہ ساری روشنی
جانے کس کالے کھنڈر میں کھو گئی
پھر ستم کے تیر نفرت کی کمانوں سے نکل کر
آدمیت کے بدن میں
جابجا گڑتے رہے
کچھ درندے جنگلوں کو چھوڑ کر
گھس گئے تھے پرسکوں تیرے گھروں
اور معبدوں میں
اور اپنا زہر سارا جسم میں تیرے اُتارا
ان درندوں نے
لہو کا ذائقہ تیرا تھا
شعلوں کی زبانوں پر
بہت تاراج کر ڈالا تجھے
اور خوں میں نہلایا
درندے
خون کے اس کھیل سے جب تھک گئے تو
امن کے نعرے اٹھاتے
ڈھول اور باجے بجاتے
جنگلوں کو چل دیئے
اے علی گڑھ — اے دیارِ علم وفن
یہ اندھیرا کب تلک، اس کی حکومت کب تلک
ایک دن
روشنی کالے کھنڈر کو توڑ
تیرے سارے شہر پہ چھا جائے گی۔

اسلم عمادی

۴/۲-۴-۱۰، ہمایوں نگر۔ حیدرآباد (اے پی)

خدا کا ذکر ہی کرتے!

خدا کا ذکر ہی کرتے ——
کہ کچھ پل نیک خوئی میں گذر جاتے

یہ ہم نے کیا کیا ——
اک زندگی خوابوں کے بونے، خوابوں کی فصلیں کاٹنے میں
یوں گزاری
کہ اب بھی وہ تہی دستی۔ وہی پُرآرزو آنکھیں
وہی اِک بے ثباتی، بے گناہی

خدا کا ذکر ہی کرتے ——
کہ کم سے کم گرسنہ حالی کا الزام خود پر تو نہ آتا
آخری پل چین سے سوتے !!

انجم جمالی

نیر نگر بازار۔ میرٹھ (یو پی)

میرا فن

مرا فن نہ پتھر نہ مٹی نہ آہن کا محتاج ہے
مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سنگ مرمر کے بے جان ٹکڑے فراہم کروں
مجھے کیا غرض ہے کہ موسم کے ہاتھوں سے کشکول لیکر
کئی رنگوں والی دھنک سے
اجنتا الورا کے ماتھے کی ٹیڑھی لکیریں بھروں
مجھے کیا جو راوی، چناب اور جہلم سے لیکر سسکتی ہوئی موج گنگ و جمن تک
لہو کی فقط چند بوندیں بچی ہیں
اور ان میں بھی آپس میں ٹکرا کے معدوم ہوتے ہوئے سرخ ذرے
پہونچتے نہیں ساحلوں کے بدن تک
مجھے کیا جو کشمیر کی وادیوں سے کوئی زعفران کے شگوفے چرا لے گیا ہے
ہمالہ کے ویران کھنڈروں کی آغوش میں کسمساتے ہوئے موسموں کے آتشیں زہر کو
برف کا کوئی طوفاں بہا لے گیا
مرے فن کو درکار ہے صرف بنگال کے مرگ نینوں کا کاجل
اُفق کے کنارے کنارے ابھرتی ہوئی بستیوں کا دھندلکا
منی پور اور آسام کے جنگلوں میں اُترتی ہوئی شام کا نرم آنچل
مرا فن بھڑکتی ہوئی شعلوں میں سلگتے ہوئے سرخ چندن کا محتاج ہے
مگر خود نمائش ابھی تک مرے فن کی محتاج ہے۔

رؤف خیر
الادہ بنج بھائی، کاروان، حیدرآباد

خود بینی

میرے کمرے میں آئینہ جڑا تھا
اور اک چڑیا اسیرِ خود نمائی
چلی آتی تھی روزانہ ہی اندر
جو آئینے میں خود کو دیکھتی تھی
تو آئینے پہ چونچیں مارتی تھی

وہ چڑیا مستِ خود بینی بہت تھی
کہیں نزدیک ہی بلی کھڑی تھی

ذرا جھپکیں جو اس چڑیا کی آنکھیں
چمک بلی کی آنکھوں میں سوا تھی
کہ اس کے پنجے میں ننھی سی جاں تھی

اِن آنکھوں پر وہ منظر چھا گیا ہے
مرے کمرے سے آئینہ گیا ہے۔

ماہر منصور
دنویا نگر، ٹمکور ۔ ۵۷۲۱۰۱

نعمت

مجھے بینائی دے کر ڈاکٹر خوش ہے
مگر اس سے کوئی کہہ دے
اندھیرے مجھ کو لوٹا دے
کہ میں دو دن سے بھوکا ہوں۔

مُشتاق شبنم

ایکٹیکٹالس اینجنیئر، علی مارکیٹ مئوناتھ بھنجن۔ (یوپی)

شرحِ اندیشۂ بے معنی

یہ اِک الزام ہے مجھ پر
کہ میں یخ بستہ راتوں میں
فقط اپنے بدن کی تیز حدت کو فرو کرنے
تمہارے پاس آتا ہوں
تمہارے جسم کی ٹھنڈی، خنک سی چاندنی میں
سیر کر کے لوٹ آتا ہوں
یہ اِک الزام ہے مجھ پر
مگر تپتے ہوئے صحرا کو پانی کی ضرورت ہے
تم اِک دریا ہو، اس دریا کی موجوں میں روانی ہے
بدن کی آگ سے تم کیوں ہراساں ہو
بدن کی آگ تو فطرت کا اک ایسا عطیہ ہے
ازل سے کارِ تخلیقِ جہاں میں یہ معاون ہے
پھر اِک دریا ہو تم
ہراس و خوف بے معنی
مری چاہت پہ یہ الزام مت رکھو،
اگر یہ بات سچ ہوتی
تمہارے پاس آنا کیا ضروری تھا
کوئی بہتا ہوا چشمہ ہی کافی تھا۔

شفیع جمال

شمع بک اسٹال۔ اسٹیشن روڈ مظفرپور (بہار)

پہلی بات

سنو — !
تم سے مخاطب ہوں
ستاروں، چاند تاروں
آسماں سے بات کرنا
گلے ملنا ہوا سے
بادلوں سے
کئی دنیا ستاروں سے ہیں آگے
وہاں ہنسنا ہنسانا
زمیں پر مت اترنا
یہاں پر لوگ کچھ بسنے لگے ہیں۔

پلیٹ فارم

شبنم مرزا

چیختی، چنگھاڑتی، شور مچاتی۔
ہوا کا سینہ چاک کرتی ....

ٹرین سب کو سمیٹ کر بڑی برق رفتاری سے بھاگ رہی ہے۔ کھڑکیوں سے باہر مناظر گردش کر رہے ہیں اور اندر سب اپنی اپنی سوچ اور گفتگو کی طنابوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ لیڈیز جنرل کمپارٹمنٹ ہے۔ خواتین ٹھسا ٹھس بھری بیٹھی ہیں اور عالمی سیاست پر بحث چھڑی ہوئی ہے۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی عالمی سیاست کو کھلی بر روشنی دیکھ رہی ہوں۔ یہ سیٹ قلی کو کچھ پیسے دے کر میں نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ گویا سنیما کے ٹکٹ بلیک کرنے والے اب ٹرینوں کے ٹکٹ بھی بلیک کرنے پر برسرِ پیکار ہیں۔ برتھ ریزرو ــــ سیٹ ریزرو، فرسٹ کلاس ریزرو اور جنرل کمپارٹمنٹ بھی قلیوں کی بدولت ریزرو ــــ اور اگر آپ رشوت دے سکتے ہیں تو سب کچھ حاضر ہے ورنہ عالمی سیاست سے کنارہ کشی ہو جائیے ــــ ٹھیک ہی تو ہے ــــ

کمپارٹمنٹ میں موجود سبھی خواتین تعلیم یافتہ لگ رہی ہیں، ان کے ہاتھوں میں مختلف زبانوں کے اخبارات اور رسائل ہیں اور جو ہاتھ خالی ہیں وہاں عالمی سیاست پر باتیں ہیں۔

، انڈیا اور ویسٹ انڈیز .... محمد علی کلے .... رچرڈ برٹن اور الزبتھ ٹیلر .... ایشیا و سیونٹی ٹو .... شہاب ثاقب ....

ایئر انڈیا کا ہوائی حادثہ ....: اچھا! تو یہ ہیں عالمی سیاست کی باتیں؟

ٹرین رک گئی ہے۔ چیخ و پکار اور شور شرابے کے درمیان کچھ خواتین اور سوار ہوئیں اور وہ بھی اِدھر اُدھر چپک گئیں۔ کچھ رسائل میں اور کچھ عالمی سیاست میں۔ .... ایک عورت جو گود میں بچہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے ٹرین میں سوار ہو پائی ہے میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ سرخ رنگ کی زری والی ساڑی اور کھلی کھلی رنگت میں اس کا حسن کافی نکھر رہا ہے۔ اس کے بچے کی آواز پر میں اس کی جانب متوجہ ہو گئی ہوں۔ وہ بھوک کی وجہ سے بلک بلک کر رو رہا ہے۔ میں اخلاقاً بیٹھی بیٹھی بچے کو گود میں لینا چاہتی ہوں تو وہ کہتی ہے ــــ

"ٹرین بہت لیٹ تھی، یہ سو گیا تھا اس لیے میں اسے دودھ نہیں پلا سکی۔"

میں کہتی ہوں "کوئی بات نہیں آپ کچھ دیر کے لیے میری سیٹ پر آ جائیے" یہ کہہ کر میں کھڑی ہو جاتی ہوں۔ وہ جلدی سے سیٹ پر بیٹھ کر بچے کو دودھ پلانے لگتی ہے اور دودھ پلا کر اسے وہیں سلا بھی دیتی ہے۔ بچے کو سلانے کے بعد وہ آس پاس کی عورتوں کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ عالمی سیاست کا موضوع اب خاتمہ پر ہے اور ایک نئے موضوع کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اس عورت نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے دوسری عورتوں سے مراسم استوار کر لئے ہیں اور ان سے کہہ رہی ہے ——

"اپنے اس بچے کی زچگی کے دوران میں میکے گئی تھی اور اب اپنی سسرال واپس جا رہی ہوں ——"

میکے اور سسرال کا موضوع کافی دیر تک سفر کرتا رہا پھر بات شوہروں تک آ پہنچی ہے اور پھر حالاتِ حاضرہ بھی لپیٹ میں آ گئے۔ .... آٹے دال کا بھاؤ .... مہنگائی بھتہ .... رشوت خوری .... قانون .... مذہب .... ہندو مسلم .... سکھ عیسائی .... مسجد مندر .... گوردوارہ وغیرہ۔

وہ کہہ رہی ہے —— "یہ مسلمان لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں ...." میں چونک اٹھتی ہوں۔ کچھ عجیب سے جذبات میرے دل میں بیدار ہو گئے ہیں۔ مایوسی کی لہر سی دوڑنے لگی ہے۔

وہ کہہ رہی ہے ——

"ابھی دو ماہ قبل کی بات ہے کسی مسلمان نے ہمارے گوردوارہ میں ٹائم بم رکھ دیا تھا۔ ہمارے سب سے بڑے گرو گرنتھ کا پاٹھ پڑھ رہے تھے .... پڑھتے پڑھتے وہ اچانک کسی کام سے اٹھ کر باہر گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی ٹائم بم ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹ پڑا۔ گرو تو بچ گئے لیکن گوردوارہ کو بہت نقصان پہنچا۔ اور وہاں رکھے ہوئے سارے گرنتھ جل گئے۔ پتہ نہیں اس مسلمان کے بچے کو ایسا کر کے کیا ملا؟"

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا پورا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے اور وہ ٹائم بم گوردوارہ میں نہیں بلکہ میرے دل میں پھٹ پڑا ہو۔ غم و غصہ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ جی چاہتا ہے ایک زوردار طمانچہ اس عورت کے منہ پر رسید کر دوں تاکہ آئندہ یہ مسلمانوں پر کوئی تہمت نہ رکھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں گہری سوچ کے بھنور میں غلطاں ہو گئی ہوں۔ میری پیشانی پسینے سے بھیگ چلی ہے۔

اور میں سوچ رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ کسی کی شرارت ہو۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ہندو ہو، مسلم ہو، سکھ ہو یا کوئی اور ہو۔ وہ اپنے مذہب کا سچا پرستار نہیں ہو گا کیونکہ مذہب تو دنیا میں امن کا پیغام لیکر آیا ہے، مذہب تو انسان کو جینا سکھلاتا ہے۔ ہر ایک کو گلے سے لگانے کا درس دیتا ہے۔ وہ شخص جس نے گوردوارہ میں بم رکھا تھا یقیناً کوئی تخریب پسند ہو گا۔ نہ ہندو ہو گا نہ مسلمان ہو گا .... بلکہ کچھ اور ہو گا۔ یقیناً یہ سازشی غنڈوں کی طرف سے ہوئی ہو گی۔ کیوں کہ فساد ہونے کے بعد شہر کا سارا سرمایہ غنڈے ہی بٹور لے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ افواہ انہوں نے ہی اڑائی ہو کہ گوردوارے میں ٹائم بم کسی مسلمان نے رکھ دیا تھا۔

سوچتے سوچتے میرے دل میں اعتماد کی ایک رو سی چلنے لگی ہے۔ اب مجھے اس عورت کی سادگی پر ترس آنے لگا ہے۔ وہ بھی بے چاری دنیا کی باتوں میں آ گئی ہے اور اسے سچ سمجھنے لگی ہے۔ کاش میں اس سے کہہ سکوں کہ بہن نفرت کا زہر پھیلانے کی بجائے محبت کے پھول برساؤ تاکہ تمہاری گود میں پڑا ہوا یہ بچہ جب جوان ہو تو اپنے چاروں طرف نفرت، تعصب اور خون ریزی کی بجائے ایک پر امن، خوشحال اور شاندار دور دیکھ سکے۔

اطمینان کی ایک گہری سانس لیکر میں پورے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیتی ہوں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا ہے۔ کچھ دیر پہلے جہاں سب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آگ جل رہی تھی اب وہاں نئی فلموں پر تبصرے ہونے لگے ہیں۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ میں فلاسک سے پانی نکال کر پینا چاہتی ہوں....... اچانک اسی عورت کی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

"سنیئے! ــــ تھوڑا سا پانی مجھے بھی دیجئے، میں تین گھنٹوں سے پیاسی ہوں۔"

میرا جی چاہا اس سے کہہ دوں ــــ "کیوں، فرقہ پرستی کی باتیں کرتے ہوئے آپ کو پیاس نہیں لگی؟"

لیکن میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا ہے۔ ایک گلاس ختم کرنے کے بعد اس نے ایک اور گلاس کی فرمائش کی........

فلاسک میں پانی ختم ہو گیا ہے اور میں پیاسی ہوں مگر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اُسے پانی پلا کر میری روح شانت ہے۔ مجھے کوئی پیاس نہیں۔ پیاسی تو یہ عورت ہے جو اس وقت میری سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے اور جس نے مجھ سے پانی طلب کیا ہے۔ میں ابھی تک کھڑی ہوں اور وہ اطمینان سے بیٹھی ہوئی ہے۔ آنے والے اسٹیشن پر مجھے اترنا ہے۔

ٹرین کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ میں اپنی اٹیچی سنبھال کر دروازے کے قریب آجاتی ہوں۔ ٹرین رک گئی ہے۔ سامنے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں سے اچانک میری سہیلی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتی ہے۔ وہ آداب کر کے مجھ سے لپٹ جاتی ہے۔ کچھ مختصر سی باتوں کے بعد میں اس سے رخصت ہوتی ہوں۔ میری سہیلی پرجوش انداز میں کہتی ہے۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ" میں ہاتھ ہلاتی ہوں۔

"خدا حافظ" کے الفاظ پر میری سیٹ پر بیٹھی ہوئی وہ عورت چونک کر میری طرف دیکھتی ہے اور کھڑکی کے قریب آکر مجھ سے پوچھتی ہے۔

"معاف کرنا بہن جی ــــ کیا آپ بھی مسلمان ہیں؟"

"جی ہاں!" میں مسکرا کر جواب دیتی ہوں۔

وہ ندامت اور پشیمانی کے بوجھ میں دبی جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر میں ایک قریب کھڑے ہوئے قلی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔

وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے پھر کہتی ہے۔

"سنیئے! یہ کونسا پلیٹ فارم ہے؟"

میں نہایت تحمل سے جواب دیتی ہوں۔

"انسانیت کا"

(شاید میرے اس جملے کو وہ سمجھ چکی ہے)

بازیافت

شبیر ہاشمی
۳۵۲ نیو وارڈ، مالیگاؤں (ناسک)

"میں ——!؟"

اُس نے شراب کی ایک چسکی لی! اور بڑبڑایا۔

"میں ——!!"

جرنلسٹ کی آواز کی گونج ابتک اس کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی تھی:

"کیا آپ اپنی شخصیت کے کسی تاریک پہلو پر روشنی ڈالیں گے؟" —— روشن ترین شخصیت سے جرنلسٹ کا یہ بڑا ہی پُراسرار سوال تھا۔

"میں اسے پسند نہیں کرتا۔" اُس کا سیدھا سا جواب تھا۔ جو اس نے سوال کی ساری تلخی کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑی متانت سے دیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی اپنی ذات کے اندھیرے سے آنکھ نہیں ملا سکتے؟"

جرنلسٹ نے اپنی دانست میں بہت کچھ" اگلوا لینے کیلئے آخری ضرب لگائی۔

"میں کیا —— کوئی بھی شخص اپنی ذات کے اندھیرے سے آنکھ نہیں ملا پاتا۔

—— میرا خیال ہے شاید آپ بھی" اس کا معقول جواب تھا۔

اس جوابی حملے نے جرنلسٹ پر واضح کر دیا تھا کہ سوال کی شدت اور تیزی اُسے بالکل ہراساں نہیں کر سکی ہے۔

کیوں کہ وہ ایک کامیاب بزنس مین، ایک کامیاب لیڈر ہی نہیں، ایک کامیاب انسان بھی تھا۔ انٹرویو جانے کب کا ختم ہو چکا تھا! جرنلسٹ بھی جانے کب کا رخصت ہو چکا تھا لیکن وہ اپنے آفس کی اُسی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر وہ انٹرویو دینے سے قبل ایک خاص ادا کے ساتھ آکر بیٹھا تھا۔ اُس کے اندر ایک طوفان سا برپا تھا۔ حالاں کہ اس نے جرنلسٹ کے سوالات کے بہترین جوابات دیئے تھے۔ جو اس کی کامیاب فہم و فراست کے آئینہ دار تھے —— پھر یہ بے چینی کیسی تھی!!؟

"میں کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتا!؟ —— اپنے آپ سے ——!؟ کم ظرف ——!" اُس نے پھر ایک چسکی لی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں۔

"ہاں! —— تم اپنے آپ سے آنکھ نہیں ملا سکتے"

جیسے کوئی اس کے اندر سے کہہ رہا تھا ـــــ "تم اپنے بارے میں لوگوں کو بتا بھی کیا سکتے ہو؟"

"سب کچھ تو لوگ جانتے ہی ہیں' اس منزل تک پہنچنے کی میری ہر جد و جہد سے لوگ واقف ہیں۔ اور پھر میں نے ساری باتیں تو کہہ دی ہیں" ـــــ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہا۔

"تم نے جرنلسٹ کو بھی لوگوں کی طرح بے وقوف بنایا ہے"

اس کے اندر کی سرگوشی اُلجھ پڑی۔

"میں نے کیا چھپایا ہے؟"

"یہ تم خود جانتے ہو" ـــــ!

"بعض باتیں ڈپلومیسی اور کاروباری نقطۂ نظر سے کہی جانا حماقت کہلاتی ہیں؟"

"لیکن اس وقت بات کاروباری نہیں' ذاتی محاسبہ کی ہے"!

"تو وہ میرا کام نہیں ہے"!

"تو پھر کس کا ہے؟" ـــــ

"اوہ ـــــ یو شٹ اپ!!" ـــــ اُس کی بڑبڑاہٹ بہت واضح تھی۔

"آئینہ دیکھو گے!؟"

"نہیں!"

"ـــــ کیوں؟"

"میری مرضی"۔

"تم اپنے آپ کو دیکھنا نہیں چاہتے ـــــ؟ مر جاؤ گے تو یہ حسرت بھی ساتھ ہی جائے گی کہ سب کچھ دیکھا! صرف اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکے۔ اس لئے مرنے سے پہلے کم سے کم اپنے آپ کو تو دیکھ لو"۔

وہ بے بسی سے ہانپنے لگا۔

اچانک اسے ایسا لگا جیسے ایک تیز لہر بڑی تیزی کے ساتھ کنارے کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہے' جیسے وہ سمندر کے کنارے بنے ہوئے پشتے کو توڑ ہی ڈالے گی ـــــ!!

چھپاک ـــــ! ایک تیز آواز کے ساتھ پانی پشتے کی دیوار سے ٹکرا کر کافی اونچائی تک اُچھلا ـــــ اور پھر لہر در لہر واپس ہونے لگا۔

لیکن ٹھیک اُسی وقت ایک دوسری لہر پھر اسی عزم سے اپنے پورے خروش کے ساتھ کنارے کی طرف بڑھنے لگی لیکن وہ واپس ہوتی ہوئی لہروں سے درمیان ہی میں ٹکرا گئی۔ اور پانی چھپاک کی آواز کے ساتھ پھر فضا میں دور تک اُچھلا ـــــ اور سمندر کی سطح پر سفید جھاگ پھیلتا چلا گیا۔

چھپاک ـــــ چھپاک لہروں کا شور بڑھنے لگا۔ بے چینی اضطراب اور گھبراہٹ کے زبردست طوفان میں جیسے اس کا وجود گم ہونے لگا۔ اُس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح اپنے ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے ـــــ اُس کا کپکپاتا ہوا ہاتھ فون کے ریسیور سے ٹکرایا

اس نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے کسی کے نمبر ڈائل کئے۔

"ہیلو! ـــــ کون کمشنر صاحب!؟ ـــــ میں...

.... ٹھیک ہے میں آپ کا یہیں انتظار کرتا ہوں"۔

وہ فون رکھنے لگا۔ تو اس کی نظریں' ادھ کھلے دروازے سے جھانکتے ہوئے اُس کے وفادار ملازم پر پڑیں۔

"صاحب! ـــــ ابھی تک آپ یہیں بیٹھے ہیں!! ـــــ رات گھر نہیں گئے" ـــــ!؟ ـــــ اور ـــــ اب تو صبح ہونے والی ہے!

وہ بڑی حیرت سے کہہ رہا تھا۔

تب اُس نے جیسے صدیوں کی گھٹن کو اپنے سینے سے آزاد کرتے ہوئے انتہائی آسودہ لہجے میں کہا ـــــ

"ہاں بھائی ـــــ! اب تو صبح ہونے ہی والی ہے۔"

▲▲

آج اور کل کا آدمی

ارشد حلیم
شیر پور چو بٹہ، کاشانہ، بہار شریف۔ نالندہ (بہار)

اُس دن ایک بات اُس کی سمجھ میں آئی کہ اس کے چاروں طرف جو میل جمتا جا رہا ہے اس کا کیا وجہ ہے ـــــــ؟ دراصل وہ لوکیلٹی (LOCALITY) ہی ایسی تھی جہاں اس کے مزاج پر ہر لحظہ، ہر لمحہ ایک چوٹ سی پڑتی رہتی اور تب وہ ذہن کو اس بات پر آمادہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ جہاں مزاج میں ہم آہنگی نہیں اور جہاں اس کے گرد دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں تو اگر وہ اس دراڑ کو پاٹ نہیں سکتا تو ایک دن وہ اس پھٹتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے دراڑ میں دفن ہو جائے گا۔

وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں مگر کچھ باتیں اس کا دل قبول کرنے سے یکسر انکار کر رہا تھا ـــــــ اب یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کہ اس کے کمرے کے سامنے ہی جوئے بازی ہو۔ اور ہنگامہ ایسا۔ کہ کانوں میں جب کسی کے میٹھے بول سنائی بھی دے رہے ہوں تو شراب کی بدبو نتھنوں کو پھاڑ دیں اور کانوں میں بے ہنگم آوازوں کی چیخ گونجنے لگیں، جس سے میٹھے بول میں زہر گھل گھل جائے ـــــــ اطراف میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے شریفانہ گفتگو کی جائے، آپ شرافت کی ساری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے اور کسی نے چھینک مار کر آپ کا استقبال کیا ـــــــ!

گو کہ کمرہ اچھا خاصا تھا، کھڑکیاں چاروں طرف تھیں، دو طرف دروازے تھے، جدھر کی کھڑکیاں آپ چاہیں اُدھر کی کھول لیں، جس رُخ کی ہوا ہو اس رُخ کی کھڑکی کھول دی اور جسم و جان پر تازہ ہواؤں کے بوسے لطافت کی حد تک محسوس کریں۔ ـــــــ دروازے دو ہی تھے، مگر آپ جس طرف کا دروازہ بند کرنا چاہیں بند کر دیں، جدھر کا کھولنا چاہیں کھول دیں، یہ تو آپ کے دل پر منحصر تھا ـــــــ

کئی دنوں سے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کمرے کو وہ چھوڑ دیگا، مگر پریشانی یہ تھی کہ اپنے لوکیلٹی میں کمرہ ملنا دشوار تھا، اُس نے کئی ملنے جلنے والوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ لوگ بھی اس کے اس مہم میں اس کی مدد کریں ـــــــ لہٰذا ایک دن ایک واقف کار آیا اور کہنے لگا ـــــــ "میاں ـــــــ! ایک کمرہ فلاں جگہ میں نے دیکھ رکھا ہے، اگر تم اسے لے لو تو اچھا رہے گا، ہر چیز کا آرام ہے ـــــــ!"

"مگر صاحب ـــــ ! وہ تو ٹھیک ہے، میں لے لوں، کرایہ بھی جو چاہیں گے میں دے دوں گا، مگر وہ جگہ کیسی ہے ؟ میرا مطلب ہے لوگ کیسے ہیں، مکانات وغیرہ لوگوں کے کس طرح کے ہیں، اس لئے کہ اچھے اور اونچے مکانات والے یقیناً اچھے اور خوش ذوق ہوتے ہیں ـــــ جھکے جھکے اور بجھے بجھے مکانات میں افلاس پلتے ہیں اور جہاں افلاس پلتے ہیں وہاں ہر وہ کام ہوتے ہیں جو انسانی فطرت کے عین منافی ہوتے ہیں، گندگی صرف اُن کے تن پر جھولتے ہوئے کپڑوں میں ہو تو کوئی بات نہیں، ذہن اور دل میں سازشی مادّے پھوڑے پھنسی کی طرح پکتے رہتے ہیں ـــــــ زبانوں سے غیر علمی کلمات ہر لمحہ پھسل پڑنے کو بے تاب رہتے ہیں، چیخ و پکار کے طوفان سر اٹھاتے رہتے ہیں ـــــ ایک بارگی آدھی رات میں آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی نیند نہایت بے رحمی سے آپ کی آنکھوں سے نوچ لی گئی ہے کہ آپ کے پڑوس میں کوئی کسی کے مکان سے کسی لڑکی کو منہ میں کپڑا ٹھونس کر لے بھاگنے کے فراق میں تھا کہ لوگ جاگ گئے اور چیخ و پکار شروع ہو گئی ـــــ اب آپ لاکھ آنکھوں کو منائیں مگر آپ کی جلتی ہوئی آنکھیں جلتی ہی جائیں گی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور پھر .... پھر اس رات کا چرچہ .... اور پھر ایسی لاتعداد باتیں اور حرکتیں جسے سُن سُن اور دیکھ دیکھ کر آپ کا ذہن غیر ارادی طور پر صدمہ سے دوچار ہوتا جائے گا، بالآخر .... آپ کی توانائی ختم ہو جائے گی !!

"آپ کے خیالات اور میرے سوچنے کے ڈھنگ میں آسمان اور زمین کا فرق ہے ـــــــ میں اس زمین پر بستا ہوں، جہاں پستی میں مخمل سی ملاحت اور رعنا نرسا احلاین بھی ملتا ہے اور اونچائی میں کاغذ کے بنے ہوئے خوبصورت پھول اور شیشے سے بدن پہ میلے دھبّے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں ـــــ میں چلا، آپ خود تلاش کر لیں ایسی جگہ جہاں .... !" اس سے آگے وہ کچھ نہیں بول سکا۔ اور اس کے کمرے سے باہر نکل گیا ! وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا ـــــ پھر کچھ لمحے بعد اس کی باتوں کو اُس نے تھوک کی طرح باہر فوراً ہی پھینک دیا ـــ !!

ایک دن اس نے ایک نہایت کی پُر فضا اور اچھے مقام پر ایک کمرہ تلاش کر ہی لیا۔ گو کہ پریشانی تو بہت ہی اٹھانی پڑی، مگر یہ جگہ اسے بہت پسند آئی۔ لوگوں کے رہنے سہنے کا ڈھنگ، جدید طرزِ تعمیر کے نمونے یہاں بکھرے پڑے تھے ـــــ کوئی بھی ایسا نہ تھا سوائے چیدہ چیدہ لوگوں کے جس میں شرافت اور شائستگی نہ ہو ـــــ "جینٹل مینیزم" کی ایسی مثال اس نے اور کہیں بھی نہیں دیکھی تھی ـــــ اس نے مکان مالک سے بات طے کر کے اپنا سامان پرانے کمرے سے منگوا لیا اور نئے کمرے کو خوب اچھی طرح سجایا ـــــ ہر چیز ایسی خوبصورتی سے رکھی کہ کوئی بھی دیکھنے والا جسے ذرا بھی سجاوٹ سے لگاؤ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کسی چیز کو اس کا خاص مقام نہیں دیا ہے، یا کہیں پر وہ بھول کھا گیا ہے یا کسی بھی شئے کے ساتھ بے انصافی کی ہے ـــــ !!

اب وہ بڑا خوش تھا۔ سب کچھ سجا لینے کے بعد اس نے اپنے جسم کو باتھ روم کے شاور کے نیچے کھڑا کر دیا، اور جب وہ بشاش ہو چکا تو اچھے اور قیمتی کپڑے کو جسم کی کھونٹی پر سجا کر باہر نکل گیا، ـــــــ سڑک کے دونوں جانب باادب کھڑے ہوئے اونچے اور خوبصورت درخت، ہر دو چار قدم پر کھڑے ہوئے روشنی پھیلانے والے دودھیا ٹیوب، آئینے کی طرح صاف و شفاف چہرے اور چہرے سے نیچے ٹانگوں میں سلیقے سے چپکے ہوئے بیل بوٹم، سرسراتی ہوئی ہواؤں سے کھیلتے ہوئے شرارے ـــــ سب کچھ اس طرح کہ جیسے خواب ہو، اور وہ خواب دیکھ رہا ہو ـــــ ! ہاں ـ ! یہ جگہ ہوئی نا، کتنا اچھا اور خوبصورت ہے سب کچھ ـ یہاں، اب بھی ملے تو ادا کے ساتھ سرگوشیاں معلوم ہوں، درد سے چیخ بھی نکلیں تو آواز دائرے کی شکل اختیار کر لیں کہ بس اس کا وجود اور اس کے وجود کے دائرے میں محدود اس کی چیخ کی آوازیں کہ آپ پاس سے گزر جائیں مگر کیا مجال کہ آپ حصار میں

گھرے گھاتی وجود کو محسوس بھی کرسکیں، وہ ایسے معلوم ہوں گے جیسے ابھی ابھی باغ سے تازہ میٹھے انگور آئے ہیں اور ابھی ان کو منہ میں آپ رکھیں گے اور وہ آپ کو لطیف ذائقہ دے جائیں گے ——

'برج وشنا' ایک پہرہ سکون کا —— ہر دروازے گونگے، ہر کھڑکیوں کے شیشے سے چھنتی ہوئی مدھم روشنیاں، اور روشنیوں میں رنگتی ہوئی، محبت سے بھیگی ہوئی باہیں، اندھیرے سائے چھپٹے ہوئے —— اور باہر اوس میں بھیگتی ہوئی، انتظار کرتی ہوئی مرسڈیز کار، اور کار میں اونگھتا ہوا شوفر —— یہ سب کچھ کتنا انوکھا لگتا ہے، کتنی CERTAINTY ہے۔ سب کچھ خاموش خاموش سا لگتا ہے: ہنگامہ، چیخ، زور زور سے بولتی ہوئی آوازوں کا سایہ تک نہیں —— ORIGINALITY کا جاگتا ہوا شاہکار کیا یہ نہیں —— ؟ چپ چپ سا حسین ایگریمنٹ، زبان پر جیسے تالے لگے ہوئے پھر بھی کتنا دلنواز CONTRACT، کہ ایسی جگہ میں، میں وہ سب کچھ کرسکتا ہوں جو اس جگہ اس کمرے میں نہیں کرسکتا تھا !!

اتنی ساری باتیں وہ سوچتا ہوا سارے کالونی کا چکر لگا آیا، اور تب اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے ۹ بج رہے تھے، اس نے ٹھکانے سے کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور اپنی جان کو خالی بستر پر گرا دیا!

اب وہ نہایت ہی اطمینان اور سکون سے نئے کمرے میں رہ رہا تھا کبھی کبھی ایک نظر اپنے قرینے سے سجی ہوئی چیزوں پر ڈال دیا کرتا تھا پھر اطمینان کر لینے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا کہ سب کچھ ویسا ہی سجا ہوا ہے جیسا اس کمرے میں تھا۔ —— فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جگہ، وہ SITE اچھی نہیں تھی اور یہ جگہ خوبصورت ہے۔ لوگ اچھے ہیں، SITE بہتر ہے، ہنگامہ نہیں ہے، گندگی کوسوں دور ہے —— اور یہ جو ہے اس کا ذہن قبول کرتا ہے، وہ جو تھا اس سے دماغ ہمیشہ برسرپیکار ہی رہا کرتا تھا ——

دنوں کو ابھی ماہ کے پر بھی نہیں لگے تھے کہ ایک دن اس نے محسوس کیا کہ کمرہ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، کچھ جیسے کہ نرالا سا —— ویسا نہیں ہے، جیسا وہ تھا، وہ سلیقہ، وہ سجاوٹ نہیں ہے، کچھ کمی باقی رہ گئی ہے۔

اور یہ احساس برابر بڑھتا ہی گیا، پھیلتا ہی گیا ——

مگر وہ کچھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر اس نے کونسی کمی اس کمرے کو سجانے میں رکھ چھوڑی ہے —— تب یادوں کا سہارا گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا! —— اس کا سوچتا ہوا ذہن ایک مرکز پر ٹھہر گیا تو وہ چونکا —— اس نے پہلا کام یہ کیا کہ صوفہ سیٹ اس کمرے میں پورب کی طرف، جس کے اوپر چوڑی کھڑکی بھی تھی، وہاں سے ہٹا کر اسے اس کمرے میں پچھم طرف کر دی کہ پرانے کمرے میں یہ پچھم ہی تھی، مسہری جو اتر تھی، یادوں نے پھر سہارا دیا، وہ پہلے کمرے میں دکھن طرف تھی، سو اس نے اسے دکھن کر دی۔ ٹیبل اور اس پر رکھے ہوئے لیمپ وہاں اتر اور دکھن کے کونے میں رکھے ہوئے تھے، سو اس نے ایسا ہی کیا۔ کتابوں سے بھری الماری پورب جانب تھی سو اس نے اسے پورب ہی اڈجسٹ کر دیا —— فرش پر بچھی قالین کی چاروں طرف مختلف رنگ کے بورڈر لگے ہوئے تھے، تو اس کمرے میں جو سرخ بورڈر تھا وہ اتر تھا اور ہرا دکھن، اور بلیو پورب تو میرون پچھم —— سو اس نے ویسا ہی کیا جیسا پرانے کمرے میں تھا —— !!!

اب کمرے سے اجنبیت کا احساس ختم ہو گیا تھا مگر وہ تشفی کر لینا چاہتا تھا کہ شاید کوئی اور چیز ایسی نہ رہ گئی ہو جس کا کھٹکا اسے ستانے لگے، لہٰذا کچھ دیر وہ جامد کھڑا رہا اور کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اور یادوں پر ضرب لگاتا رہا —— مگر اب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا —— بالکل اسی کمرے کی طرح یہ کمرہ بھی لگنے لگا تھا۔ اس نے سوچا، اب یہ احساس اسے نہیں ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کمرے میں چلا آیا ہے، جس کے لئے ہر چیز اجنبی ہو، پھر اس نے بالکل

تشفی کو لینے کے بعد شاور کے نیچے اپنے جسم کو کپڑے سے بے نیاز کر دیا اور دیر تک باتھ روم میں گھسا رہا —— پھر کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر نکل ہی رہا تھا کہ سنگار میز پر دوبارہ ایک اچٹتی سی نظر اس کی پڑ گئی تو وہ ذرا کی ذرا ٹھٹکا اور قدم جو باہر نکال چکا تھا اسے پھر اندر کر لیا اور تھوڑی دیر کے لیے قدآدم آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔

تو اسے کچھ اپنا چہرہ بے ڈھنگا سا لگا، چہرے سے نگاہیں اترتی ہوئیں کپڑے کا جائزہ لینے لگیں کہ شاید کپڑے ہی اس نے اچھے نہیں پہنے یا سوٹ کی میچنگ غلط ہے، دیر تک کپڑے کو دیکھتے رہنے کے بعد اس کے دماغ نے فیصلہ صادر کر دیا کہ میچنگ ٹھیک ہے، کالے سوٹ اور اس کے اندر سے جھلکتی ہوئی سفید قمیص پر سرخ ٹائی بالکل بج رہی تھی:

بالوں کا اسٹائل بھی ٹھیک تھا؟ تب اس کی نظر جوتے پر پہنچی، بھورے رنگ کے مخملی جوتے بھی ٹھیک ہی تھے، گرد بھی نہیں تھی، برش سے اسے خوب اچھی طرح صاف کر دیا گیا تھا —— پھر —— پھر ایسا کیا تھا کہ جب وہ باہر قدم نکال رہا تھا تو وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا —— ایسا کیا تھا —— کیا تھا ایسا ——؟

یہ سوچتے سوچتے وہ کافی تھک سا گیا، تب مسہری پر دونوں ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا آخر کیا تھا اسے ایسا کیوں لگا، کیوں لگا ایسا —— پھر اس نے کمرے کی چاروں طرف دیکھا، مگر ہر چیز تو ویسی ہی تھی پرانے کمرے کی طرح، ایسا بھی نہیں تھا کہ پرانے کمرے کی سجاوٹ اچھی نہیں تھی اس نے اسی طرح اپنے اس نئے کمرے کو بھی سجا لیا تھا —— پھر ——؟

اس کا تھکا ہوا ذہن یا دوں کی تہہ در تہہ ادھیڑ رہا تھا۔

—— تب اس نے سر کو ایک ادائے خاص سے جھٹکتے ہوئے سوچا، ہنہ —— سب ٹھیک ہے بس یوں ہی سا بے تکا خیال پتہ نہیں کہاں سے آ ٹپکا کہ کچھ کمی رہ گئی ہے جسے اس نے پوری نہیں کی ہے —— یہ بھی کوئی بات ہوئی، یہ سوچتے ہی اس کے قدم پھر باہر کی جانب بڑھے —— مگر ایک پاؤں باہر اور ایک اندر جیسے کہ جم سے گئے، اس نے گھور کر پھر دیکھا، جیسے کوئی طاقت اسے باہر جانے سے روک رہی ہو کہ تبھی اس کی نگاہ سنگاردان پر پڑی اور اس سے جڑے ہوئے قدآدم آئینے پر، تب ہی ایک یاد بجلی کی لکیر کی طرح چمکی اور وہ سنگاردان تک پہنچا، اور اسے اٹھا کر آتر کی طرف رکھ دیا کہ پرانے کمرے میں وہ اس جانب ہی تھی، تب اس کا دماغ روئی کے گالے کی طرح ہلکا ہوا ——

اب وہ سو فیصدی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اب سب درست ہے، اپنی اپنی جگہ کو سب چیزوں نے پا لیا ہے۔

تب تشفی اور یقین کا چاند اس نے پیشانی پر سجا کر باہر قدم نکالا۔

آج اس نے کچھ لوگوں سے ملنے کا پروگرام بنا رکھا تھا کہ آخر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اتنے دنوں سے وہ اس لوکیلٹی میں ہے لیکن ابھی تک اس نے کسی سے جان پہچان کی پینگیں نہیں بڑھائیں اور نہ ہی اس سے کسی نے شناسائی جتائی۔

جب وہ باہر نکلا تو سورج نیچے اتر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایکدم نیچے اتر کر گم ہو گیا —— وہ پہلے چوڑی سڑک کو پار کر کے سامنے والے مکان کے لوگوں سے ملنا چاہ رہا تھا، لہٰذا اس کی انگلی سڑک پار کر کے ان کے اونچے دروازے کے کال بیل کو دبانے لگی —— اندر سے ایک جوان مرد اور اس کے پیچھے ایک خوبصورت ترشی ہوئی لڑکی دروازے کی دہلیز تک آ کر رک گئی۔

"—— اوہ آپ! آپ وہی ہیں جو سامنے رہتے ہیں، کچھ دنوں سے آپ کو سامنے والے مکان میں دیکھ رہا ہوں، کہیے —— میرا مطلب ہے کیسے آنا ہوا ——؟

" جی ہاں، میں سامنے ہی رہتا ہوں، سوچا میں یہاں انجان ہوں، کچھ لوگوں سے راہ و رسم بڑھائی جائے، لہٰذا تعارف کی غرض سے

آدھمکا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ______ ؟"

"نہیں ______ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں معاملہ دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی ابھی باہر نکل رہے ہیں ______" اس نے اپنے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا، جو چپ چاپ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے جا رہی تھی ______ "ویسے میں نے جان لیا کہ آپ ہمارے پڑوسی ہیں، اچھا، بائی ______ ملتے رہیے گا"

وہ اپنا سا منہ لیکر کھڑا رہ گیا اس نے سوچا کیسے لوگ ہیں، انہیں دو منٹ بات کرنے کی فرصت بھی نہیں، بہت مشغول لوگ ہیں، یہ بھی نہیں کہا ______ "آئیے اندر تشریف لائیے!" اسے بے حد صدمہ ہوا۔ بہرحال وہ تھکے پاؤں اپنے کمرے میں آکر صوفے پر دراز ہو گیا۔

اس نے اس رات زندگی کے گذرے ہوئے لمحات کے بارے میں سوچا، اس نے سوچا کہ زیست کہاں کہاں اُسے کترا کر نکل گئی ہے۔ کہاں کہاں دامن تھام کر اس کی پیشوائی کی ہے، گتھیاں زیست کی سلجھنے کی بجائے الجھتی ہی رہی ہیں۔ جہاں نیا موڑ آیا، وہاں وفا دیار میں ماند کر اوجھل ہوگئی ہے، جہاں آرزوئیں آنسو بن کر ٹپکے وہاں جفا نے سہارا دیا ہے، اب تو زیست کے اس داؤ پیچ کو وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ جھیلنا ہے تو آنسوؤں سے گلاب کھلاتے رہو کہ پرلطف شب و روز کا یہ تقاضہ ہے۔

پھر اُس رات ایسا ہوا کہ وہ واقف کار نہ جانے کس طرح اس کے کمرے میں آدھمکا، جس سے اُس نے ایک دفعہ کمرے کو تلاش کرنے کے لئے کہا تھا، اور جس نے اس کے خیال سے اختلاف کیا تھا اور جو جھنجلا کر یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا کہ ______ "میں نے بستی میں مخمل سی ملاحت اور چاند سا اُجلا پن بھی دیکھا ہے، اور اونچائی میں کاغذ کے خوبصورت پھول اور شیشے سے بدن پر زندگی دکھنے والے میلے دھبے بھی دیکھے ہیں، میں چلا، آپ خود ہی ایسا کمرہ ڈھونڈ لیں جہاں تھکے تھکے اور بجھے بجھے مکانات نہ ہوں اور جہاں ....!!"

وہ آیا اور کہنے لگا ______ "اب تو آپ کی آنکھوں سے کوئی نیند یں نوچ کر نہیں لے جاتا ہے؟ ______ اور رات گئے تک آپ کی آنکھیں جلتی تو نہیں رہتی ہیں ______ ؟" اتنا کہہ کر وہ اس کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اب سب کچھ ٹھیک ہے، کوئی چیخ، کوئی زوردار آواز، کوئی تکلیف دہ گونج نہیں ہے، ٹھنڈا اور سرد یہاں کا ماحول ہے، مگر لطیف زیست کا سارا مزہ یہاں میسر ہے ______"؟

"کیف کی یہ جگہ اور پرسکون یہ کمرہ، جہاں آپ کا مزاج ہم آہنگ ہے، ایسے میں آپ کے احساسات تلخ تو نہیں ______ ؟"

واقف کار جیسے انٹرویو لے رہا تھا، تھوڑی دیر کے لئے وہ چپ رہا پھر بولا ______ "اب میں آپ کے پرانے کمرے میں رہتا ہوں، جہاں آپ بھی میرے ساتھ ہوتے ہیں، مگر آپ کا وجود بس یوں ہی سا سرد سرد سا رہتا ہے ______" کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا ______

"اور جہاں اب آپ رہ رہے ہیں، پہلے میں یہاں رہا کرتا تھا ______ !"

"جی ______ ؟" کمرے کا مکین حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا، اُس کے چہرے پر دھوئیں کی تہہ جم رہی تھی، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محرومی اور مایوسی کا شکار ہو رہا ہے۔

"جی ہاں ______ ! لیکن اب میں کچھ اور نہیں کہوں گا کہ شاید یہ کمرہ بھی کہیں آپ چھوڑ نہ دیں ______؟؟"

واقف کار نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر آگیا ▲▲

ہر تخلیق پر اپنے نام کے ساتھ
اُردو میں اپنا پورا پتہ ضرور لکھئے!

احتساب

آشوبِ نوا ــــ ظہیر غازی پوری
• تبصرہ ــ عتیق احمد عتیق
زرد پتے ــــ نوبہار صابر
سیال ــــ اختر مالیگانوی
• تبصرے ــ حفیظ مالیگانوی
شب آشنا ــــ انجم عثمانی
• تبصرہ ــ عرفان عارف
ماہنامہ "الفاظ" کراچی ــ اُمید فاضلی، مخدوم منور
• تبصرہ ــ شبنم میرزا
دوماہی کوہسار ــ مناظر عاشق ہرگانوی
ماہنامہ "اب" گیا ــ تاج انور، فرحت قادری
• تبصرے ــ سلطان سبحانی

آشوبِ نوا

شاعری : ظہیر غازی پوری
قیمت : بارہ روپئے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع نگر نئی دہلی ۲۵

فن کار ہو کے فن سے بغاوت نہ کر سکے
ہاں! ہر نئے خیال کی توصیف ہم نے کی ــــ (ظہیر)

نئے خیالات کی توصیف ہی کیا، ان کی تصنیف و تالیف بھی ضروری ہے اور یہ کام غزل کے ابتدائی دور ہی سے جاری ہے لیکن یہ صنف ایک زمانے تک اپنے پرانے الفاظ و علائم کے مسلسل استعمال سے یکسانیت کا شکار بھی رہی ہے۔ اور اپنے مخصوص دائرہ سے باہر اس وقت نکلی جب حالی نے غزل میں لسانی و موضوعاتی تغیرات پر زور دیا، جس پر بتدریج عمل ہوتا رہا، غزل بھی خود کو ہر عہد کے مطابق ڈھالتی رہی، لیکن نئے شعراء نے تو اس کا صدیوں پرانا لبادہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور آج وہ نئی نویلی دلہن کی طرح سجی سجائی اور تمام نوک پلک سے درست ہمارے سامنے ہے۔ جن نئے شعراء نے غزل کی زبان کو نئے تقاضوں، نئے امکانات اور اظہار کے جدید اسلوب سے مزین کیا ہے، اس نسل کے ایک تازہ دم، تیز رو اور ہوشمند شاعر ظہیر غازی پوری بھی ہیں، جن کے یہاں عصرِ حاضر کے وہ لامتناہی موضوعات جو ہمارے سامنے بکھرے پڑے ہیں، انھیں ایک ضبط اور توازن کے ساتھ احاطہ کر لینے کا بدرجۂ اتم سلیقہ ہے۔

ویسے ان کے کلام میں کہیں کہیں ان کے ہمعصر شعراء کی بھی گونج سنائی دے جاتی ہے، ایسا ہونا بھی لازمی ہے آخر ان کے معاصرین بھی تو عصری بصیرت و آگہی ہی کے خوشہ چیں اور علمبردار ہیں نا! لیکن "آشوبِ نوا" کے مطالعہ کے بعد آپ کو اس کا اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ ؎

وقت کی لے پہ یہ بھی گاتے ہیں
ان کی آواز ہے مگر تنہا ــــ (یوسف جاوید)

میں ان کے مجموعۂ کلام کی بیسیوں منتخب غزلوں میں سے دو غزلیں پیش کر رہا ہوں ــ (۱)

نظر سے سورج کا فاصلہ صرف ہات بھر تھا
مگر ہمارا ہی جسم شاخِ نبات بھر تھا

وہ ایک تالاب جس میں پتھر بھی تیرتا ہے

جواز میرے مشاہدوں کا حیات بھر تھا
سحر کی کرنیں تو کھڑکیوں میں شگاف بھر تھیں
گھنا اندھیرا شعور میں کائنات بھر تھا
پہاڑ، ندی، شجر، سمندر، فقط مظاہر
وقار تیرا ہماری بے مایہ ذات بھر تھا
بدن کی لذت کہاں ابھی کائنات بھر تھی
نگاہ کا لمس بس حدِ التفات بھر تھا
عجیب شے تھی کسی کی یادوں کی شعلگی بھی
بدن میں چنگاریوں کا طوفان رات بھر تھا

(۲)

گذری ہے میرے پاس سے جو صف بہ صف ہوا
آخر کسے بنائے گی اپنا ہدف ہوا
بے رحم ساعتوں سے نبرد آزما ہے کون
برگِ شجر کا پیٹتی پھرتی ہے دف ہوا
گرد و غبار، سوکھے ہوئے پتے، خار و خس
کیا کیا اچھال دیتی ہے میری طرف ہوا
میں بھی سکھا سکوں کبھی سیلا ہوا بدن
بخشے مری حیات کو بھی وہ شرف ہوا
ٹوٹیں نہ میرے خواب تو اتنا ضرور ہو
بن جائے میرے واسطے لعل وہ ہدف ہوا

"آشوبِ نوا" میں نیاپن اور جدت سے مملو مضامین کا یکا انیا رنگا ہوا ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ آپ اسے بطورِ خاص ملاحظہ فرمائیں اور نظر سے سورج کا ہاتھ بھر فاصلہ طے کر کے پار سے اپنی دنیا کا نظارہ کریں تاکہ آپ کو اس کا اندازہ تو ہو کہ ہماری کائنات رنگ، روپ کی یہ رعنائیاں، اپنے جلو میں پہاڑ، ندی، شجر اور سمندروں کے ٹھاٹ باٹ لئے ہوئے چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کی دنیا کو نہ صرف جگمگا رہی ہیں بلکہ اس کے قیام و استحکام کا سبب بھی بنی ہوئی ہیں لیکن یہ سب کچھ محض ہماری بے مایہ ذات ہی کے دم قدم سے ہے۔

کسی زمانے میں ایک ہی آذر تھا، جس کے فن سے دنیا بھر کے سنگتراشوں اور آرٹسٹوں نے استفادہ کیا، یونانیوں نے تو اس سلسلے کو اتنا فروغ دیا کہ وہ خود بھی زندۂ جاوید ہو کر رہ گئے۔

لیکن اس صدی کے آذروں نے تو رنگ و سنگ سے آگے بڑھ کر لفظی و معنوی ساز و آہنگ کو بھی لپک لیا ہے اور اپنی گوناگوں اور رنگا رنگ صلاحیتوں سے فنونِ لطیفہ کے ہر گوشے کو بہت جتنی ترقی دی ہے اور ایسے ایسے نمونے پیش کئے ہیں کہ وہ بالذات ایک جیتی جاگتی تصویر ہو کر رہ گئے ہیں — "آشوبِ نوا" کا ٹائیٹل بھی اپنی منہ بولتی تصویر ہے جسے سلطان سبحانی نے ایک شاہکار تخلیق کا روپ دیا ہے — ..

(عتیق احمد عتیق)

زرد پتے

شاعری : نوبہار صابر
صفحات : ۱۴۴، مجلد
قیمت : دس روپے
پتہ : مڑیہ آشرم راگھو ماجرہ پٹیالہ

"زرد پتے" پنجاب کے ترقی پسند حلقۂ دانشوراں سے تعلق رکھنے اور آسمانِ شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے اس شاعر کا خوبصورت مجموعۂ کلام ہے جسے ادبی دنیا نوبہار صابر کے نام سے جانتی ہے۔ اس میں اصنافِ سخن کی سب سے زیادہ بدنام مگر سخت جان صنف غزل سے گفتگو کی گئی ہے وہی جدید رنگ روپ میں جنت نگاہ اور فردوس گوش ہے۔

نوبہار صابر کی یہ تیسری کتاب ہے اس سے پہلے ان کی دو

اور کتابیں "کارواں خیالوں کے" اور "دھرتی کی خوشبو" کے عنوان سے چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صابر صاحب ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور رباعیاں بھی مگر "زرد پتے" گواہی دیتے ہیں کہ وہ صرف غزل کے شاعر ہیں۔ اور اپنے موضوعات سے انصاف کرنا جانتے ہیں۔ احساس و اظہار کی سطح پر وہ جس خیال اور جس جذبے کو چھوتے ہیں اس کے لمسِ آتشیں سے صفحۂ قرطاس کو گلنار بنا دیتے ہیں۔ ؎

ساحل سے میرا پاؤں پھسلنے کی دیر تھی
اک موجِ بے پناہ بہا لے گئی مجھے

سوچیے! مصرعۂ ثانی نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اس طرح سے بہت سے اشعار ہیں جن سے صابر صاحب کی قادر الکلامی اور وسعتِ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

دنیا اتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ وہ ادبی قدریں، روایتیں، اور بشارتیں جو کبھی ہمارے لیے توانائی اور مسرت و شادمانی کا سرچشمہ تھیں عصرِ حاضر کے نئے ماحول اور نئی فضاؤں کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی ہیں کہ اس کا ادراک بھی گراں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ حالات و حوادث کی انتہا نہیں ہر طرف سے مسلسل یلغار ہے اگر آج کا انسان خود کو ذہنی کرب و اضطراب کے عالم میں گھرا ہوا محسوس کرے تو چنداں تعجب نہیں البتہ ان حالات و حوادث کو گرفت میں لانا اور انہیں کام کا بنانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں یہ کام تو دانشوروں کا ہے جو اس اتھل پتھل کے باوجود نئی قدروں اور نئے تصورات کو سمیٹنے اور نئی شعری روایات کو بروئے کار لانے میں خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس سلسلے میں بعض شعراء کامیاب ہیں اور بعض ناکام۔

ماننا ہوگا کہ پیکر تراشی اور علامت سازی کا عمل آسان نہیں لیکن "زرد پتے" کے مصنف کی بات ہی کچھ اور ہے اور وہ بہر صورت تلاش و تجسس اور خود شناسی و خود آگہی کے اس موڑ پر آ گئے ہیں جہاں سے ذات و کائنات کا چہرہ دھندلا دھندلا نہیں بلکہ صاف و شفاف نظر آتا ہے اور مایوسی و نامرادی کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں۔ خوش آئندہ تصورات کی ایک جھلک دیکھئے۔ ؎

آج تو دل بھی دھڑکتا ہے تو ڈر جاتا ہوں میں
زندگی میں اس سے پہلے اتنا سناٹا نہ تھا

اک رات میں یہ پیڑ ہوا کیسے بے لباس
کل تک تو اس کا ایک بھی پتہ جھڑا نہ تھا

بیٹھا تھا چھپ کے اوس کی ٹھنڈی پھوار میں
آئی کڑکتی دھوپ اُٹھا لے گئی مجھے

دے کے دستک دیکھنا واپس نہ ہو جائے کہیں
اِک کرن باہر کھڑی ہے اُٹھ کے کھڑکی کھول لے

ذات کی کھوہ سے نکلیں تو کریں سیرِ جہاں
دشت سے پنڈ چھڑائیں تو سمندر دیکھیں

بہرحال یہ شعری سفر اگرچہ تاریک گپھاؤں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گھرا ہوا تھا مگر نوبہار صابر نے بہ آسانی اس سے گزر کر جو خوبصورت "تحفہ" "زرد پتے" کے روپ میں لائے ہیں عزم و حوصلے سے بھرپور ہے۔ سوزِ دل اور خونِ جگر کی ضیاباری سے ہر شعر تمتما رہا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ زرد پتے آنے والی بہاروں کے پیامبر بن گئے ہیں۔

ایک بات اور کہ صاحبِ کتاب نے صرف عصری حسیت اور جدید تقاضوں ہی سے کام نہیں لیا اور صرف اپنی فنی مہارت کا کمال ہی نہیں دکھایا بلکہ بے تکلفانہ اور برجستہ طور پر ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جن میں پنجابی اور انگریزی کے خوبصورت الفاظ بھی نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، مثلاً ؎

دیکھئے کس کی نظر پڑتی ہے
کب سے شوکیس میں رکھا ہوں میں

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کتاب زرد پتے ہر پہلو سے

یہ اذہان و ضمیر کی آسودگی کا سروسامان رکھتی ہے اور اُمید ہے ہر حلقہ میں پسند کی جائے گی ۔

ابتدا میں ڈاکٹر وزیر آغا اور رشی پٹیالوی کی مخلصانہ رائے کے علاوہ محمود سعیدی کا پیش لفظ نہایت عمدہ ہے ۔ موصوف نے صابر صاحب کا شعری تعارف اچھے انداز میں کیا ہے ۔ قیصر سرمست کے "زرد ناگ" ٹائٹل نے عنوان کا حق ادا کر دیا اور کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ کتاب کے ساتھ اس کتاب کی طباعت بھی معیاری اور پسندیدہ ہے ' کاغذ بھی اچھا ہے ۔۔۔ ۔۔

(حفیظ مالیگانوی)

سیال

شاعر : اختر مالیگانوی

صفحات : ۱۶۸

قیمت : چھ روپئے

ملنے کا پتہ : انجمن آئینۂ ادب ' نیاپورہ ۔ مالیگاؤں

"سیال" مشہور و معروف اور جانے پہچانے شاعر حضرت اختر مالیگانوی کی رباعیوں کا مجموعہ ہے اس سے پہلے آپ کے دو اور مجموعے "زبور عرفان" اور "نغمۂ زندگی" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں ۔ ان میں غزلیں نظمیں اور اس میں تمام تر رباعیاں ہیں ۔

اس کتاب کی تقریظ مشہور رباعی نگار جناب سہیل نے لکھی ہے جس میں انہوں نے رباعی کی پیچ در پیچ راہوں اور دشوار گذار مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ـــــ

"اس دشوار گذار راستے کو چھوڑ دیئے نہیں بس چلتے رہیئے
اگرچہ پاؤں ٹوٹ جائیں مگر حوصلہ نہ ہاریئے" ـــــ

ساتھ ہی اختر صاحب نے بھی رباعی کی رنگارنگ بحروں پر گفتگو کی ہے اور اس کے زحافات کا ذکر کیا ہے ۔ واقعی اس مشکل صنف سے نبرد آزما ہونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ اس میں چند در چند مشکلات ہیں جس پر عبور حاصل کیے بغیر نخل آرزو بار آور نہیں ہوتا ۔ خوشی کی بات ہے کہ اختر صاحب نے اس کا بطور خاص لحاظ رکھا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اوزان کا سرا چھوٹنے نہ پائے یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض رباعیاں زبان و بیان کے اعتبار سے بیحد خوبصورت ہیں ؎

کیوں گردِ مصائب سے نہ چہرہ اٹ جائے
کچھ جبر ہی ایسا ہے کہ ہمت ہٹ جائے
ہر زخم پہ جس طور سے ہنستا ہوں میں
ہنسنا پڑے تم کو تو کلیجہ پھٹ جائے

اے موجِ خرامِ یار آہستہ گذر
اے فتنۂ روزگار آہستہ گذر
نازک ہے بہت شیشۂ دل ٹوٹ نہ جائے
اے نکہتِ نوبہار آہستہ گذر

انسان میں شر ہی نہ ہو ایسا تو نہیں
انسان کوئی خیر کا پتلا تو نہیں
انسان سے تقصیر بھی ہو جاتی ہے
انسان بہر حال فرشتہ تو نہیں

سیال کی رباعیاں مختلف موضوعات کے پس منظر میں شاعر کے لطیف اور نازک احساسات و خیالات کی ترجمان ہیں ۔ ان میں ٹھہراؤ ' متانت ' سنجیدگی اور مشاہدے کی گہرائیاں ہیں جو پڑھنے والے کو دنیا جہان کی سیر کراتی ہیں ۔ اس میں پند و موعظت ہی نہیں ساغر و مینا بھی ہے ساتھ ہی کائناتِ عالم کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ رموزِ مملکت اور اسرارِ سیاست بھی کہیں کہیں آشکار ہیں جن سے صاحب کتاب کے جذباتِ عمیق اور نگاہِ دور بیں کا اندازہ ہوتا ہے ۔

سیال کی تمام رباعیاں مختلف عنوانات کے ماتحت ہیں مگر بعض جگہ عنوان ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پورے موضوع کا احاطہ نہیں کرتا ۔ آئندہ اگر اسے درست کر لیا جائے تو بہتر ہے ۔ بعض رباعیوں میں عہدِ گذشتہ کے اشعار کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے لوگ اسے نقص

سے تعبیر کریں گے لیکن چراغ سے ہمیشہ چراغ جلتا ہے ۔ اگرچہ رباعیاں اس قبیل کی ہوں تو قابلِ معافی ہیں ۔ بہر حال سہیل سے ہمیں اس ذہنی رَو کا پتہ چلتا ہے جو بدلتی ہوئی ادبی قدروں کو لیے ہوئے ہماری محفلوں میں دبے پاؤں داخل ہو رہی ہے ۔ مقامی شعراء اگر اس سلسلے میں سرگرم کار رہیں تو ہمارا مستقبل نہایت شاندار ہوگا ۔

رباعی نگار کی حیثیت سے سہیل کے بعد حضرت اختر کی آمد یقیناً فالِ نیک ہے اور نئے نئے تصورات و خیالات کی آئینہ دار ہے ۔ اُمید ہے غزلوں کی طرح اس صنف میں بھی ہمارے ہاں اچھے کہنے والے پیدا ہوں گے ۔۔

(حفیظ مالیگانوی)

شب آشنا

مصنف : انجم عثمانی

قیمت : ۷ روپئے

ملنے کا پتہ :— کتب خانہ محمودیہ دیوبند (یو ۔ پی)

"شب آشنا" انیس افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ کچھ افسانے پختگی کی حد کو چھو کر دادِ تحسین کے طلبگار ہیں تو کچھ افسانے کمزوریوں کی دہائی دیتے ہیں —— "دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے سماجی کاموں کو بہتر ڈھنگ سے انجام دے رہے ہیں ۔ ڈاکٹر پرکاش اگر شادی کرنے کے بعد اسٹوڈنٹس کو اپنی محبت اور پیار دیتے تو اس حالت میں ان کا کردار اور بلند ہو جاتا اور "شہر یہ کے انگ" میں جان آجاتی ۔

"آپ" "سانجھ کے پنکھ" "جو بات تجھ میں ہے" اور "ناسور" وغیرہ روایات سے ہٹ کر اگر عصری اور حسّی ادب کے تقاضوں کو پورا کرتے یا قاری کو جھنجھوڑتے تو شب آشنا کی اشاعت اُردو ادب کے لیے فخر کی بات تھی ۔ بیشتر افسانے تاثر سے خالی ہیں ۔ بے شک لفظوں کی روانی قاری کو کہانی کے ساتھ بہنے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن قاری اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ وہ سوچنے کے لیے اُبھرنے بھی نہیں پاتا ۔

"اپنی ہی آگ میں" افسانہ نگار کے احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہے ۔ روایات کی دیواروں کے خلاف ایک آواز ہے لیکن انجم عثمانی نے اس دیوار کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ اس دیوار کو پھلانگ لگا کر کود جاتے تو ممکن تھا کہ اداس زندگی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ۔

"جیت" میں مجو پہلوان کا کردار انجم عثمانی کی بہترین کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں ۔ "سراب کے سفیر" "سب سے بڑا سچ" ۔ "پانچویں سمت" اور "مکتی" ٹھیک ہیں ۔ انجم عثمانی کا مشاہدہ تیز ہے لیکن ذہنی سوچ کی بھٹی میں اگر اور گھل جاتا تو افسانوں کے کردار کندن کی طرح چمک اُٹھتے ۔ جس طرح خون اور پیپ میں لتھڑا ہوا "آدمی" مہکا ہوا ہے ۔

افسانہ "شب آشنا" کے تاثرات قاری کو سمت کرنے میں مددگار ہوتے ہیں ۔ یہ پستی اور دھیما پن زندگی سے شکست کا احساس پیدا کرتے ہیں ۔ انجم عثمانی جس سیاہ رات سے چمکتے ہوئے سنہرے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں اُسے دیکھنے سے پہلے وہ خود ہی اونگھنے لگتے ہیں اور سورج اپنی کرنیں سمیٹ لیتا ہے ۔

طباعت، کتابت کا رو بار و قلب ہے ۔ مجموعی اعتبار سے شب آشنا احساسات کے مجموعے کی ایسی سیڑھی ہے جو ریت میں سیدھی کھڑی ہے ۔

(عرفان عارف)

ماہنامہ "الفاظ" کراچی

مدیران : آسیہ فاضلی —— مخدوم منور

پتہ : ماہنامہ الفاظ ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳ (پاکستان)

کراچی کی سرزمین سے اُبھرنے والا جدید ادب کا یہ نمائندہ ماہنامہ "الفاظ" ادب کی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام بنانے کی کوشش میں جس تیزی سے سرگرم عمل ہے اس کی مثال اس تیز طوفانی ہوا سے دی جا سکتی ہے جو سمندر کو جھنجھوڑ کر اس کی تہوں سے گوہر آبدار

نکال کر ساحل کے حوالے کر جاتی ہے ۔ "الفاظ" اپنے معیار اور مواد کے لحاظ سے یقیناً ایک مکمل ادبی ماہنامہ ہے ۔ اس کے مدیر جناب اُمید فاضلی خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں ۔ "الفاظ" کی ترتیب و تہذیب میں ان کی سلیقہ مندی بجا طور پر تعریف کی مستحق ہے ۔ زیرِ تبصرہ شمارہ نمبر ۵ - ۶ کے اداریہ میں انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جدید شاعری اپنے عہد کی نمائندگی اسی وقت کر سکتی ہے جب وہ پرانے قاری سے بھی رشتہ برقرار رکھتے ہوئے نئے قاری سے رابطہ قائم کر لے ۔

اس اداریہ کو پڑھنے کے بعد صاف طور پر یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ "الفاظ" جدیدیت میں نہایت سلجھے ہوئے اندازِ فکر کا جریدہ ہے ۔ فیشن پرستی، دھما چوکڑی اور تماشہ بازی سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ۔ جدید ادب کے نام پر آجکل جتنے بھی رسالے نکل رہے ہیں ان میں زیادہ تر رسائل ایسے ہیں جن میں جدیدیت کا کوئی عمیق اور فکری میلان نہیں ملتا بلکہ وہ ایک فیشن اور فارمولہ کے گرد طواف کر رہے ہیں ۔ ایسے وقت "الفاظ" جیسے سنجیدہ اور معیاری رسالہ کی سخت ضرورت ہے تاکہ جدیدیت کا اصلی اور واضح چہرہ کھل کر سامنے آسکے ۔

افسانوں کی صف میں جوگیندر پال کا افسانہ "سیدھی سی بات" سیدھی سی بات کے باوجود ذہن میں ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے ۔ قدسیہ انصاری کا افسانہ "سودا" آج کے جدید دور میں غلامی کی زندہ مثال پیش کرتا ہے ۔ بشیشر پردیپ کا افسانہ "راکھ اور تصویر" روایتی اندازِ بیان کا افسانہ ہے اور اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے ۔ "میرا سفرِ شب" خالدہ شفیع کے ناول کا ایک باب ہے لہٰذا اس کے مکمل ہونے تک ابھی کوئی تبصرہ نہیں کیا جاسکتا ۔

نظموں میں عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، حفیظ صدیقی، اور محمد علی بہتر ہیں ۔ اس شمارہ میں ۱۵ غزلیں ہیں جن میں رئیس فروغ، تبسم رضوی، راشد مفتی اور تنویر قاضی کی غزلیں حاصلِ مطالعہ قرار دی جاسکتی ہیں ۔

مضامین ۳ ہیں جن میں مخدوم منوّر کا مضمون "پروز پوئم ۱۹۷۵ء - ۷۶ میں" نہایت اہم اور قابلِ مطالعہ ہے لیکن مطالعہ کے بعد یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ اردو پروز پوئم کا صرف دو سالہ جائزہ کیوں ؟ کیا نثری نظموں کا "دور" اتنا محدود ہے ؟ ..

(مشتبم میرزا)

دوماہی "کوہسار" ہزاری باغ

مدیر ـــ مناظر عاشق ہرگانوی (معاون) علی منیر

زرِ سالانہ ـــ بارہ روپئے

پتہ ـــ دوماہی کوہسار "تکمیل" ہزاری باغ (بہار)

"کوہسار" کا پہلا شمارہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اردو کے معیاری رسائل کی ٹوٹتی ہوئی صف میں اب پھر سے جوش و خروش آچلا ہے ۔ اس سال موجودہ ادبی بحران کو ختم کرنے کے لیے کئی نئے جریدے ایک ساتھ منظرِ عام پر آگئے ہیں ۔ ان رسائل کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ برسوں سے ادب میں در آئی ہوئی یکسانیت اور بے حسی کا سختی سے احتساب کیا جائے گا اور ادب کی ترقی و بقاء کے لیے فکر و فن کے کچھ نئے دریچے وا ہوں گے ۔ کوہسار انھیں نئے رسائل میں سے ایک ہے جو ادب کی اس مسموم اور گمراہ کن فضا کو بدلنے میں یقیناً ایک اہم ادبی رول ادا کرے گا ۔ اس کے پہلے شمارے کا اداریہ اسی جوئے شیر کو کھینچ لانے کا عہد کرتا ہے اور عصری ادب پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہوئے نئے افق کی جانب کشادگی سے تک رہا ہے ۔ مناظر عاشق ہرگانوی اس رسالہ کے مدیر ہیں ۔ ان کی تحریریں ہندو پاک کے ہر چھوٹے بڑے رسالہ کی زینت بنتی ہیں ۔ سنہ ۶۰ء کے بعد آنے والی تازہ وارد نسل میں ان کا نام نہایت اہم ہے ۔ کوہسار کے پہلے ہی شمارے میں انہوں نے بہت سے نئے پرانے ادیبوں کو سمیٹ لیا ہے اس سے ان کے وسعتِ تعلق کا پتہ چلتا ہے ۔ اس رسالہ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے

کہ اس کی ترتیب اور مزاج سازی میں جدید رسائل کی تقلید سے انحراف کیا گیا ہے اور یہ قابلِ تعریف کوشش ہے۔ جدیدیت کی تقلید دراصل سستا پن، ذہنی قلاشی، نام و نمود کی پرستش اور اداکاریاں ہیں۔ ہندوستان میں جدیدیت اپنی عمر اور بنیاد بہت پہلے کھو چکی ہے، وہ نئی نسل کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ نئی نسل تو خود رو اور تیز رو ہے۔ وہ اپنے فکر و فن کی مشعل خود اپنے ہاتھوں میں سنبھالے گی۔ مستعار اُجالے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں نظم و نثر کا انتخاب عمدہ ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس سے انٹرویو۔ مناظرِ فطرت اور اقبال، جدید اردو غزل میں جنس قابلِ مطالعہ مضامین ہیں لیکن "چھوٹا ناگپور میں اردو کے مسائل اور ان کا حل" اخباری سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ قمر رئیس صاحب سے انٹرویو میں مناظر صاحب ترقی پسند ادب اور گزشتہ جدید ادب پر کوئی سوال نہ شامل کر سکے اس لئے کچھ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ علی منیر نے قدیم اور جدید جنسیت کا نہایت شاندار تجزیہ کیا ہے۔ جدیدیت کے دورِ عروج کی اردو غزل میں جو بھونڈا اور بھونڈی جنسیت ایک "تحریک" بن کر اُبھری تھی۔ اس نے جدید ادب کے ایک بہت بڑے حصّہ کو غیر ادبی اور ناقص کر دیا تھا۔ جنس نگاری ایک نازک اور نفسیاتی عمل ہے۔ بہت کم جدید شعراء نے اسے ایک صحت مند موضوع سمجھ کر اپنایا ہے۔

اس شمارے میں راہی صاحب کی ایک نظم بطور تجزیہ پیش کی گئی ہے جو دلچسپیاں بکھیرتی ہے اور ثابت کرتی ہے ——

"شانِ نزول یوں ہی تو ہوتی ہے آجکل"

ابتدائی صفحات پر آزاد غزل پر مباحثہ کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ آزاد غزل کے بارے میں غیر ہمدردانہ طور پر یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ "حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب"

شاعری کے باب میں انسان دانش، احمد ندیم قاسمی، شہرت بخاری، حرمت الاکرام، ظہیر غازی پوری، نصر قریشی، مظفر حنفی، حصیر نوری اور افتخار امام صدیقی ذہن پر خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں۔ افسانے مع ترجمہ چار ہیں۔ انور سجاد کا افسانہ "شناخت۔ ایک نئے شہر کی ایک رات" کا افسانہ ہے جس میں محبت، جنس، ناآسودگی، بے سروسامانی اور اُمید کو احساسات کے ذریعے خوبصورتی سے بن دیا گیا ہے جس سے افسانہ موثر ہو گیا ہے۔ نظام صدیقی کا افسانہ "آگ اور گلاب" ایک نفسیاتی تجزیہ ہے جس میں جنس کے مختلف پہلوؤں کو نہایت فنکاری سے اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حمید سہروردی کا افسانہ "رات: ایک مکالمہ" ان کے دوسرے نیم افسانوں کی طرح "نیم نثر، نیم نظم" ہے جو کسی بھی طرح افسانے کے فنی تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔ وہ لکھتے بہت ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں افسانے نہیں لکھتے۔

"کوہسار" کا یہ شمارہ سنجیدہ قارئین کے درمیان قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانا چاہیے۔ تاکہ یہ چراغ روشن رہے۔۔

(سلطان سبحانی)

ماہنامہ "اب" گیا

مدیران —— تاج انور۔ فرحت قادری (تشکیل و تنظیم) سرور عثمانی

زرِ سالانہ —— بیس روپئے

پتہ: —— ماہنامہ "اب" اثر پبلیکیشنز، کریم گنج، گیا (بہار)

ماہنامہ "اب" فکر و نظر کی وسعتوں کا عکاس بن کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ترتیب، انتخاب اور خوبصورتی کے لحاظ سے یقیناً توجہ کا مستحق ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب گیا سے کئی معیاری جریدے شائع ہونے لگے ہیں۔ "کوہسار" کی طرح "اب" بھی گزشتہ کچھ برسوں سے ادب پر چھائے ہوئے جمود پر جھنجھلا کر میدان میں آیا ہے۔ اب ایسے وقت شائع ہوا ہے جبکہ جدیدیت کا دورِ سفر ختم ہو چکا ہے۔ صرف دہاڑ اور بھڑاؤ کی گرم بازاری ہے۔ تخلیقی سوتے خشک ہو چکے ہیں،

نقاد گروہ بندیوں میں پھنس گئے، افسانہ ہاتھ سے نکل گیا۔ شاعری انسانی جد و جہد اور حوصلوں سے سمجھوتہ نہیں کر سکی جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ ادب پر ایک کاروباری قسم کی مصنوعی فضا مسلط ہے۔ ایسی حالت میں نئی نسل کے لیے ایک نئی سمتِ سفر کی ضرورت ہے۔ اسے ایک نیا رجحان ایک نیا اندازِ فکر ہی بچا سکتا ہے۔ جو نام بن چکے ہیں انھیں نئی نسل کے کسی بھی مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں حالاں کہ مستقبل کے ادب کی باگ ڈور ہمیشہ نئی نسل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

"اب" جن ادیبوں نے شائع کیا ہے وہ سنجیدہ، ذہین اور ہوش مند ہیں۔ وہ ادب کی صحت مند قدروں اور فکر و نظر کی وسعت پر یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے اب شور، ہنگامہ اور طوفان برپا کرنے کے لئے یا اپنے نام کا سکہ رائج کرنے کی غرض سے نہیں جاری کیا۔ وہ باغی اور سرکش بھی نہیں۔ وہ ادب کی بساط پر چھاپہ مارنے کے لئے نہیں بلکہ ادب کی ترقی و بقا، اور تخلیق کی حمایت میں اٹھے ہیں لہٰذا ان کی حوصلہ افزائی ہر ہر قدم پر ہونی چاہیئے۔ آج ادب جس موڑ پر کھڑا ہے اس پر اظہار کے لیے صاف گوئی اور بے باکی بہت ضروری ہے، بغیر صاف گوئی اور بے باکی کے کوئی بھی نئی نسل دھند سے باہر نہیں آ سکتی اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔ خاموشی یا مصلحت پسندی موت سے سمجھوتہ کرنے کے مترادف ہے۔ سچائی جب تک خاموش رہتی ہے گنہ گار رہتی ہے۔ نئی نسل میں سب سے پہلی بلند اور بے باک آواز ظہیر غازی پوری نے اٹھائی ہے اور یقین ہے ہر حساس فن کار اپنے اندر یہی آواز محسوس کر رہا ہوگا۔

اب کے پہلے شمارے میں سات افسانہ نگاروں کے نام ہیں۔

رام لعل، جوگیندر پال، افسر آذر، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، احمد یوسف اور شفیع جاوید۔ ان میں کئی افسانے بہت اچھے ہیں اور کئی افسانے اپنی روح سے بچھڑ کر بے اثر ہو گئے ہیں۔ یہ آسمانی صحیفوں کی سی باتیں، یہ فلسفہ، یہ تقریر، یہ گپ شپ یہ تک حجاب کی ادائیں افسانوں کو کب تک درس بے خودی دیتی رہیں گی، افسانہ کب تک ہذیان کا شکار رہے گا؟ وہ قد آور افسانے کہاں چلے گئے جن کی مقبولیت کے لئے فن کاروں کی سفارش یا کسی پبلسٹی کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

شعری حصہ وزن دار ہے۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب گہری نظروں سے کیا گیا ہے۔ مضامین دو ہیں اور دونوں بے حد معیاری فکری و تحقیقی ہیں۔ "البرٹ کی ہیٹ احمد کے سر" ہر لحاظ سے تعریف کا مستحق ہے۔ یہ سلسلہ اگر جاری رہے تو ناقدین کی زبردست خدمت ہوگی۔

اداریہ اور تبصروں سے گہری فکر و بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسالہ اگر متواتر شائع ہوتا رہا تو بہت جلد معیاری رسائل کی صف میں نمایاں مقام حاصل کر لے گا ــــ ..

(سلطان سبحانی)

ارتکاز

- اسلم شیخ
- غالب عرفان
- شموئیل عالم
- مجید ساقی
- سعید احمد قادری
- اسلام عشرت
- عبدالقیوم ابدالی
- مشتاق جاوید
- ڈاکٹر شاہ زادہ
- م ۔ ب ۔ ا ۔ علوی

• اسلم شیخ ـــــــــ ملتان (پاکستان)

ہم زبان کا نیا شمارہ نظر سے گذرا ۔ اتنا معیاری پرچہ شاندار گیٹ اپ کے ساتھ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ۔ اور سب سے زیادہ مسرت اس بات کی بھی ہے کہ آپ کی پالیسی غیر متعصبانہ ہے اور آپ بلاتفریق مذہب وملت ہر قسم کے لکھنے والوں کو برابر کا موقع دے رہے ہیں ۔ حتیٰ کہ آپ ہم زبان میں پاکستانی مصنفین کو بھی چھاپ رہے ہیں جبکہ پاکستانی رسائل اس معاملہ میں جس قدر تعصب برت رہے ہیں اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہوگی ۔ ماسوائے ایک دو پرچوں کے باقی سب رسائل لگاتار بائیکاٹ کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ چھوت کی بیماری کے جراثیم کی طرح ہندوستان کے ادیبوں شاعروں سے بچو اور ہرگز ان کی حوصلہ افزائی نہ کرو ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں پاکستان میں متعصبانہ پروپیگنڈہ کرنے والے خود دوڑ دوڑ کر اپنے مضامین وتخلیقات ہندوستانی پرچوں میں چھپوا رہے ہیں بلکہ خیال کی نگارشات تو میں نے خود ہم زبان میں دیکھی ہیں ۔ اس منافقانہ پالیسی کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ بریں عقل ودانش بباید گریست ۔

ہندوستانی پرچے بڑی قربانی سے اُردو کی شمع کو زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ دنیا بھر میں اگر اُردو کا بھرم قائم ہے تو صرف ہندوستانی ادیبوں کی خون پسینے کی محنت اور شبانہ روز مشقت سے ۔ یہاں پاکستان میں اُردو کے رسائل ہیں کتنے ؟ صرف گنتی کے چند اور وہ بھی سال میں ایک آدھ بار ہی مشکل سے نکلتے ہیں ۔ ورنہ اکثر ایسے بھی ہیں کہ ڈبکی لگا کر دو سال سے پہلے نکلنے کی ہمت نہیں کرتے ۔ البتہ ضخامت پاکستانی پرچوں کی بہت زیادہ ہوتی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستانی رسائل ماسوائے ایک آدھ کے اکثر ایسے ہیں کہ پہلے باقاعدہ لکھنے والوں سے سودے بازی کرتے ہیں اور سال چھ ماہ آرام سے بیٹھ کر پہلے مشہور حضرات سے اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر بڑے بڑے اشتہارات کے ذریعے رقم بٹورتے ہیں اس کے بعد اہلِ قلم حضرات سے سودے بازی ہوتی ہے اور اشتہاروں کی اُجرت کی طرح لکھنے والوں سے بھی باقاعدہ

ان کی تخلیقات چھاپنے کا بھاری معاوضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کی تخلیقات ان رسالوں کی زینت بن سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روز بروز لکھنے والے اردو ادب سے بدظن ہو کر مقامی زبانوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اردو رسائل میں تو کسی غریب اہلِ قلم کے شائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کچھ پرچے ایسے بھی ہیں جو بڑے بڑے رئیسوں نے اپنی نمبرداری اور ادبی ساکھ قائم کرنے کے لئے شروع کئے ہیں کیوں کہ یہ رئیس اہلِ قلم ماشاء اللہ خود جو بھی لکھتے ہیں وہ بس واجبی ہی واجبی ہوتا ہے۔ اور اگر یہ خود اپنا پرچہ نہ نکالیں تو کوئی دوسرا انہیں ہرگز ہرگز گھاس ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ نمبردار قسم کے مدیر ادیب بڑے طمطراق سے اپنے پرچے نکال کر یا پھر دوستوں میں مفت تقسیم کراتے ہیں اور کچھ غیر ملکوں کے لکھنے والوں کو بھی بھیج دیتے ہیں تاکہ دوسرے ممالک کے ادیبوں میں بھی ان کا ساکھ جمی رہے۔ اب باہر کے لکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں اردو کی بہت خدمت ہو رہی ہے۔ انہیں اصل معاملہ کا کیا علم اور اصل ٹریجڈی کا انہیں کیا پتہ کہ جس کا نشانہ غریب اہلِ قلم بڑی بے دردی سے بن رہے ہیں۔ ناشرین نے کتابیں اور شعری مجموعے چھاپنا انہیں عرصہ سے بند کر رکھا ہے اب شاعروں کے لئے لازمی ہو گیا ہے کہ وہ اپنا مجموعہ خود چھاپیں یا غریب کے ہاتھوں لیس کر حقیقتاً فنکاروں پر جو گذر رہی ہے اس کا اندازہ دور رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اکثر ہندوستان کے دوست اپنی غزلیں اور نظمیں بھیجتے ہیں کہ انہیں پاکستانی پرچے میں چھپوا دیجئے۔ اب میں کیا حقیقت ان کی خدمت میں تحریر کروں کہ پاکستانی پرچوں کے دروازے تمام لکھنے والوں پر بالکل بند ہیں سوائے ان لوگوں کے کہ جو مدیران کرام کی خدمت میں بھاری نذرانہ پیش کر کے انہیں خوش کر سکیں ورنہ کسی عام آدمی کے چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ آپ سے التماس ہے کہ مہربانی فرما کر ہم زبان مجھے پابندی کے ساتھ بھجوا دیجئے، آپ کا احسان ہوگا۔

• **غالب عرفان ـــــــ حیدرآباد**

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ حسبِ دستور خوب سے خوب تر کی تلاش کا جیتا جاگتا ثبوت تھا اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب آپ کی انتھک محنت اور لگن ہے جو پرچے کے معیار کو بلند کرتی جا رہی ہے۔ سرورق نہ صرف حسنِ امتزاج کا نمونہ تھا بلکہ (حکیمگور میں ہونے والے انتخابات کے پیشِ نظر) حسنِ اتفاق کی بھی بہترین مثال رہا۔ "اختلافات" کے عنوان کے تحت نہ جانے آپ اختلافات کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں کہ آپ کی فہم و دانش پر رشک آنے لگتا ہے۔ تنقید نگار کی خود نمائی یقیناً آج کے اردو ادب کا المیہ ہے۔ اور اپنے اداریئے میں آپ نے جس خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ اس چبھتے ہوئے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

مجنوں گورکھپوری صاحب مشاہیرِ اردو میں سے ہیں لہٰذا ان کے مضمون کے متعلق کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ "ہم زبان" کو اسی قسم کے معلومات آفریں مضامین کی مزید ضرورت ہے۔

"ادب اور قاری" منظر امکانی کا نہایت ہی حسین تجزیہ ہے اور افسانوں میں "فرضی کہانی" ایک ایسی حقیقت سے روشناس کراتی ہے جو آج کے ادیب میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ خود اپنے ہی طبقے کی دھجیاں اڑا کر شاہد پرویز نے جس طرح حقائق کا پردہ فاش کیا ہے وہ ان کی وسیع النظری اور روشن دماغی کی دلیل ہے۔

حصۂ نظم میں اس مرتبہ غزلوں کا پلڑا بھاری رہا۔ بہت ساری سچی سچائی غزلیں پڑھنے کو ملیں۔ ظہور نظر اور سلیم کوثر کی غزلیں خاص طور پر دل موہ لینے والی تھیں، بے حد پسند آئیں۔

ہاں کتابت کی غلطیوں پر قدرے قابو پا لیا گیا ہے پھر بھی کئی جگہوں پر ان کا وجود بہرحال ہے۔

ظہور نظر کی غزل (صفحہ ۳۲) کے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ غالباً یہ ہے ؎

"دیکھنے ہوں مہ وشانِ شہر گر، اے شہر یار"

اس مصرعہ کو کاتب صاحب نے لکھتے وقت کچھ اس طرح لکھ دیا ہے کہ ہر قاری کے بس کی بات نہیں کہ شعر صحیح پڑھ لے۔ لفظ "مہوشاں" ملا کر لکھ دیا گیا ہے جو حالاں کہ غلط تو نہیں ہے لیکن جدید اردو میں ایسا لکھنا تقریباً متروک ہو چلا ہے۔ اسی مصرعے میں آگے چل کر "گر، اے" (गर अय) اس قدر قریب کر دیا گیا ہے کہ وہ "گرائے" (गिराये) پڑھا جا رہا ہے اور پورا شعر ہی بے بحر اور بے مطلب ہوا جا رہا ہے۔

اسی طرح نوبہار صابر کی دوسری غزل (صفحہ ۳۴) کے تیسرے شعر کا مصرعہ اولیٰ ہے۔ ؎

"سامنا اِن کے ہوا کا ...... ہوا"

اس میں "ہوا کا" کے بعد ایک لفظ چھوٹ رہا ہے اور میرے خیال میں وہ لفظ "نہ" ہونا چاہیے۔ اگلے صفحہ پر صلاح الدین نیّر کی پہلی غزل کے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ بھی اسی عیب سے پُر ہے۔

"ترے دامن کی شہرت ...... بہت ہے"

مصرعے میں لفظ "شہرت" کے بعد ایک لفظ (غالباً) "تو" چھوٹ رہا ہے جو یقیناً کاتب صاحب کی نوازش ہے۔

صفحہ ۴۳ پر مجید ساقی کی غزل کے چھٹے شعر کا پہلا مصرعہ پرچے میں یوں ہے ؎

"تازہ ہے ہر .... زخم جو بھید لوں سے ملا ہے"

اس مصرعے میں بھی لفظ "ہر" کے بعد "اک" یقیناً ہوگا جو شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔

سبھی بہ تبصرے بھی اس مرتبہ کافی با وقار تھے اور مجموعی طور پر متاثر کن بھی۔

• شمشیل عالم ——— مونگیر، بہار۔

• ہم زبان کے تازہ شمارہ میں بزرگ ناقد مجنوں گورکھپوری صاحب کی باتیں بہت حد تک معلوماتی ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں مضمون التباس کا شکار ہو گیا ہے: "ترقی پسند تحریک اور میں" کے تحت اس اتبدا کو ایک سلسلہ کی شکل بنایئے۔ اور دیگر وابستہ قلمکاروں کو اس موضوع پر دعوت تحریر دیجئے۔ منظر امکانی اور رونق زیدی کے مضامین بھی خوب ہیں شعری حصہ کمزور ہے لیکن افسانے پُرکشش ہیں۔ خصوصاً رشید امجد کی کہانی "دھندریت" اور راشد احمد کی کہانی "پانچویں سمت" کچھ سوچنے کھینے پر مجبور کرتی ہے۔ رشید امجد جو نئی کہانی کی صالح شناخت رکھتے ہیں لہذا "دھندریت" ہر پہلو سے اپنے آپ میں مکمل نظر آتی ہے۔ راشد احمد کی کہانی "پانچویں سمت" ترسیل کی ناکامی اور کامیابی سے گذر کر طبعیاتی نظام میں مابعد الطبعیاتی تلاش پر ایک جارحانہ طنز کرتی ہے۔ راشد احمد کی کہانی اس لیے بھی اہم ہے کہ گیا میں رہ کر گوتم بدھ کو توڑنے کی شاید اب تک کسی نے کوشش نہیں کی تھی۔ اسلم سلازار کی کہانی فیشن کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

آخر میں گذارش کروں گا کہ آپ افسانوی حصہ میں قمر احسن، شوکت حیات، عبدالصمد، سلام بن رزاق، ساگر سرحدی، سید محمد اشرف، موہن لال وجوگیندر پال، حسین الحق وغیرہ سے نئی کہانیوں کا تعاون حاصل کریں۔

اس بار آپ کا اداریہ حاصل شمارہ چیز ہے۔ میں بھی آپ کے خیال سے متفق ہوں ......

• مجید ساقی ——— ہبلی

اس بار مضامین خوب رہے ......

خاص طور پر مجنوں گورکھپوری، منظر امکانی، اور رونق زیدی صاحب کے مضامین فکر انگیز ہیں اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن رونق زیدی صاحب کچھ ادھا پچھ ڈرامے اوران کے مُکنفون

کے نام لینے سے روگیں جیسے "اندھیرے اُجالے" (مصنف ابراہیم جلیس مرحوم) ۔ "اور انسان مرگیا" رامانند ساگر ـــ اظہر افسر، ابراہیم یوسف وغیرہ کیا ہی اچھا ہوا اگر آپ کچھ صفحات ادب کی اس صنف کے لیے بھی مخصوص کر دیں ۔

افسانوی حصے میں رشید امجد، عشرت ظہیر، اسلام سلالار اور محسن علی کے افسانے بہتر ہیں ۔ لیکن شاہد پرویز کی "فرضی کہانی" پتا نہیں کیوں فرضی لگتی ہے ۔

ظہور نظر، رئیس مالیگانوی، سلیم کوثر، شاہین مفتی، رزاق اور عقیل نوری کی غزلوں نے متاثر کیا ۔ لیکن یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ اس بار نظمیں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ (ویسے دونوں نظمیں اچھی ہیں) اس لئے کہنا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر ...... !

● سعید احمد قادری ـــــ گیا (بہار)

زیر نظر شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کی بات چیت "ترقی پسند تحریک اور میں" اہمیت کی حامل ہے ۔ خاص طور پر ان کا یہ خیال کہ ـــ "..... جب تک کوئی پروگرام نہیں ہوگا، یہ (ترقی پسند تحریک) آگے نہیں بڑھ سکتے، وہی پرانا ایک راگ ہم اب نہیں گا سکتے ۔ ہر راگ کا ایک وقت ہوتا ہے، اس کا وقت گذر گیا .... ماحول کو دیکھتے ہوئے، جس نظام میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم اپنے لئے ایک اسکیم بنائیں، پروگرام چاک آؤٹ کریں، مگر ایسا ابھی نہیں ہو رہا ہے ...." مشعل راہ ہے ۔ ضرورت ہے کہ ان کی باتوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا جائے اور عمل ہو ۔

افسانے رشید امجد، راشد احمد اور شبنم سحر کے خاص طور پر پسند آئے ۔ راشد احمد کو غالباً آپ نے پہلی بار ادبی دُنیا سے متعارف کرایا ہے ۔ ایسے لوگوں کی بہرحال ہمت افزائی ہونی چاہیئے جن کے اندر فنی اور تخلیقی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو ۔

سید محمد عقیل کے اس مشورے سے میں متفق نہیں ہوں کہ ـــ "پاکستانی جرائد کے رسالہ کی بجائے ہندوستان کے نئے لکھنے والوں کا تعاون حاصل کیا جائے ۔" نئے لکھنے والوں کا تعاون ضرور حاصل کیجیے، لیکن پاکستان کی اہم اور معیاری تخلیقات کو بھی ضرور شامل اشاعت کیجیے ۔ تاکہ ہم اپنے پڑوسی اور دوست ملک کی ادبی سرگرمیوں سے روشناس ہوتے رہیں ۔ یوں بھی ابھی ہند و پاک کے تعلقات اتنے بہتر نہیں ہیں کہ پاکستانی پرچے بہ آسانی منگا کر مطالعہ کیا جائے ۔ اس ضمن میں ہند و پاک کے ڈاک خرچ سدِ راہ ثابت ہو رہے ہیں ۔ اس لئے ضروری ہے کہ فی الحال ہم ہمعصر ثقافتی پرچوں کے ذریعے ہی پاکستان کی ادبی اور معیاری تخلیقات سے مستفیض ہوتے رہیں ۔

ایک شکایت اور ـــــ افسانہ نگار سلطان سبحانی پر ایڈیٹر سلطان سبحانی کیوں سوار ہوتا جا رہا ہے ۔ عرصہ سے بالکل غائب ہیں ـــ ..

● اسلام عشرت ـــــ اورنگ آباد (بہار)

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ (اگست، ستمبر و اکتوبر) دیکھا ۔ زیر نظر شمارہ طباعت و کتابت کے لحاظ سے بہت بہتر ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب و انتہائی دلکش ہے ۔ اس شمارہ میں "اختلاف" (اداریہ) عنوان کے تحت جو سوال آپ نے اٹھایا ہے وہ حقیقت پسندانہ اور نہایت ہی منصفانہ ہے ۔ لہٰذا میں آپ کے اس خیال کی پرزور حمایت کرتا ہے ۔ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اسی طرح ہمیشہ اچھے اور معیاری قسم کے مضامین زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں ۔ کیوں کہ میرے خیال میں کسی بھی رسالہ کا معیاری ہونا اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس میں معلوماتی اور گراں قدر مضامین شائع ہوتے ہوں ۔ گویا آپ کو حصۂ نثر پر توجہ خاص دینے کی ضرورت ہے ۔ سلیم اختر اور منظر امکانی کے مضامین ادب کے بعض نئے گوشوں کی نقاب

کشائی کرتے ہیں۔

افسانوں میں عشرت ظہیر اور شاہد پرویز کے افسانے بے حد پسند آئے۔ مجید ساقی، افضل منہاس، صلاح الدین نیر اور اکبر حمیدی کی غزلیں یقیناً پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ اس بار نظموں کی کمی کا احساس شدید ہوتا ہے۔ تبصرے عمومی طور پر ٹھیک ہیں۔

بہرکیف بحیثیت مجموعی یہ شمارہ پچھلے تمام شماروں سے بہتر اہم اور قابلِ داد ہے۔

• عبدالقیوم ابدالی ——— رانچی

"ہم زبان" کا چھٹا شمارہ ملا۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔

میں سب سے پہلے غالب عرفان صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا" ("اخیر" غالباً عربی کا لفظ ہے جس کے معنی "the Last" کے ہیں اور "اخیر میں" سے میں نے "At the Last" مراد لیا ہے لفظ "نظر" ہم زبان کے کاتب کی نہیں میرے کاتب کی غلطی ہے جس میں میری کوتاہیوں کو بھی دخل ہے) بہرحال میں غالب عرفان صاحب کا شکر گزار ہوں۔

بزرگ نقاد جناب مجنوں گورکھپوری ہر زمانے میں اپنے بصیرت افروز مضامین سے ترقی پسندوں کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ "ہم زبان" میں ان کے مضمون کی شمولیت بلاشبہ باعثِ فخر ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین بھی علمی پختگی لئے ہوئے ہیں۔ تنقید پر آپ کا اداریہ بھی متاثر کرنے والی چیز ہے۔ نئے لکھنے والوں کو اس سے روشنی ملے گی۔ "نشاط شاہدوی" اور "احمد ظفر" دونوں کی نظمیں معیاری اور قابلِ تعریف ہیں۔ غزلوں میں ظہور نظر، رئیس مالیگانوی، رزاق افور، حصیر نوری اور مجید ساقی کی غزلیں بہت پسند آئیں۔

افسانوں میں نہ جانے کیوں کوئی کہانی مجھے متاثر نہ کر پائی۔

عتیق صاحب کے تبصرے بھی پسند آئے۔ یقین ہے آپ کی ادارت میں "ہم زبان" اسی طرح ترقی کے مراحل طے کرتا رہے گا ——

جدید اُردو افسانہ اور اس کے مسائل

عبدالقیوم ابدالی —— رانچی

اُردو افسانوی ادب کی عمر یوں تو بہت زیادہ نہیں ہے لیکن اس مختصر عرصے میں اس صنف نے اس قدر مراحل طے کئے ہیں اس قدر تجربوں سے گزرا ہے اور اتنے انقلاب دیکھے ہیں کہ اب اس کا شمار بے دریغ دوسرے ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستانیوں کی مغرب پسندی ہر جگہ آڑے آتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں کچھ چیزیں یہاں اچھی تخلیق ہوئی ہیں وہیں زیادہ تر چیزیں مرض مغرب کی تقلید اور فیشن کی شکل میں سامنے آئی ہیں۔

یہ بدقسمتی اُردو افسانوں کی بھی قسمت رہی ہے۔ جہاں اچھے افسانے لکھے گئے وہیں ایسے افسانوں کی بھی کمی نہیں جنھیں اب نام سے بھی یاد نہیں کیا جاتا۔

اُردو افسانہ اپنے اولین دور سے ہی سماجی مسائل کا آئینہ دار رہا ہے۔ کبھی اس سے اصلاح نگاری کا کام لیا گیا تو کبھی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ کبھی اس سے قومی یکجہتی کے ترانے گائے تو کبھی بے حسی زندگی پر آنسو بہائے۔ مختصر یہ کہ اس نے انسانی مسائل، اس کے حالات اور اس کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ افسانوں میں سب سے اہم چیز اس کا مواد یا CONTENT ہوتا ہے۔ اس کا مواد جتنا جاندار ہے اس کا افسانہ اتنا ہی زوردار ہوگا۔ یہ مواد افسانہ نگار کے ذاتی تجربے کی دین ہوتا ہے۔ افسانہ نگار بھی دوسرے انسانوں کی طرح جس ماحول میں رہتا ہے وہاں سے اس کے کچھ رشتے ہوتے ہیں۔ انہی رشتوں کی بنیاد پر وہ کبھی خوش ہوتا ہے تو کبھی اداس کبھی اس کی ہمت افزائی ہوتی ہے تو کبھی وہ مایوس ہوتا ہے گویا اس بھری پُری دنیا میں جو کچھ اس پر گزرتا ہے اس جیسے ہزاروں انسانوں پر گزرتی ہے۔ وہ اسے افسانوں میں بیان کرتا ہے۔ زمانے اور حالات میں

تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل بھی تبدیل ہوتے رہے ۔ ان مسائل کو بیان کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہ پیش آئے اس لئے فن کے پیکر اور فن کے معیار بھی تبدیل ہوتے رہے ۔ پہلے پہل جب یہ محسوس کیا گیا کہ سماج میں بے شمار برائیاں پھیل گئی ہیں ان کو دور کیا جانا چاہیئے تو اصلاح نگاری سے کام لیا گیا لیکن جب مسلسل کوشش کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی یا بہت معمولی تبدیلی آئی تو پھر انقلابی رنگ اپنایا گیا ۔ اس رنگ نے جنگ آزادی کے شعلوں کو ہوا دی اور پھر ملک آزاد ہو گیا ۔ لیکن تقسیم کے غلط فارمولے نے تعصب اور تنگ نظری کی آگ جب بھڑکائی تو ہمارے افسانہ نگاروں نے محبت اور اخوت کے دیپ جلائے ۔ جب بنگال میں قحط پڑا تو ہمارے افسانوں میں بنگال زندہ ہو گیا ۔ لیکن کل تک کے مسائل دوسرے تھے آج کے مسائل قطعی دوسرے ہیں ۔ کل کا انسان بے انتہا حساس تھا آج کا انسان بالکل بے حس ہے ۔ کل پورا ملک ایک کنبہ کی طرح تھا آج پڑوسی پڑوسی سے واقف نہیں ہے ۔ کل محلے میں اگر کسی پر کوئی مصیبت پڑتی تھی تو سب دوڑ پڑتے تھے ۔ آج ہمارے سامنے اگر کسی کا خون ہوتا ہے تو ہم نظر بچا کر نکل جاتے ہیں ۔ کل لوگوں کے پاس اپنی بات کہنے اور دوسروں کی بات سننے کا وقت تھا ۔ آج لوگ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور نہ کچھ سننا ۔ بڑھتی ہوئی بیکاری اور بیروزگاری و مہنگائی نے باپ کو بیٹے سے بدظن کر دیا ہے ۔ ایسے میں بے چارہ افسانہ نگار جو اپنے ہی مسائل میں گھرا ہوا ہے کہاں تک دوسروں کی کہانی لکھے ۔ اور پھر مسائل کچھ اس قدر زیادہ اور اتنے پر پیچ ہیں کہ ایک ہی موضوع پر زیادہ دیر تک ذہن سوچ نہیں سکتا اس لئے افسانوں میں ریزہ ریزہ خیالات در آئے ہیں ۔ پھر فلموں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن یا Mass Media اور Communication کی دوسری سہولتوں نے دل بہلانے کے اس قدر اور اتنے سستے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں کہ فن کار یا افسانہ نگار کے خشک اور بے رس افسانے پڑھنے یا سننے میں کون اپنا وقت ضائع کرے گا ۔ دوسری طرف فن کار کو بھی کچھ تو چاہیئے، مقبولیت نہ سہی شہرت ہی سہی ۔ ایک عالم اگر نہیں سراہتا نہ سراہے کچھ لوگ ہی سراہیں ۔ مطلب یہ ہوا کہ اب افسانہ عوام کی پسند کی چیز نہ رہ کر نقادوں کے معیار کی چیز ہو گیا اور نقاد چونکہ زیادہ پڑھا لکھا شخص ہے اس لئے اس کو سیدھی سادھی بات پسند آنے سے رہی (ظاہر ہے کہ علمیت کا رعب پھر کہاں ظاہر ہوگا) نتیجہ معلوم کہ علامتی اور تجریدی کہانیوں کا زور بڑھا ۔ بات یہاں تک تو ٹھیک تھی لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ الا ماشاء اللہ افسانہ لکھنے والوں کی بڑی اکثریت نہ تو علامت نگاری کے فن سے واقف تھی اور نہ ہی تجریدی آرٹ اُن کے بس کی بات تھی ۔ بس ایک بھیڑ چال تھی، ہر شخص لکھ رہا تھا ۔ چاہے آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں تعریف تو آپ کو کرنی ہی ہے — (علمیت کا رعب جو جمائے رکھنا ہے) ہوا یہ کہ بے مقصد اور Absurd کہانیوں کی باڑھ آ گئی ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تجریدی یا علامتی کہانیاں نہ لکھی جائیں ۔ جی نہیں ضرور لکھی جائیں لیکن اس سے پہلے علامتی اور تجریدی افسانوں سے مکمل واقفیت ضروری ہے ۔ علامتوں کے ذخائر کھنگالے جائیں ۔ شعوری طور پر ان کو برتنے کے گر اپنائے جائیں ۔ اچھے اور معیاری قسم کے مغربی افسانوں کا مطالعہ کیا جائے اور پھر جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اس فن میں مہارت حاصل ہو چکی ہے تب ان پر قلم اٹھایا جائے ۔

ویسے علامتی اور تجریدی کہانیوں کے علاوہ بھی اچھی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جاتی ہیں ۔ پسند بھی کی جاتی ہیں ۔ بلکہ اچھی تجریدی، اور علامتی کہانیوں میں بھی واقعات کی کڑیاں اس طرح جڑ جاتی ہیں کہ اُن کے پیچھے "کہانی پن" کے دبے پاؤں چلنے کا احساس باقی رہتا ہے ۔ "کماریاشی" صاحب نے جو تخلیقی افسانوں کا انتخاب شائع کیا ہے اُن میں سے قرۃ العین حیدر کا "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" اور غیاث احمد گدی کا "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" کا مطالعہ کیا جائے یا پھر سریندر

یہ کامنوا کا تازہ افسانہ "بجوکا" پڑھا جائے تو احساس ہوگا کہ واقعات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ کہانی دھیرے دھیرے چل رہی ہے۔ اور یہی ان کی عظمت کا سبب ہے۔

یہاں ایک بات اور پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ جو دنیا بھر کی کتابیں چھپتی ہیں، رسالے چھپتے ہیں تو آخر یہ سب کہاں جاتے ہیں؟ ہر رسالے میں ادیب و شاعر اپنی تخلیقات کی Advertisement کیوں نکالتے ہیں؟ جب کتابوں کو پڑھنے والا ہی کوئی نہیں تو روز نئے نئے اشاعتی ادارے کیوں کھل رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ کتابیں آج بھی بکتی ہیں۔ البتہ کچھ کتابیں کم بکتی ہیں اور کچھ زیادہ۔ پرانے افسانہ نگاروں کی کتابیں آج بھی اسی طرح بکتی ہیں جس طرح پہلے بکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ آج بھی ہمارے افسانوی ادب کا قاری ایسے افسانے پسند کرتا ہے جس میں کہانی پن ہے۔ جس میں اس کی کہانی ہے، اس کے حالات ہیں، اس کے مسائل اور اس کے دل کو چھوتی ہوئی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن افسانے میں یہ سب پیدا کیسے ہوگا؟ اس کے لئے ہمیں اپنی دنیا کے حالات کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ روزمرہ کے مسائل کا مطالعہ کرنا ہوگا، اپنے ضمیر کو بیدار کرنا ہوگا جو ہر بے جا بات پہ لکھنے کے لئے اکسا سکے۔ اپنے اردگرد کی زندگی کا عرفان حاصل کرنا ہوگا۔ ایک نئی اور بہتر زندگی کے لئے راہ ہموار کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ کیونکہ افسانہ نگاری صرف فوٹو گرافی کا عمل نہیں، محض زندگی کی عکاسی اس کا مقصد نہیں بلکہ افسانہ نگار ایک ماہر مصور کی طرح ہوتا ہے جو اپنی تصویر میں اپنی پسند سے مختلف رنگ بھرتا ہے تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ خوبصورت ہو سکے۔ اور پھر زندگی بھی یک رنگی نہیں ہوتی۔ زندگی کے وسیع و عریض کینوس پہ بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ کہانی کار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تصویر کو اس طرح مکمل کرے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ رنگ آسکیں۔ اسی سلسلے میں ایک بڑی عجیب بات یہ دیکھنے میں آرہی ہے کہ جدید افسانہ نگار صرف لمبے لمبے جلوس، سڑتی ہوئی متعفن بستیوں اور اکتائے ہوئے ماحول کی بات کرتے ہیں جو زیادہ تر شہروں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ آج بھی ہندوستان کے چند ایک شہروں کو چھوڑ کر زیادہ تر شہر مشینی زندگی کی ہاہا ہی سے پاک ہیں۔ پھر ہمارے دیہات ہیں۔ ان میں بسنے والے بھولے بھالے کسان ہیں، غریب اور نادار مزدور ہیں۔ آج کا افسانہ نگار ان پر کیوں نہیں لکھتا؟

ان دنوں جو تبدیلیاں ہمارے افسانوں میں نظر آرہی ہیں وہ ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ اب پھر سے ان میں کہانی پن کا احساس جاگنے لگا ہے۔ نیا افسانہ نگار اب شہری زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی پر بھی قلم اٹھانے لگا ہے۔ انسانی مسائل کی پیچیدگیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں تناسب سے تبدیلی کے لیے بھی اب افسانہ نگار کوشاں نظر آنے لگا ہے۔ ہم کہانی یا افسانوں کے مستقبل سے پُرامید ہیں کہ آنے والی نسل اپنی سابقہ روایت کے سہارے مزید اچھے افسانے اردو ادب کو دے گی جو اپنے عہد اور اس عہد کے انسانوں کے ذہنی و فکری تغیر میں نمایاں کردار ادا کریں گے —— ..

● مشتاق جاوید —— کلکتہ

"ہم زبان" ہر لحاظ سے پسند آیا۔ مجنوں گورکھپوری، منظر امکانی، رونق زیدی، رشید امجد، عشرت ظہیر، اسلم سلازار اور شبنم سحر کے مضامین و افسانے پسند آئے۔

حصۂ نظم میں نشاط شاہدوی، احمد ظفر، ظہور نظر، رئیس مالیگانوی، نوبہار صابر، صلاح الدین نیر، سلیم کوثر، حمید نورانی اور شاہین بدر کی تخلیقات کافی فکر انگیز اور معیاری ہیں۔

جلوۂ نمو (حرمت الاکرام) اور لفظوں کی دھوپ (تشکیل مظہری) پہ عتیق احمد عتیق کے تبصرے بھی خوب ہیں —— ..

پوسٹ مارٹم رپورٹ

(ڈاکٹر) شاہ زادہ ابا سرکل ہسپتال مظفرپور

(نتیجہ رپورٹ)

نام	ہم زبان	شمارہ ۶ (ماہ اگست تا اکتوبر)	
ٹائیٹل	سلطان سبحانی	خوبصورت، چمکدار	سمجھ میں نہیں آتا۔
اختلاف	"	پُرمغز، پُرفکر اور پُراعتماد	صد فی صد متفق
بادل کا گیت	نشاط شاہدوی	جدید انداز — رواں	مضمون اچھا ہے۔
کوئی موسم ہمارا نہیں	احمد ظفر	خوب انداز، خوب رواں۔ پُرمعنی	اور لکھیے۔
ترقی پسند تحریک اور میں	مجنوں گورکھپوری	مضامین — اچھے ہیں واقفیت میں اضافہ ہندوستانی اُردو ادب کی جانکاری اچھی ہے۔	سبحانی صاحب —! ہندوستانی تخلیق کاروں کی پذیرائی پاکستانی رسالوں میں کب تک متوقع ہے —؟ ہم تو ایک ہی شمارے میں دس دس پاکستانی ادیب گلے سے لگاتے ہیں —..
مطالعۂ ادب میں تحلیل نفسی کا کردار	سلیم اختر		
ادب اور اقدار	منظر امکانی		
اُردو ڈراما	رونق زیدی	نصابی تعلیم کا حصہ	نظمیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔
غزل	ظہور نظر	غزل ہے غزل، خوب ہے غزل جدید ہے غزل، پسند ہے غزل	بے جا طوالت خوبصورتی پر اثر انداز۔ ایک ہی مصرعے کا دوبارہ استعمال غیر مناسب۔ باقی سب ٹھیک ہے۔
غزل	نوبہار صابر	کچھ اشعار اچھے ہیں	پہلی غزل غنیمت لگی۔
باقی غزلیں	مختلف شعراء	عام خیال — عام لہجہ اور ریپیٹیشن کی بھرمار	سلطان سبحانی کے نام پر پڑھ ڈالی ہیں۔
وضعداریت	رشید امجد	کہانی اسے کہتے ہیں۔ پیاری پیاری، مختصر، اہم پرابلم، تکنیک جدید، اندازِ بیاں خوب تر — اور وہ سب کچھ جو ایک کہانی کی خوبی ہو سکتی ہے —..	"ہم زبان" کو ایسی ہی کہانیاں درکار ہیں تاکہ یہ "نشانات" کی کمی کا احساس دور کر سکیں — ابھی ہم تو نثار ہو گئے —..
ڈنک	محسن علی	اندازِ تحریر خوبصورت، سبک، رواں	محسن صاحب! احسان آپ کا "ہم زبان" پر مگر ڈنک کا اختتام کچھ غیر منصفانہ ہے۔

[illegible]

انگریز اور ہاسٹ فیض ——— عشرت ظہیر — کہانی میں روایتی پن، بیانیہ انداز، قصہ گوئی، اخبار کا ایک آخری کالم — { "ہم زبان" کے معیار پر اترا انداز ——— ڈیئر ایڈیٹر! کانٹی اگزہاسٹ ریز ثابت آف اسٹوڈینز فرام ہم زبان منتقلی۔ }

پانچویں سمت ——— راشد احمد — بے معنی ——— بے مطلب، جدیدیت کی بھیڑ میں شمولیت مقصد محض چھپنا، — { سبحانی صاحب! پانچویں سمت (شائع کرنے کا) کا مطلب کیا ہے؟ }

فرضی کہانی ——— شاہد پرویز — ماحول پر گرفت نگاہ ——— موجودہ وقت کی شناخت — { ہاں پہلی ۱۰ اچھی کہانی ——— کہی جا سکتی ہے — }

عمل ——— شبنم سحر — لکھنے کا شوق، چھپنے کا شوق — سے کچھ لکھیں گے گو جس کا مطلب کچھ نہ ہو —

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

محترم سلطان سبحانی صاحب!

میں عرصہ سے شعر کہہ رہا ہوں۔ اور ایسے ماحول میں شعر کہہ رہا ہوں جہاں گھسے پٹے مضمونوں میں قافیہ پیمائی کو شاعری کہا جاتا ہے۔ نئے رجحانات، نئی علامتیں نئے الفاظ جو شخص یا شاعر غزل میں لانے کی کوشش کرتا ہے اس کی شامت آجاتی ہے ——— خیر....!

"نئے نشانات" اور اب "ہم زبان" صرف سبحان اللہ کہوں گا۔ کیوں کہ تعریف کے لیے اس سے بہتر لفظ کوئی نہیں ہے۔ میں "ہم زبان" کی محفل میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ اگر کسی قابل سمجھیں تو شائع کریں۔ میں اپنے لیے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ —

جن کو غزل کی سند تا میر و داغ کہا ہے لوگوں نے
ایسے ایسے لفظوں کو بھی ہم نے پرو دیا غزلوں میں
کوئی ہمیں فنکار نہ مانے، کوئی ہمیں شاعر نہ کہے
ہم نے جو محسوس کیا ہے وہ ہی پرو دیا غزلوں میں

خیر اندیش ——— م۔ ا۔ علوی دہلی

غزل

م۔ ا۔ علوی

ایک لوٹا تھا، اک لنگوٹی تھی
اپنی دنیا بھی کتنی چھوٹی تھی
جس کے عوض بکی تھی وہ لڑکی
کچھ نہیں صرف ایک روٹی تھی
ہم نے یہ کہا ہے زندگانی کو
اک چوٹی تھی وہ بھی کھوٹی تھی
اس لئے اس کو کھا گیا کتا
کیوں کہ بلی کے منہ میں بوٹی تھی
بڑی والی کی بات ہے کچھ اور
تم نے دیکھا ہے وہ چھوٹی تھی
کون سنتا اسے اخیر تلک
غم کی گیتک بہت ہی موٹی تھی
اس لئے زندگی کو ایسا پایا
بھاگتے بھوت کی لنگوٹی تھی ••

انشراح

اردو دنیا کی اہم ادبی خبریں

جنوری ۱۹۷۸ء سے جنوری ۱۹۷۹ء تک

جانے والے

• ابن انشاء • محمد حسن عسکری • شفیع الدین نیر • غلام مصطفیٰ تبسم • اعجاز صدیقی • محمود احمد ہنر • محمد احسن فاروقی • سید آل رضا • تاج بھوپالی • ماہر القادری • خلیل الرحمٰن اعظمی • عبدالعلیم نامی • سید مطلبی فریدآبادی • سید عابد حسین • بسمل عظیم آبادی • سلیمان خطیب • فریدہ جاوید • محمود جالندھری ——.

لندن —— ۱۱ جنوری ۷۸ء۔ اردو کے نامور شاعر، کالم نگار، سیاحت نگار، انشائیہ نویس اور طنز نگار ابن انشاء دماغی فالج کے باعث رحلت کر گئے۔ ان کا اصل نام شیر محمد تھا —— وہ ۱۹۲۷ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز انہوں نے شاعری سے کیا اور بعد میں مزاحیہ کالم نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔ "چاند نگر" اور "اردو کی آخری کتاب" کے مصنف ابن انشاء پاکستانی سفارتخانہ (لندن) میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ موت کے وقت ان کی عمر ۵۰ سال تھی۔

کراچی —— ۱۸ جنوری ۷۸ء۔ مشہور افسانہ نگار، محقق اور نقاد پروفیسر محمد حسن عسکری دل کے دورے کے باعث ۵۹ سال کی عمر میں سب سے جدا ہو گئے۔ وہ اسلامیہ کالج (کراچی) کے صدر شعبۂ انگریزی تھے۔ "ستارہ اور بادبان" اور "انسان اور آدمی" ان کی وہ تنقیدی کتابیں ہیں جن پر اردو تنقید کا سر ہمیشہ فخر سے بلند رہے گا۔ انہوں نے مغرب کے ہم پلہ تنقیدی مضامین لکھے۔ انہیں فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے فرانسیسی سے اردو میں ترجمے بھی کئے۔ اور فرانسیسی رسائل میں اپنی تحریریں بھی دیں۔ مغربی ادب کو اردو ادب سے قریب تر لانے اور متعارف کرانے میں محمد حسن عسکری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تنقید کی طرح ان کے افسانے بھی بے حد مقبول ہوئے۔

نئی دہلی —— ۳۰ جنوری ۷۸ء۔ بچوں کے مشہور اور کہنہ مشق ادیب و شاعر شفیع الدین نیر اردو دنیا کے لاکھوں ننھے منے قارئین سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کے لیے خوبصورت، پیاری پیاری سبق آموز نظمیں لکھنے میں گذار دی۔ وہ بچوں کے ادب کے لئے پورے ایک زرخیز دور کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دلّی میں معلّم کی حیثیت سے انہوں نے اُردو تعلیم کی بے مثال خدمات انجام دیں ۔ وہ لگ بھگ چھ درجن کتابوں کے مصنّف تھے ۔
بچّوں کی نفسیات پر ان کی نظمیں اور کہانیاں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کے نام کو تازہ کرتی رہیں گی ۔

لاہور ـــــ ۷ فروری ۱۹۷۸ء ۔ بزرگ اور کہنہ مشق شاعر پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم اُردو کی محفلِ ادب سے اُٹھ گئے ۔ وہ لاہور کے "زندہ دلان" کی ایک متبسّم اور معتبر شخصیت تھے ۔ فارسی اور پنجابی ادب پر ان کی گہری نظر تھی ۔ غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ کے فارسی کلام کو انہوں نے اُردو میں پیش کیا ۔ بچّوں کے لئے بھی انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں اور بچّوں کے ادب میں بھی اپنے لیے ایک منفرد مقام بنالیا ۔ وہ ۱۸۹۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے ۔ ان کی پوری زندگی زبان و ادب کی خدمت میں گذری ۔ آج کے بہت سے نامور شاعروں کی ذہنی تربیت میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے ۔

بمبئی ـــــ ۹ فروری ۱۹۷۸ء ـــ اُردو زبان و ادب کو ہمیشہ اپنے خونِ جگر سے سینچنے والے مشہور ادیب و شاعر اور کہنہ مشق صحافی اعجاز صدیقی رحلت فرماگئے ۔ مدیر، شاعر کی حیثیت سے اور اُردو کے ایک سرگرم مجاہد کی حیثیت سے انہوں نے اُردو تحریک کی زبردست خدمات انجام دیں ۔ وہ ۱۹۱۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے ۔ شاعری انہیں ورثہ میں ملی ۔ وہ سیمابؔ اکبرآبادی جیسے استادِ سخن کے فرزند تھے ۔ ۱۹۴۸ء میں جب وہ آگرہ چھوڑ کر بمبئی آئے تو انھوں نے یہاں بھی حضرتِ سیمابؔ کی شمع روشن رکھی ۔ اعجاز صاحب زندگی بھر مالی دشواریوں میں مبتلا رہے لیکن شاعر جیسے سنجیدہ اور معیاری رسالے کو زندگی بخشتے رہے ۔ اور اسے کبھی موت سے ہم آغوش ہونے نہیں دیا ۔ شاعر کے جتنے ضخیم مثالی اور یادگار نمبر انھوں نے شائع کئے ہیں وہ ہمیشہ اس بات کے گواہ رہیں گے کہ اعجازؔ صدیقی مرے نہیں ہیں بلکہ اُردو پر نثار ہوئے ہیں ۔

الٰہ آباد ـــــ ۱۲ فروری ۱۹۷۸ء ۔ اُردو کے مشہور اور باوقار ادبی ڈائجسٹ "شاہکار" کے ایڈیٹر محمود احمد ہنرؔ جدا ہوگئے ۔ انھوں نے شاہ کار کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان کے معیاری ادب کو نہایت سلیقہ مندی سے اُردو کے قارئین تک پہونچایا ۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے تراجم بھی کئے ۔ وہ ایک دردمند اور اچھے اوصاف کے انسان تھے ۔ موت کے وقت ان کی عمر ۶۱ سال تھی ۔

● اسی ماہ مشہور افسانہ نگار، نقاد اور مترجم ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بھی بچھڑ گئے ۔ مرحوم احسن فاروقی نے اُردو کو کئی بہترین ناول دیئے ۔ تنقید کے میدان میں بھی وہ نہایت صاف، کھرے، بے باک اور حق گو تھے ۔ مصلحت پسندی یا جانب داری ان کا شیوہ نہ تھا ۔
"اُردو ناول کی تنقید" ان کے اعلیٰ معیار کی پہچان ہے ۔ انہوں نے بے شمار افسانے بھی لکھے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ۔

کراچی ـــــ یکم مارچ ۱۹۷۸ء ۔ اُردو کے مشہور بزرگ شاعر سید آلِ رضاؔ دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال فرماگئے ۔ سید آلِ رضاؔ آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے ۔ وہ ۱۸۹۵ء میں ضلع اُناؤ کے قصبہ نیوتنی میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے قدیم روایات کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کو نیا آہنگ دیا ۔ اور مرثیہ گوئی میں بھی کمال حاصل کیا ۔ نوائے رضاؔ ۔ غزلِ معلیٰ ۔ شہادت سے پہلے شہادت کے بعد ان کی مشہور تصنیفات ہیں ۔

بھوپال ـــــ ۱۴ اپریل سنہ ۸۰ء ۔ مشہور ترقی پسند شاعر تاج بھوپالی جُدا ہو گئے۔ بھوپال کی ادبی سرزمین غزل کے ایک مشاق شاعر سے محروم ہو گئی ۔ تاج بھوپالی ترقی پسند شعرا میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے ۔ اور اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے بے حد مقبول تھے ۔

جدّہ (سعودی عرب) ۱۱ مئی سنہ ۸۰ء ـــ ہندو پاک کے مشہور شاعر اور مدیر "فاران" مولانا منظور حسین ماہر القادری حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب رحلت فرما گئے ۔ مولانا ماہر غزل گوئی، نظم نگاری اور نعت نویسی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے ۔ وہ سنہ ۱۹۰۶ء میں کیسر ضلع بلند شہر (یو.پی) میں پیدا ہوئے ۔ سنہ ۴۹ء میں کراچی گئے اور وہیں رہ گئے ۔ شاعر کے علاوہ وہ ایک محقق اور نقاد بھی تھے ۔ ان کا ادبی و مذہبی رسالہ "فاران" پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی کافی مقبول تھا ۔

علی گڑھ ـــــ یکم جون سنہ ۸۰ء ۔ اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی بلڈ کینسر کے باعث انتقال فرما گئے ۔ خلیل صاحب ۹ اگست سنہ ۱۹۲۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ سِدھاری میں پیدا ہوئے ۔ سنہ ۴۷ء میں انہوں نے اپنی زندگی علی گڑھ سے جوڑ دی ۔ یہاں وہ ترقی پسند تحریک سے منسلک ہوئے ۔ اور سنہ ۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سکریٹری منتخب ہوئے ۔ ان دنوں ترقی پسند ہونے کے "جرم" میں انہیں جیل کی سزا بھی ہوئی ۔ ترقی پسند ادب اور تحریک کے لیے انہوں نے بے انتہا محنت کی ۔ وہ ادب میں انتہا پسندی کے خلاف تھے اس لیے انہوں نے اپنے بہت سے مضامین میں اس مسئلے پر کڑی تنقید کی ۔ سنہ ۵۵ء کے درمیان ان میں ذہنی اور نظریاتی تبدیلی رونما ہوئی ۔ وہ جدیدیت کی طرف رجوع ہوئے لیکن وہ بنیادی طور پر ترقی پسند ہی تھے ۔ اور محض اسی وجہ سے جب جدیدیت کی بنیاد رکھی گئی تو انتہا پسند جدیدیوں نے ن ۔ م ۔ راشد کی طرح انہیں بھی کاٹ دیا لیکن تب تک خلیل صاحب نے اپنا منفرد لب و لہجہ دریافت کر لیا تھا ۔ وہ غزل کی معتبر آواز تھے ۔ انہوں نے اپنی غزل کی آواز سے اور مضامین کی گونج سے سب کو متاثر کر دیا ۔ خلیل صاحب ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان توازن کی بہترین مثال تھے ۔ کاغذی پیرہن ۔ فکر و فن ۔ نیا عہد نامہ ۔ زاویۂ نگاہ ۔ مضامینِ نو اور اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' ان کی شعری و تنقیدی کتابیں ہیں ۔

بمبئی ـــــ ۸ جون سنہ ۸۰ء ـــ اُردو ڈرامے کے محقق ڈاکٹر عبدالعلیم نامی رخصت ہو گئے ۔ نامی صاحب سنہ ۱۹۱۰ء میں سندیلہ میں پیدا ہوئے ۔ اُن کی تعلیم و تربیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی ۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو تھیٹر پر لکھی ہوئی وہ کتاب ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اُردو ڈرامے کے تعلق سے ان کی خدمات یقیناً بے پایاں ہیں ۔ جب کبھی بھی اُردو ڈرامے کا تذکرہ آئے گا نامی صاحب کی کاوشوں کو بھی یاد کیا جائے گا ۔

لاہور ـــــ ۲۳ جولائی سنہ ۸۰ء ـــ ہندو پاک کے ممتاز ترقی پسند شاعر مترجم اور صحافی سید مطلبی فرید آبادی جدا ہو گئے ۔ سید صاحب سنہ ۱۸۹۳ء میں فرید آباد کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ ان کی پوری زندگی کسانوں مزدوروں اور غریبوں کی فلاح و بہبودی میں گذری ۔ انہوں نے تحریکِ خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ وہ کٹّر ترقی پسند شاعر تھے ۔ سچائی کی آواز بلند کرنے پر انہیں بار بار جیل کی سختیاں بھی سہنی پڑیں ۔ جوش ملیح آبادی کے ساتھ انہوں نے ایک ادبی جریدہ "کلیم" جاری کیا ۔ اس کے علاوہ کئی اخبارات اور رسائل بھی ان کی ادارت میں شائع ہوئے ۔ جن میں امروز ۔ پارس ۔ آفاق اور عوامی جمہوریت

قابلِ ذکر ہیں ۔ اُن کے کئی اہم تراجم بھی ہیں ۔ "بہتا دریا" اور "ادب اور سماجی زندگی" ان کا بہترین کارنامہ ہے ۔ موت کے وقت ان کی عمر ۴۸ سال تھی ۔

نئی دھلی ۔ ۱۳ دسمبر سنہ ۷۸ء ۔ اُردو کے مشہور ادیب مفکر اور مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین رحلت فرما گئے ۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی ۔ انہوں نے سنہ ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُن کی خدمات آخر عمر تک جاری رہیں ۔ "قومی تہذیب کا مسئلہ" اور "گاندھی اور نہرو کی راہ" اُن کی مشہور کتابیں ہیں ۔ وہ اُردو زبان و ادب کی ہر اہم تحریک میں پیش پیش رہے ۔

● اسی سال بزرگ انقلابی شاعر بسمل عظیم آبادی، دکنی زبان کے مشہور شاعر سلیمان خطیب اور نئی نسل کے جدید شاعر فرید جاوید بھی جدا ہو گئے ۔

نئی دھلی ۔ یکم جنوری سنہ ۷۹ء ۔ مشہور ترقی پسند ادیب و شاعر گربچن سنگھ مخمور جالندھری اُردو دنیا سے جدا ہو گئے ۔ مخمور اُردو کے روزنامہ ملاپ کے نیوز ایڈیٹر تھے ۔ اُن کی پوری زندگی اُردو ادب کی خدمت میں گذری ۔ روسی ادب کے شاہکاروں کا انہوں نے اُردو میں ترجمہ کیا ۔ وہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے ۔ شاعری اور نثر دونوں پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی ۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی ۔

[redacted] سنہ ۷۸ء اُردو زبان اور شعر و ادب کے لیے انتہائی بے رحم اور سفاک ثابت ہوا ہے ۔ اس ایک سال نے کتنے بڑے بڑے ادیب اور دانشور ہم سے چھین لیے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کس کا ماتم کریں ۔ مجتہد، معروف، معتبر اور قدآور ادیبوں کی پوری ایک صف محفل سے اُٹھ گئی ۔ اُردو کے سارے شجرِ سایہ دار ایک ایک کر کے راہ سے ہٹ گئے ۔ اب اُردو کا قافلہ کس طرح چلے گا ؟ ——— یہ ایک بہت بڑا سوال ہے ۔ اور اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ۔ اس بات کا دکھ اُردو زبان کو بھی ہے اور اس کے ہر ادیب کو بھی ۔ ادارۂ "ہم زبان" اس ناقابلِ برداشت صدمہ پر اپنی چیخ نہیں روک سکتا ۔ اس درد کا علاج کسی بھی طرح ممکن نہیں ۔ ؎ "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا ؟" ——— (ادارہ)

سنہ ۷۸ء کی دوسری اہم خبریں

* ——— ہندو پاک کے مشہور ترقی پسند اور عہد آفریں شاعر فیض احمد فیض ہندوستان آئے اور ہندوستان کے ہر بڑے ادبی مرکز پر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ۔

* ——— مشہور ترقی پسند افسانہ نگار رام لعل نابھوی ، رائٹرس ایسوسی ایشن کی دعوت پر یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے اور وہاں کے رجحانات کا مطالعہ کر کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد واپس آئے ۔

* ——— کلکتہ یونیورسٹی نے جدید شاعر تسنیم انور کو "آزادی کے بعد اُردو شاعری میں جدید رجحانات اور تکنیک" پر پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری عطا کی ۔

* ——— جامعہ ملیہ اسلامیہ نے صغریٰ مہدی کو "اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ" پر پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری تفویض کی ۔

* ـــــ اس سال کا نوبل ادبی انعام امریکہ کے ایک "یہودی" گمنام اردادھور سے ادیب آئی بی سنگر کو دیا گیا۔ اس واقعہ پر دنیا کے سارے ادیب حیرت زدہ رہ گئے۔

* ـــــ مشہور جدید نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی ایک بین الاقوامی ادبی سیمینار میں شرکت کے لئے امریکہ گئے اور کچھ دنوں بعد واپس آ گئے۔

* ـــــ ترقی پسند ادیبوں کی قومی فیڈریشن نے وزیر داخلہ چرن سنگھ کے اُردو پر لگائے ہوئے بے بنیاد الزامات کی سختی سے تردید کی اور انھیں اُردو کی وسعت، قربانیوں اور کارناموں سے آگاہ کیا۔

* ـــــ مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں نے علی گڑھ میں ہونے والے فسادات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے "پدم شری" کا خطاب واپس کر دیا۔ صدر جمہوریہ کے نام انہوں نے جو خط روانہ کیا ہے اس میں حکومت کے غلط طریقۂ کار پر کڑی تنقید کی ہے اور اس فساد کو اقلیتی فرقہ کے خلاف سازش اور قتلِ عام ظاہر کیا ہے۔

* ـــــ ملک کے مختلف مراکز سے ترقی پسند ادیبوں اور دیگر دانشوروں نے علی گڑھ میں ہونے والے فسادات کی مذمت کی۔ اور حکومت سے اقلیتی فرقہ کے جان و مال کی حفاظت کی درخواست کی۔

* ـــــ مشہور اور بزرگ ترقی پسند افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی سخت علیل ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کا ایک بڑا آپریشن بھی کیا گیا، جس کے بعد وہ خطرے سے باہر ہو گئے اور اب آہستہ آہستہ رو بصحت ہو رہے ہیں۔

* ـــــ لکھنؤ میں اتر پردیش اکادمی کے زیرِ اہتمام "اُردو ہفتہ" منایا گیا ـــــ جلسہ، مشاعرہ، تصویروں کی نمائش، ادبی نشست، موسیقی سے اس ہفتہ کو رنگا رنگ کیا گیا۔ نور الحسن ہاشمی، پروفیسر محمد حسن، رام لعل، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، گیان چند، قاضی عبدالستار، حیات اللہ انصاری، قمر رئیس، شہاب جعفری، ندا فاضلی، جذبی، انیس اشفاق، شاہ نواز اور شہنشاہ مرزا وغیرہ شریک رہے۔

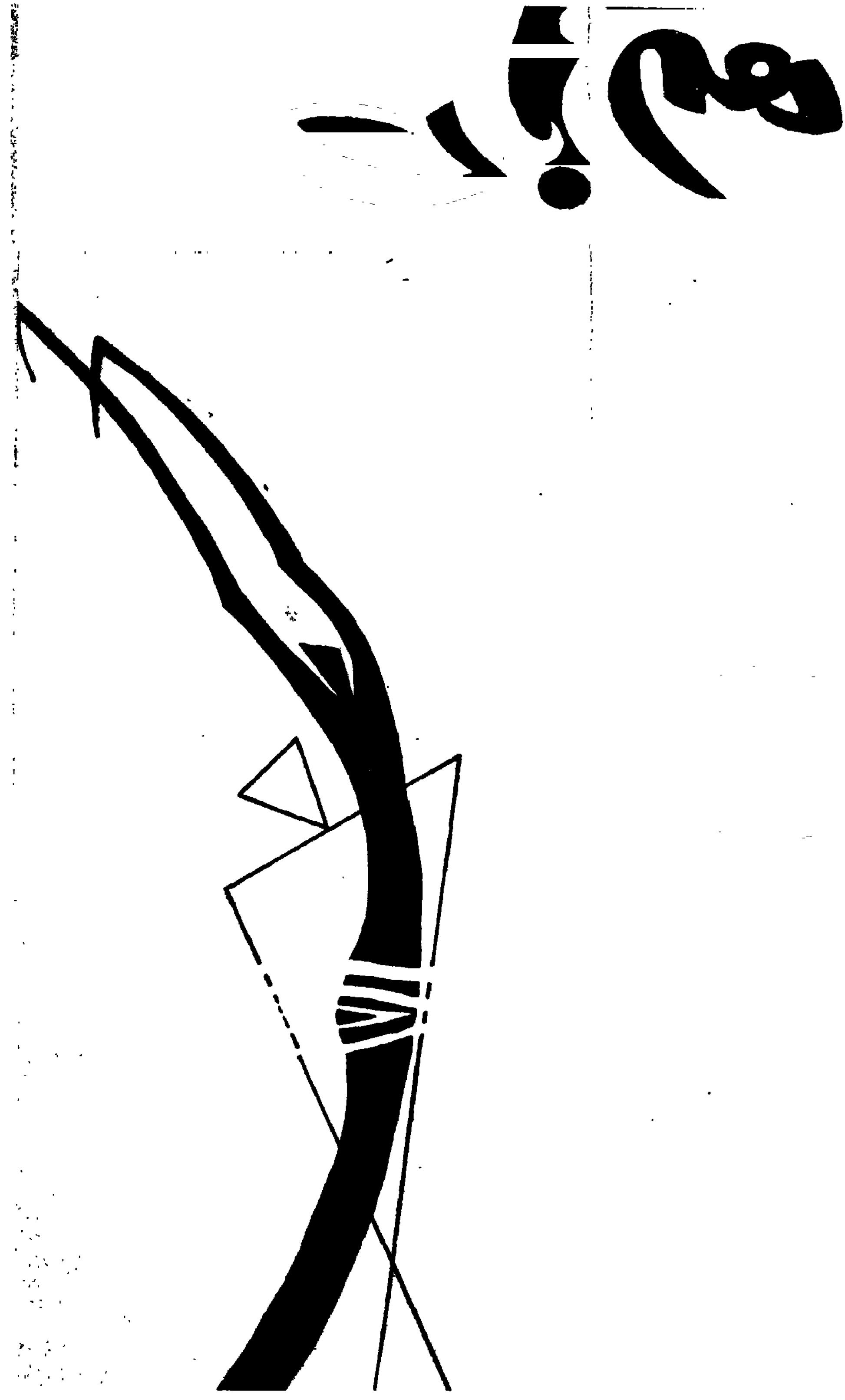
* ـــــ کراچی میں اُردو کے عظیم نقاد اور بزرگ افسانہ نگار مجنوں گورکھپوری کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر نہایت زبردست "جشنِ مجنوں" کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں پاکستان کے ہر بڑے ادیب نے شرکت کی۔

* ـــــ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار اور صحافی ابراہیم جلیس مرحوم کی دو کتابوں "الٹی قبر" اور "جنگل میں منگل" کی تقریبِ اجرا کراچی میں ہوئی۔ جس میں پاکستان کے بہت سے معروف ادبا شریک ہوئے۔

* ـــــ اُردو کے مشہور افسانہ نگار، اداکار، ڈاکٹر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر انور سجاد جیل سے رہا ہو کر دوبارہ افسانہ نگاری کی طرف رجوع ہو چکے ہیں۔

* ـــــ لکھنؤ میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیمینار ہوا۔ (۱۴ - ۱۵ مئی سنہ ۷۸ء) جس میں پروفیسر محمد حسن، سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، عتیق اللہ، فتح ظفر، جوگیندر پال، اجمل اجملی، قاضی عبدالستار، اظہار اثر، شارق ادیب، ملک زادہ منظور، علی احمد فاطمی، نعیم احمد، ابراہیم علوی، سید محمد عقیل، انور عظیم، جوگیش کمار اور عابد سہیل وغیرہ شریک رہے ـــــ۔

* ـــــ نئی قدریں (حیدرآباد، سندھ) کے مدیر اختر انصاری اکبرآبادی سخت علیل ہیں۔



ٹائٹل: سلطان سبحانی   کہیں نہ آخری جھونکا ہو مٹتے رشتوں کا   یہ درمیاں سے نکلتا ہوا سا کچھ تو ہے (بانی)

ماہنامہ

٨

مالیگاؤں

ایڈیٹر
سلطان سبحانی

مینیجر: شاد نواب

جلد ۲ شمارہ ۵ • فروری، مارچ، اپریل سنہ ۱۹۷۹ء • تاریخ اشاعت ۶ اپریل ۱۹۷۹ء • کتابت اکبر مرزا
طباعت: سردار پریس مالیگاؤں • قیمت دو روپئے پچاس پیسے • زر سالانہ بیس روپئے • پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر سلطان سبحانی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ "ہم زبان" انشا بک سینٹر، قدوائی روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

اِختلاف ۱

درندگی، بربریت اور قتل و خون
کے خلاف وہی ادیب آواز اُٹھا سکتا ہے جس
کے نزدیک انسانی رشتوں اور نسلِ آدم کے
خون کی قدر و قیمت ہو ——

اختلاف ۲

علی گڑھ کے بعد جمشید پور بھی آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ ان دونوں شہروں سے جو چیخیں، آہیں، کراہیں اور ہچکیاں بلند ہوئیں وہ ہمارے ادیبوں تک پہنچیں۔ ایک دردناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیل گیا۔ یہ منظر دنیا کی سب سے حساس نسل نے دیکھا لیکن فن کی قدر و قیمت پر ایمان رکھنے والے ادیبوں کے قلم میں جنبش نہیں ہوئی۔ انھیں ڈر ہے کہ اگر وہ اس مسئلے پر کچھ لکھیں تو کہیں ماضی کا حصہ نہ بن جائیں۔ کہیں ان کے فن پر دھبہ نہ لگ جائے کہ وہ "تخلیق کاری" کے بجائے سماجی خدمت گاری پر اتر آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے فن کو ایک محدود دائرے میں الجھا دیا گیا ہے۔

فن انسانی مسائل سے رشتہ توڑنے کا اعلان کب کرتا ہے؟

یہ اعلان تو ان ناقدین کی طرف سے ہے جو مغربی دانشوروں کی کتابوں کے سامنے سربسجود ہیں۔ کاش وہ یہ بھی دیکھتے کہ اپنے مغربی دانشوروں نے جہانِ زندگانی میں کہاں کہاں حصہ لیا ہے، کہاں کہاں پرچم اٹھایا ہے اور کہاں کہاں ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

آج کا ادیب تمام فرائض سے بالاتر ہو گیا ہو یہ الگ بات ہے لیکن اگر وہ واقعی حساس ہے تو اسے ان قتل ہوتے ہوئے انسانوں کی آوازیں بھی ضرور سننی چاہئیں جو اس کی اپنی ذات کا حصہ ہیں اور اس کے دل پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہیں۔ ممکن ہے ان قتل ہوتی ہوئی آوازوں کی گہرائیوں میں اترنے کے بعد تخلیق کا کوئی ایسا شعلہ بھڑک اٹھے جو معصوم بچوں کی طرح ہنستے مسکراتے اور چہکتے جگمگ کرتے ہوئے شہروں کو پامال ہونے سے بچا سکے۔

حرمت الاکرام
(رام باغ۔ مرزا پور ۔ یو۔ پی)

نصابِ خاک

یہ زمیں کہ ایک کتاب ہے
مرے روز و شب کا نصاب ہے
یہ اُلٹ رہی ہے ورق ورق
یہ بکھر رہی ہے پرت پرت
کہ میں حرف حرف اسے پڑھوں
کہ رموزِ حیات سمجھ سکوں
یہ صحیفۂ فن و آگہی
مری دانش و بینش و روح پر
کرے سہل منزلِ امتحاں
یہ نموئے فکر کی کونپلیں
بنیں شاخِ آرزو کی لویں
میں امینِ حکمتِ خود گری
بنوں کیسے بندۂ بیش و کم
یہ زمیں ـــــ شرارہ فشاں زمیں
مجھے دے حرارتِ جستجو
کہ رگوں میں رقص کرے لہو

یہ زمیں، یہ بساطِ بلند خو
کرے کوئی اونچی سند عطا
وہ اُفق بنوں کہ طلوعِ جاں
کو ادائے مہ و قمر ملے
مرے نطق کو بھی نظر ملے
مرا خامۂ تخیل شعور کو
وہ فسونِ نور و سرور دے
میں خود اپنا اوجِ سفر بنوں
میں خود اپنی راہگذر بنوں
میں خود اپنی شام و سحر بنوں

انجم اعظمی (پاکستان)

اپنے لوگ

کبھی اکیلا تھا
اب نہیں ہوں کہ میرے اندر
تمام انسان بسے آباد ہو گئے ہیں
میں تن پہ چادر لپیٹے بیٹھا ہوں درمیاں
اور تمام چہرے
فسونِ حلقہ ہیں، گل کے اوراق کی طرح ہیں
نہ ہے مسلماں نہ بدھ نہ آتش پرست کوئی
نہ ان میں نصرانی اور یہودی
نہ کوئی ہندو، بتوں کا شیدا
سیاستِ شیخ و برہمن سے ہیں دور یہ لوگ
جنہیں فقیری میں دل کی اقلیم ہات آئی

عرب عجم کا فساد کوئی نہ شرق اور غرب کا ہے جھگڑا
نہ اونچ [illegible] کی حکایت
فریب [illegible] کے تانے بانے بکھر چکے ہیں
خرد [illegible] تنگ و تاریک جنگل خانوں میں
[illegible]
آج [illegible] سے آملا ہوں
کبھی اکیلا تھا
اب نہیں [illegible]

حمید الماس

۱۲۵۵ بی ۔ نواں بلاک، جے نگر بنگلور ۱۱

ایک ہی موضوع

صاف کرتا ہوں کبھی جو آسماں کی لوح کو
ماہ و انجم کا غبار
آنکھ میں گرتا ہے
جس سے
خود بہ خود بہتی ہے اشکوں کی قطار
اور ان قطروں سے
میں لکھتا ہوں نظمیں صفحۂ آفاق پر
تم ہی تم موضوع ہو ہر نظم کا۔

جدید اردو افسانے کے رجحانات

ڈاکٹر جمیل جالبی
(پاکستان)

خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کو کہا اسی دن ایک افسانہ پیدا ہو گیا۔ شیطان نے جب انکار کیا تو اسی کے ساتھ "کشمکش" کا عمل اور تصور بھی وجود میں آ گیا۔ یہ کشمکش اس وقت اور نمایاں ہوئی جب شیطان نے ماں حوا کو ورغلایا اور ماں حوا نے وہ کام کیا جس کے لیے انہیں منع کیا گیا تھا۔ حوا کی بیٹیاں بفضلِ تعالیٰ آج تک یہی کام کر رہی ہیں۔ شاید پہلا افسانہ وہ تھا جو ماں حوا نے گندم کھانے کے بعد باوا آدم کو سنایا اور بتایا کہ کیسے ایک سانپ نے انہیں گندم کھانے پر آمادہ کیا۔ اور وہ گندم سر عزیز کی قسم کیا مزیدار تھا۔ ماں حوا اسے باوا آدم کے پاس لے کر آئیں اور غمزوں عشوؤں اور اداؤں کے ساتھ کہا کہ وہ بھی اسے کھائیں۔ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اس دن سے لیکر آج تک اولادِ آدم جن نتائج تک پہنچی ہے انہیں ماں حوا کی طرح بیان کر دیتی ہے۔ اور اولادِ آدم کا یہ بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔

زندگی واقعات اور کشمکش سے معمور ہے اور ان کا بیان افسانہ نگاری ہے۔ اسی لئے افسانہ انسانی فطرت اور اس کی زندگی کا اہم جزو ہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر زبان میں کسی نہ کسی شکل میں یہ موجود ہے، اور ہر شخص افسانے کہانی میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے کے ساتھ ساتھ کہانی کی شکل اور نوعیت بدلتی گئی ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلے پہل افسانے محض واقعات ہوں گے، مگر بعد میں انسان اپنی مشکلات، اپنے مصائب اور مسائل کو دیکھ کر، ان کہانیوں میں دل خوش کرنے والے خواب بھی دیکھنے لگا ہوگا اور اس طرح "جو کچھ ہوا" کی منزل سے گزر کر "جو کچھ ہونا چاہیئے" کی منزل تک آ گیا۔ جو کچھ ہونا چاہیے کی خواہشوں نے مافوق الفطرت باتوں اور افراد کو جنم دیا۔ آگے چل کر بعد کے ادوار میں مذہب و اخلاق کے اثر نے ان کہانیوں میں تمثیل کا رنگ بھرا اور اس طرح انسان کا یہ فطری رجحان "فن" کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آ گیا جسے ہم "عقل کا دور" کہتے ہیں۔

اس دور میں اس بات پر زور دیا گیا کہ "حقیقت" افسانے سے زیادہ پراثر اور دیرپا ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ رجحان پیدا ہوا کہ ایسے قصّے بیان کئے جائیں جن میں حقیقت اور صرف حقیقت ہو۔ یہی رجحان ناول کی پیدائش کا سبب بنا۔ لفظ "ناول" کے لغوی معنی نئے کے ہیں۔ یعنی ایسا نیا جو پرانے سے مختلف ہو۔ اس طرح ناول میں مافوق الفطرت یا تمثیلی افراد کے بجائے حقیقی افراد و واقعات کے قصّے بیان کئے جانے لگے۔ انہیں قصوں کے اندر چھوٹے چھوٹے قصّے بھی آجاتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قصّے مختصر افسانے کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ چنانچہ مختصر افسانے کی اولین مثالیں کسی بڑے ناول سے لئے ہوئے وہ چھوٹے قصّے ہیں جو ناول کے قصّے سے الگ ہیں۔ اسی قسم کے قصّے ہماری داستانوں میں بھی ملتے ہیں جن کا داستان کے مرکزی حصّے سے بظاہر یا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اگر انہیں داستان سے الگ کر دیا جائے تو داستان کے مرکزی قصّے پر کوئی خاص اثر بھی نہیں پڑتا۔ ان قصّوں کو ہم افسانوں کے ذیل میں لا سکتے ہیں۔ یہی افسانے کی ابتداء ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے "ریڈ گانٹ لٹ" (RED GAUNTLET) میں ایک شخص ولی ایک قصہ سناتا ہے۔ یہ قصہ انگریزی ادب میں مختصر افسانے کی ابتدائی مثال ہے۔

ایسے ہی ہی چھوٹے چھوٹے قصّوں کو دیکھ کر ایڈگر ایلن پو کو یہ خیال آیا کہ مختصر افسانے کو ایک الگ صنف بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا مجموعہ اس اعتبار سے جدید افسانے کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ فن مقبول ہو گیا اور جلد ہی اس میں موپاساں اور چیخوف جیسے بڑے بڑے نام نظر آنے لگے۔ اب تو افسانہ ایک ایسی صنف ادب بن گیا ہے کہ شاید ہی کوئی مقبول یا نامقبول رسالہ ایسا ہو جس میں اسے اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ ہمارے ہاں پریم چند

نے اس صنفِ ادب کو اپنایا اور اپنی صلاحیتوں سے اسے ایسا مقبول بنایا کہ لکھنے والوں کی نئی نسل اسے لے اڑی اور اس منزل پر اسے پہنچا دیا جہاں آج یہ نظر آتی ہے۔ اگر شاعر حضرات بُرا نہ مانیں تو بلا تامل یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس وقت غزل سے بھی زیادہ مقبول صنفِ ادب ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عام انسانوں کو دوسروں کے تجربات میں شامل ہونے اور دوسروں کی کہانیاں سننے کا شوق ازل سے ودیعت ہوا ہے۔ اس دلچسپی اور اس صنفِ ادب کی مقبولیت نے افسانے میں ایسا تنوع پیدا کیا کہ آج اتنی قسم اور اتنے رنگ کے افسانے نظر آتے ہیں کہ اب ان کی درجہ بندی بھی ممکن نہیں رہی ہے۔ لیکن اس تنوع اور رنگارنگی کے باوجود اچھے افسانوں میں ایک بات مشترک اور ضرور نظر آتی ہے اور وہ ہے "اتحادِ اثر"۔ اتحادِ اثر کے معنی یہ ہیں کہ مختصر افسانے میں ایک ہی واقعہ ہو، ایک ہی کردار آئے، قصّے کا رُخ اور موڑ بھی ایک ہو۔

یہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ متعدد اچھے افسانے ایسے ہیں جن میں ایک کردار نہیں بلکہ بہت سے یا کئی کردار ملتے ہیں۔ مثلاً غلام عباس کے افسانے "آنندی" میں۔ احمد علی کے افسانے "ہماری گلی" میں۔ حسن عسکری کے افسانے "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" میں۔ احسن فاروقی کے "برقعہ والیاں" میں یا اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے "شمن بیرا" میں سات آٹھ تاثرات بیان کئے گئے ہیں۔ عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابوالفضل صدیقی، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، صادق حسین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، قاضی عبدالستار، شوکت صدیقی، واجدہ تبسم، رام لعل، جوگندر پال اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ایک ہی افسانے میں کردار و تاثرات

کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ گورکی کے افسانے "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" موپاساں کے افسانے "اَن دی (UNE VIE) میں بھی یہی عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سارے کردار بنیادی طور پر ایک ہی کردار کا حصّہ ہوتے ہیں۔ گورکی کے افسانے میں چھبیس کے چھبیس مرد ایک لڑکی کی بدلتی زندگی کو دیکھنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں رہے ہیں۔ نیتھل ہاتھورن کی کہانی "بتھری فولاڈ ڈیسٹینی" میں ساری زندگی کا قصّہ آگیا ہے مگر قسمت کے وہی تین پہلو جو شروع میں سامنے آتے ہیں، ہر جگہ ساری کہانی میں موجود رہتے ہیں، اور مرکزی کردار ایک ہی رہتا ہے۔ غرض کہ اتحادِ اثر ہمیشہ کی طرح آج بھی مختصر افسانے کی بنیادی و مشترک خصوصیت ہے۔ چیخوف نے تو اتحادِ اثر کو اس درجہ اہمیت دی کہ اس کے افسانوں میں کردار اور قصّہ دونوں غائب ہوگئے اور صرف تاثر ہی تاثر باقی رہ گیا۔ اسی اثر کو ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں استعمال کیا مثلاً کرشن چندر نے جتنے افسانے لکھے ان میں مخصوص تاثر کو اُبھارنے کے لئے ایسے نقشے جمائے کہ آخر میں سرمایہ دار سے نفرت اور مزدور سے ہمدردی کا اثر قائم ہو۔

تاثر کا یہ سلسلہ جب اور آگے چلا تو پھر افسانے کو ہر قسم کے نفسیاتی اور سماجی نظریات کے تجربوں کا آلۂ کار بنایا گیا۔ یہ کام اُردو افسانے میں بھی ہوا اور مغرب کے افسانے میں بھی۔ اسی رجحان کے ساتھ وہ لوگ سامنے آئے جو فرائڈ کی نفسیات کا سہارا لیکر اپنے افسانوں میں نفسیاتی اُلجھنوں کا تاثر پیش کرتے تھے مثلاً انگریزی میں ڈی، ایچ لارنس اور اُردو میں منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے نام اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ "شعور کی رو" STREAM OF CONSGIOUSNE والے افسانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انگریزی ادب میں جس کی ممتاز نمائندہ ورجینیا وولف

اور اُردو میں محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر احسن فاروقی ہیں۔ عسکری کے افسانے "چائے کی پیالی" اور "حرامجادی" قرۃ العین حیدر کے افسانے "جلاوطن" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

اُردو افسانے نے ۵۰ سال کے عرصے میں بہت ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت عرصہ تک زندہ رہنے والے متعدد افسانے وجود میں آگئے لیکن ہمارے دور میں افسانے کو سب سے زیادہ نقصان دو چیزوں سے پہنچا۔ ایک تو اس بات سے کہ اچھے ادبی رسالے تیزی سے غائب ہوگئے اور دوسرے اس بات سے کہ ڈائجسٹوں نے پست مذاق کو اتنا عام کیا سنسنی خیزی، جرائم، فراریت، بیمار جذباتیت، جھوٹی روحانیت، جاسوسی، فرضی واقعات، کی کہانیاں، اتنی کثرت سے چھاپیں اور لکھنے والوں کو ایسا معقول معاوضہ دیا کہ سنجیدہ اور اچھے افسانہ نگار بھی اسی قسم کی کہانیاں لکھنے لگے۔ اِدھر اخباروں نے اپنی اشاعت بڑھانے اور ادبی رسالوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلاء کو پُر کرنے کے لئے یہ کیا کہ وہ بھی ادب چھاپنے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ ادب جو اخباروں میں چھپتا ہے صحافت کی سطح سے بلند نہیں ہوسکتا۔ لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسے ایسی ہلکی پھلکی چلتی ہوئی سرسری چیز اخبار کے لئے لکھ کر دینی چاہیئے جو اخبار کے قاری کے لئے مناسب ہو اور جسے وہ چلتے پھرتے پڑھ سکے۔ اسی کے ساتھ امپوسٹر (IMPOSTER) اخباری ادیبوں کی ایک پلٹن تیار ہوگئی جو اخباروں کے کالم نویس بن کر داد لینے اور شہرت بٹورنے لگے۔ اب ادیب اور افسانہ نگار وہی لوگ رہ گئے جو باقاعدگی سے اخباروں میں چھپتے ہیں۔ اور دوسرے لکھنے والے پبلک کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ اس طرح ادب کے ابلاغ کے سارے ذرائع امپوسٹرز اور سوڈو انٹیلیکچول کے ہاتھ میں آگئے جو اخباری پالیسی کے مطابق وقت پڑنے پر کبھی "بائیں" بن گئے اور کبھی "دائیں" ان سب چیزوں نے بحیثیت مجموعی ادب کو شدید نقصان پہنچایا۔ اور ادبی مذاق کو پست سے پست کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

اور صاحبو! جب زوال آتا ہے تو پھر ادب اور صحافت میں انتشار اور اتحاد میں ترقی اور تنزل میں دانش اور حماقت میں آئیڈیلزم اور سوڈو آئیڈیلزم میں، اچھے اور بُرے میں نیکی اور بدی میں، خود غرضی اور بے لوثی میں، نفرت اور محبت میں، تعصب اور فراخدلی میں، حب الوطنی اور غداری میں، علاقہ پرستی اور قوم پرستی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اور منفی قوتیں مثبت قوتوں پر حاوی آجاتی ہیں۔

بہرحال پریم چند کے بعد اور ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے اُردو افسانے پر نظر ڈالی جائے تو یہ تین رجحانات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) افسانے میں نئے نئے تجربے کئے گئے۔ قصہ یا قصہ پن کو افسانے کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ جدید افسانہ ہے۔ داستان نہیں ہے۔ کہانی کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ اس میں کہانی نہ ہو۔

(۲) افسانے میں واقعیت یا ریئلزم کو حد درجہ برتا گیا اور اس میں نظریات کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ کبھی اشتراکیت کے نظریے سے زندگی کو دیکھا اور پیش کیا۔ اور کبھی نفسیاتی تحلیل اور عام طور پر جنسی محرکات کے کرشموں کو رنگا رنگ طریقوں سے پیش کیا۔ وہ تصورات جو جنسی نفسیات کے ماہرین نے پیش کئے تھے انہیں افسانے کا مواد بنایا گیا۔ اور اس بات کو بھلا دیا گیا کہ خود یہ تجربے زندگی سے قریب تھے یا نہیں۔

(۳) افسانہ لکھنے میں سیدھے سادے افسانوی طریقے کے بجائے شعور کی رو، تاثراتی طریقے اور فلسفۂ وجودیت سے کام لیا گیا اور تکنیک کو خاص اہمیت دی گئی۔

پہلے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ محض فرضی واقعات کی جگہ ایسی واقعیت نے لے لی، جو علم پر مبنی تھی اور اسی لئے دعوت فکر دیتی تھی۔ تیسرے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ بیان کے نئے طریقوں نے سیدھے اور سپاٹ بیانیہ انداز کے بجائے جدید معنی میں فن کو پیدا کیا۔ ان تینوں رجحانات نے اُردو افسانے کو بہت آگے بڑھایا لیکن ۱۹۶۵ء کے بعد اُردو افسانے میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں ان کی درجہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) اب ایسے افسانے لکھے جا رہے ہیں جن میں واقعیت کے بجائے جس کو اب تک افسانے کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا زیادہ تر زور مافوق الفطرت تخیلی اور جذباتی عناصر پر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور افسانے کو ملا کر ایک کیا جا رہا ہے۔

(۲) اشاریت کے ذریعے پرانی کہانیوں کو زندہ کیا جا رہا ہے اور پرانی کہانیوں کو نئے معنی دیئے جا رہے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ابہام، رومانیت، پُراسراریت اور تکرار کے عمل سے افسانے اور شاعری کی سرحدیں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انتظار حسین کے علامتی افسانے "شہر افسوس"۔ "زرد کتا" اور "آخری آدمی" اسی ذیل میں آتے ہیں۔ انتظار حسین کی اشاریت تمثیلی نوعیت کی ہیں جن میں پرانے قصوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "آخری آدمی" میں اساطیری علامتوں کو دورِ حاضر کے اخلاقی زوال کی داستان بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔ "شہر افسوس" میں بھی داخلی عمل یہی ہے۔ شہر افسوس کی کہانیوں کے ایک دوسرے پر ہر دم شک کرتے اور خود کو معصوم سمجھتے ہوئے لوگ اسی اخلاقی زوال کا اظہار کرتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنے مجموعے "استعارے" میں بھی پرانے اشاروں کو نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً سنڈریلا اور سیفیس تو یورپ کے ادب کی جانی پہچانی علامتیں ہیں۔ سنڈریلا عورت کی جنسی خواہش کی۔ اور سیفیس فنکار کی انقلابی تو تیں کی۔ اسی طرح بعض نئی علامات بھی استعمال کی ہیں۔ اور ان میں واقعاتی رنگ ہے انہیں اپنے دور سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ ان علامتی افسانوں میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ ان میں شاعری اور افسانے کو تخیل کی

سطح پر ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتظار حسین نے اپنے علامتی افسانوں میں غزل کے مزاج کو اور انور سجاد نے شاعری اور مصوری کے مزاج کو تخیل کی سطح پر افسانے میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اظہار، تکنیک اور کہانی کو جما کر پیش کرنے کی قوت کے اعتبار سے انتظار حسین نہ صرف علامتی افسانے کے پیش رو ہیں بلکہ انور سجاد سے زیادہ پُراثر ہیں۔

(۳) ایسے افسانے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں جن میں سماج کے زخموں کو چیر کر مرہم لگائے بغیر یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ آخر زندگی کا حاصل موت ہے۔ ایسے افسانوں کے ذریعے فن انتشار پیدا کر رہا ہے منفی قوتوں کو اُبھار رہا ہے، تحریک کو زندہ کر رہا ہے۔ ادب کا وہ دائمی معیار کہ ادب کا اثر تزکیاتی (کیتھارسیس) ہوتا ہے، ان افسانوں میں نظر نہیں آتا۔ تزکیاتی اثر ادب کا مثبت رجحان ہے۔ ادب میں کیتھارسیس کے عمل سے ارسطو کی مراد یہ تھی کہ ٹریجڈی، موت اور دہشت کے منظر ہی پیش نہ کرے بلکہ انسان کو ان سے بالاتر محسوس کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرے چنانچہ، ٹریجڈی موت کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ زندگی کو موت سے بالاتر اور فاتح کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

(۴) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جو واقعیت سے تو نہیں ہٹے مگر اس واقعیت پر جذباتیت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ یہ افسانے وقتی اور عارضی سنسنی سی پیدا کر کے رہ جاتے ہیں اور جس کا اثر پڑھنے والے پر منفی ہوتا ہے۔ اس رجحان میں صرف کلبیت ہی نہیں ہے بلکہ بزدلی اور زندگی سے فرار کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں تاثر سے رنگ بھرا جاتا ہے اور غم کی دلدل میں دھنس کر لذت حاصل کی جاتی ہے۔

(۵) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جنہیں ہم تجریدی افسانے کہہ سکتے ہیں۔ یہ افسانے علامتی افسانے سے آگے بڑھ کر تجریدی مصوری کی تکنیک کو افسانے میں استعمال کر رہے ہیں۔ اب تک جتنے افسانے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں گہرے ابہام کا انتشار موجود ہے اور "وحدت تاثر" کی جگہ انتشار تاثر کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں علامتیں ٹوٹی ہوئی نظر آئیں گی، شاعری کو افسانے سے ملانے کا عمل بھی نظر آئے گا اور واقعات کے بیان میں فوق الفطرت، ماورائی عناصر غالب ہوں گے اور ایسا معلوم ہوگا جیسے مکان کی چھت گر گئی ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں بیمار رومانویت کا ایسا ابہام نظر آتا ہے جن میں حقیقی دُنیا کا عکس یا اُس کی روح کا دور دور پتہ نہیں چلتا۔

(۶) ایک اور قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں لمحوں کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں، ان میں نہ کوئی ہیئت ہے اور تجربہ بھی خام اور ادھورا ہے۔ امریکی افسانہ نگار ولیم سرویان نے بھی ایک طرح سے ایک لمحے کے افسانے لکھے ہیں لیکن ان میں افسانے کا بنیادی فن یعنی وحدت تاثر موجود ہے۔ لمحہ کے افسانوں میں تذبذب اور پریشانی و کرب کی کشش تو موجود ہے لیکن ان افسانوں کے گنبد بے در سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں اس ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جسے ژاں پال سارتر "جہنم" سے تعبیر کرتا ہے لیکن سارتر کے افسانوں میں اس کیفیت کو ہمت اور احساس ذمہ داری سے توڑنے کی علامتیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن لمحے کے افسانے لکھنے والے پڑھنے والے کو ہلکان کرنا چاہتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اخلاقی طور پر بزدل اور نفسیاتی طور پر مذبذب ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر انسان تھک جاتا ہے۔ اور زندگی کے مثبت پہلوؤں سے نظریں چرانے لگتا ہے۔ وجودیت میں تذبذب اور کرب (ANGUISH AND DISGUST) ضرور موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ انتخاب (CHOICE) بھی موجود ہے۔ سارتر کے

ہیں وہ اس انتخاب CHOICE تک ضرور پہنچتے ہیں ۔

(۷) ایک قسم افسانوں کی وہ ہے جن میں چٹکلوں پر افسانہ لکھا جاتا ہے ۔ یہ افسانہ تو چند سطروں میں ختم ہو جاتا ہے یا پھر ایک آدھ صفحے میں بیان کر دیا جاتا ہے لیکن ان میں کسی ہلکے یا گہرے تجربے کا پتہ نہیں چلتا ۔ جوگندر پال نے اس قسم کے افسانے لکھے تھے لیکن اگر افسانے میں زندگی کا تجربہ شامل نہ ہو تو وہ پڑھنے والے کی زندگی میں کیسے شامل ہو سکتا ہے ۔ یہ رجحان دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا ۔

افسانے کے ان سب جدید رجحانات کو دیکھ کر ہمیں اُردو افسانے سے مایوس ہونا چاہئیے تھا لیکن اس کوڑے میں کچھ ایسے پھول بھی کھلے ہیں جن میں رنگ و بو اور ہیئت کے مخصوص توازن کا شدت سے احساس ہوتا ہے ۔ ان میں تجربہ پہلی اور بنیادی شرط ہے ۔ قصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا ہے ۔ مختلف نظریات بھی حسبِ ضرورت استعمال میں آ رہے ہیں ۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو افسانے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ، ان کو ایک نئی مرکزیت حاصل ہو رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اُردو افسانے کے ایک نئے دور کے آغاز میں بہت دیر نہیں ہے ۔ یہاں میں نے آپ کے سامنے صرف چند نمایاں رجحانات کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں چند رجحانات کا اور اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگاروں کے افسانے کے حوالے سے ان رجحانات کی مثالیں دیکر ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے ــــــ

▲▲

مہملات کہ لسانی تشکیلات؟ نام زنگی کافور

افتخار جالب
(پاکستان)

جذبۂ بے اختیار کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ ابتداء میں ہر شاعر کے پاس جذبۂ بے اختیار ہی ہوتا ہے۔ اکثر جذبۂ بے اختیار کی بے شکلی اتنی مشکلیں پیدا کرتی ہے کہ شاعر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ کچھ دن استقامت کا ثبوت دے بھی تو ناشناسی کی فضا حوصلہ شکنی کر کے دم لیتی ہے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ جذبۂ بے اختیار کی بے شکلی تراش خراش کے بعد بآسانی گرفت میں آنے والے جذبوں سے مماثل شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان تین وجوہ کی بناء پر جذبۂ بے اختیار کو من وعن قائم رکھنے والی شاعری کو برقرار رکھنا شاعر کے لئے دشوار تر ہوتا جاتا ہے۔ شاعری بتدریج جذبۂ بے اختیار سے دامن چھڑا کر با اختیار جذبوں کی سمت میں بڑھنے لگتی ہے۔ لیکن یہ کبھی بھی نہیں ہوتا ہے کہ جذبۂ بے اختیار اپنی بے شکلی سمیت شاعری کا پیچھا چھوڑ دے۔ اسی سبب جذبۂ بے اختیار سے آغاز پذیر ہونے والی شاعری مانوس جذبوں کی شاعری کے لئے تناظر کا کام کرتی ہے تو مانوس جذبوں کی شاعری جذبۂ بے اختیار کی شاعری کی تفسیر کرتی ہے۔

میرزا غالب کی جذبۂ بے اختیار کی شاعری مدتوں مہمل کی ذیل میں رہی ہے۔ ہر کسی نے سہل ممتنع کو بنیاد بنا کر جذبۂ بے اختیار کی شاعری کو رد کیا ہے۔ یہ تکلیف کسی نے بھی گوارا نہیں کی کہ سہل ممتنع کے پس منظر میں جھلملانے والی جذبۂ بے اختیار کی شاعری کی مدد سے سہل ممتنع کی توسیع کرے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوا ہے کہ سہل ممتنع کی روشنی میں جذبۂ بے اختیار کی توضیح نہیں کی گئی۔ جذبۂ بے اختیار کی شکلیں مہملات کے زمرے میں رہیں۔ یہ مہملات سہل ممتنع پر اثر انداز ہوئیں نہ سہل ممتنع مہملات کو تبدیل کر سکا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اول تو یہی بات متنازع فیہ ہے کہ آپ انہیں مہملات کیوں کہتے ہیں؟ آپ کو اپنی سخن فہمی مبارک ہمیں تو یہ جذبۂ بے اختیار کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جذبۂ بے اختیار کی شاعری آپ کی سہل ممتنع کی شاعری کے ہم پلہ ہے۔ ضد میں آ کر تو ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جذبۂ بے اختیار کی شاعری مانوس جذبات کی شاعری سے بہتر ہے۔ معاملہ محض ضد کا

ہیں۔ مانوس جذبات کی شکلیں جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ انہیں گرفت میں لینا اتنا دشوار نہیں جتنا کہ غیر مانوس جذبۂ بے اختیار کی بے شکلی سے دست و گریبان ہو کر کوئی صورت تشکیل کرنا۔ چاہے یہ تشکیل کتنی ہی واجبی کیوں نہ ہو، مانوس جذبوں کی بنی بنائی شکل کی نقل سے بہتر ہے۔ جذبۂ بے اختیار کی ایک مربوط نظم دیکھئے۔ ؎

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں
ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لخت لخت شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں
واں سیاہی مردمک ہے اور یاں داغِ شراب
مہ حریفِ نازشِ ہم چشمیِ ساغر نہیں
ہے فلک بالانشینِ فیضِ خم گردیدنی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں
دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں
کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں
تابِ عرضِ تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

جذبۂ بے اختیار کی اس مربوط نظم میں ربط کی بنیاد امیجری کی بدولت ہے۔ گردشِ دوں سے کسی کا اوجِ کمال دیکھا نہیں جاتا۔ مصیبتیں آ کھڑی ہوتی ہیں۔ اس سے بڑی رسوائی کیا ہوگی کہ اپنے دیار میں، اپنے وطن میں بے قدری ہو۔ چرخ چنبری کی پیدا کردہ مشکلوں سے نجات کا یہی ذریعہ ہے کہ عاجزی اختیار کی جائے۔ اپنے کمال سے منہ موڑ لیا جائے۔ مگر یہ عاجزی نمائشی ہے۔ اصلی نہیں۔ عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں۔ ضبط وارستگی، آزادی، تنہائی کے پہلو بہ پہلو عاجزی کی کیفیت جلوہ فگن ہوتی ہے۔ کمال کو چھپانے کے بعد جو ناآسودگی پیدا ہوتی ہے اس کی سیرابی انکساری سے کی گئی ہے۔ یہ کیفیات تشنگی کی قلب ماہیت کر کے تمام انسلاکات کے مطالب بدل دیتی ہیں کہ دل کو اظہارِ سخن اندازِ فتح الباب ہے۔ اظہارِ سخن محولہ ممتنع کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔ فتح الباب سے مدینۃ العلم اور کنزِ مخفی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ درِ خیبر کو بزور اکھاڑ پھینکنا بھی ذہن میں آتا ہے۔ اظہارِ سخن اپنے دامن میں روحانی علوم کا بزور، توڑ پھوڑ کر انکشاف لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح تشنگی ایک روحانی کرب کے اظہار کی خواہش ہے۔ یہ خواہش ایسی ہے کہ اس کا برملا اظہار نہیں کیا جا سکتا کہ سو سو طرح کی تہمتیں تراشی جائیں گی۔ منجملہ ایک یہ کہ رندِ خراب مدینۃ العلم اور کنزِ مخفی کا کسی طور مدعی ہے۔ ان مصیبتوں میں پڑنے سے بہتر یہی ہے کہ انکساری اختیار کی جائے۔ سچ مچ منکسر المزاج ہونا اور بطور مصلحت انکساری اختیار کرنا دو علیحدہ علیحدہ رویے ہیں۔ یہاں دکھاوے کی عاجزی ہے، اظہارِ سخن کے وسیلے سے صریرِ خامہ نوائے سروش ہے۔ صریرِ خامہ دراصل دروازہ کھٹکھٹانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ نوائے سروش اور صریرِ خامہ کا اس سیاق و سباق میں بدیہی تقاضہ ایک ایسی روحانی واردات کو واشگاف کرنے کا ہے جس پر بے شمار پابندیاں ہیں۔ ان پابندیوں نے گھٹن اور تشنگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں۔ صبر کا یارا نہیں ضبط کی پابندی ہے: خواہش اظہار بے پناہ ہے دہائی ہی دی جا سکتی ہے۔ تابِ عرضِ تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں۔ ساقیِ کوثر کی پیش آگاہی۔ مدینۃ العلم کے حوالے، تشنگی کی نسبت سے پانی کے تلازمات پھیلے ہوئے ہیں۔ ضبط کو وارستگی سے پیوست کر کے دامنِ تمثال کی مثال لائی گئی ہے۔ ضبط کا مطلب

وارستگی، آزادی، بے قیدی۔ ایسی بے مجبوری کی کیفیت جو آبِ آئینہ سے تر، ملوث نہیں۔ آب کے لغوی معنی ثانی کا تصور لایا گیا ہے۔ تصویر کے مانند: پابند آزاد: ضبط و وارستگی کہ آبِ آئینہ کی روبہ انسی اور گلوگیر اشک نا کی لئے ہوئے ہے۔ پر نہیں ہے کہ دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں۔ آبِ آئینہ سے مرواریدکی چمک دمک کی جانب ارتحال ہوتا ہے۔ صدف: عزلت آباد، بے قدری، ضبط و وارستگی، بے مہری اربابِ وطن، تنہائی: صدف اور سمندر: پیاس اور پانی: تشنگی اور ضبط کے ساتھ قدر و قیمت، چمک دمک اور عزت و احترام کے انسلاکات، پانی کے مفاہیم کو روبہ تغیر رکھتے ہیں، کثیر المعنی بناتے ہیں، توسیع کرتے ہیں، ناؤنوش کا اضافہ ہوتا ہے۔ برہم خوردن کی نسبت سے لخت لخت موجود ہے تو بزمِ سرور کے تقابل کے لئے شیشۂ شکستہ۔ برہم خوردنِ بزمِ سرور کی پوری ترکیب کو پیش نظر رکھا جائے تو استدلال امیج کے طور پر لخت لخت شیشۂ شکستہ آتا ہے۔ یوں نسبت اور تقابل کے رویوں سے تصادم پیدا ہوتا ہے: انداز نشتر، ضبط و برہمی، پابندی و وارستگی، سرور و شکست: ناؤنوش کی فضا، جام و مے سے آسودہ حالی کی غمازی: خواہش، نارسائی۔ شیشۂ شکستہ، آئینہ اور مروارید میں روشنی اور چمکیلے کے آثار موجود ہیں۔ برہم سرور کی رعایت سے داغِ شراب اور ہم چشمیِ ساغر کا خیال ابھرا ہے۔ ہم چشمیِ ساغر مردمک سے منسلک ہے: اس کے جلو میں سیاہی، سیاہیِ شب، مہ تاباں مناسبت کی ایک چیلیاں بنتی ہے۔ داغِ شراب اور مہتاب، ہم چشمیِ ساغر اور سیاہی، مردمک: تشنگی روشنی اور پانی کے تلازمات ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ مہتاب کا لسانی منطقہ فلک کو سامنے لاتا ہے تو ساغر کا لسانی مترادف خم بھی پیچھے نہیں رہتا۔ خم گردیدنی سے گردشِ دوراں کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ روحانی

تشنگی جو اظہار چاہتی ہے، اس پر ملایانِ دین بھڑک اٹھیں گے اس لئے ساقیِ کوثر سے استمداد کی درخواست کی گئی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ملایانِ دین ہر زمانے میں روحانی واردات کے اظہار کی راہ میں ایک ہی طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔

جذبۂ بے اختیار کو منظم کرنے والی ایسی نظموں کو سخن فہموں نے مہملات کہا ہے۔ اگر مہملات کہنے سے گریز کیا ہے تو کسی اور حیلے بہانے سے رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں: غالب جس قسم کے شاعر بنے اس کا اولین عکس ان کے ابتدائی کلام میں موجود ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری کا ابتدائی رنگ وہ راستہ تھا جو منزل کی طرف جانے کی بجائے ترکستان کو جاتا تھا۔ غالب نے اپنا ابتدائی رنگ سخن بعض سخن شناس دوستوں کے مشورے سے ترک کیا یا خود اپنی سلامتیِ طبع کے اثر سے، بہرحال اپنے اور اردو شاعری کے حق میں اچھا کیا۔ ان کی ابتدائی شاعری، ان کی جدت پسندی اور تجربہ پسندی کا بہترین ثبوت ہے۔ لیکن شعر و ادب میں صرف جدت یا صرف تجربہ بجائے خود کوئی قدر نہیں۔ شاعری کی اہمیت اور عظمت اس کے جدت پسندی یا تجربہ پسندی سے پیدا ہونے والے ٹھوس کارناموں پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے غالب کی ابتدائی شاعری دورِ حاضر کے بے راہ رو شاعروں کے لئے ایک زبردست تنبیہہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ شعر و ادب میں صرف کسی نئے راستے پر چل نکلنا کافی نہیں، نئے راستے پر چل کر کسی اچھی منزل پر پہنچنا بھی ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر شاعری میں صرف انفرادیت کا مالک ہونا کافی نہیں، انفرادیت کا جاندار اور پائیدار ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر غالب اپنے ابتدائی رنگِ سخن پر قناعت کر گئے ہوتے تو وہ اس رنگ کی ساری اشتعال انگیزیوں کے باوجود لوگوں کے ذہن سے محو ہو چکے ہوتے۔ اگر آج ہم غالب کی ابتدائی شاعری

لائقِ توجہ سمجھ رہے ہیں تو اول تو اس لئے کہ بڑے شاعر کی بُری شاعری بھی ایک معنویت اختیار کرلیتی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ غالب کی بُری شاعری میں بھی کئی اشعار اتنے اچھے ملتے ہیں کہ وہ بُری شاعری کی تلافی کر دیتے ہیں ـــ لاحول ولاقوۃ۔ اس جذبۂ بے اختیار کی شاعری کو بُرا کس لئے کہا جارہا ہے۔ کیا اس میں انفرادیت کے بجائے جذبۂ بے اختیار کی بے شکلی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جو آپ کی تن آسانی کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے؟ آپ جستہ جستہ اشعار کو پڑھتے اور پسند کرتے ہیں ـــ آپ نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ مربوط نظم سے لطف اندوز ہونے کے لئے سلسلۂ ربط دریافت کرنے کی زحمت کون کرے؟ آپ کے لئے ریزۂ خیال ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ ذرا یہ دیکھیں کہ جذبۂ بے اختیار کی شکل کو گرفت میں لینا، من و عن گرفت میں لینا کتنے جوکھم کا کام ہے؟ آپ لے دیکے مانوس جذبوں کے میانفے کے کھلاڑی ہیں۔ کبھی کبھی جذبۂ بے اختیار کی نامانوس شکلوں کی بے شکلی پر بھی توجہ کرلیا کریں ـــ آخر زندہ آدمی یک سُرا ہونے پر اتنا تقاضہ کیوں کرے۔ ▲▲

ادب اور نفیِ ادب

سعادت سعید
(پاکستان)

"اس زمین پر بانجھ بادلوں کا سایہ ہے اور اس زمین کا سایہ ہماری چھاتیوں پر۔ ایڑیاں مارتے مارتے ہماری ایڑیاں چھل گئی ہیں، چشمے کہاں ہیں؟"

"کیکر" ــــ از انور سجاد

چشمے کہاں ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی عدم موجودگی نے ہمارے دانشوروں کو ڈس الوژن کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہماری زمین پر بانجھ بادلوں (غیر قومی ثقافت) کا سایہ ہے اور یہ بھی کوئی زیادہ غلط نہیں ہے کہ ہم نے اس زمین سے چشمے نکالنے کی بڑی کوشش کی۔ چشموں کو نہ ملنا تھا نہ ملے کہ غیر قومی ثقافت کسی بھی دھرتی کو بانجھ بنانے میں بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے۔ ان چشموں کا کھوج لگانے کی کہاں تک کوشش کی جاتی؟ نعرے لگائے، جلوس نکالے۔

ہمارے دانشوروں کے خواب بکھر گئے، سوچیں منجمد ہو گئیں۔ قلم یا قصیدہ گو ہو گئے یا خاموش! البتہ کبھی کبھی کوئی دکھ بھرا نوحہ یا اذیت ناک سوال صفحۂ قرطاس پر آ دمکتا ہے۔ اس صورتحال میں ادب کا مسئلہ غم دوش سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ البتہ نفیِ ادب کا عمل جس سرعت سے ظاہر ہوا ہے اس کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈس الوژن منڈ نفیِ ادب کا "ادب" تو پیدا کر سکتی ہے۔ حقیقی ادب کی تخلیق اس دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔

حقیقی ادب تو شعور کی درست سیاسی، ثقافتی اور نظریاتی جہت ہی کی بدولت وجود میں آتا ہے۔ حقیقی دانشور یہ سوال بھی نہیں کرتے کہ چشمے کہاں ہیں ــ؟ انہیں معلوم ہے کہ چشمے کہاں ہیں لیکن ان کے قلم خاموش ہیں۔ چشموں کا سراغ لگے تو کیسے؟ وہ سب کچھ جانتے ہیں، کہتے نہیں! وہ سب کچھ دیکھتے ہیں اظہار نہیں کرتے۔ وہ موت کی جانب رینگتی مخلوق کی چیخیں سنتے رہے انہیں دلاسا بھی تو نہیں دیا۔ ان کے جسموں کے ریشم پر خون تھوکتی مدقوق زندگی کی اکھڑی سانسیں لہراتی رہیں وہ اس اذیت کی قلمی تصویریں بھی تو نہیں بنا پائے۔ غیر قومی نظریات کا بارود ڈھیر ڈھیرے فولادی تمناؤں کی دیواریں کاٹ رہا تھا۔ سوچوں کے وسیع و عریض آزاد

سمندر غلامی کے صحراؤں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ جنوں کی حکایت خونچکاں کہنے کا حوصلہ کس میں تھا کہ ہاتھ قلم ہونے کا اندیشہ تھا۔ متاعِ لوح و قلم تو چھن ہی چکی تھی۔ حلقۂ زنجیر میں اپنی زبانیں کاٹ کر رکھنے والے ہم) خاموش تھے۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ کیوں؟ وضاحت سے کیا فائدہ آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوگا۔ آخر کھلے بندوں دنیاوی عیش و عشرت کی تحصیل بھی تو دانشور کا حق ہے تو پھر سوال ایسے نہیں ہے کہ فتوے دیکر، دھونس جما کر، نسطائی نفسیات برت کر ایسی اخلاقیات کی تلوار لیکر نفی ادب و فن کا اہتمام کیوں ہو رہا ہے؟ سوال تو یوں ہونا چاہیئے کہ حقیقی ادب و فن تخلیق کیسے ہو؟ ٹال مٹول، انکل عرفی، ٹی وی تھیٹر ایک محبت سو افسانے، زندگی نے زندگی، اور شمع وغیرہ وغیرہ کے جو کمرشیل ادب کے زمرے میں آتے ہیں غیر قومی سپر سٹرکچر کے استحکام کے لیے دیمک زدہ لکڑی کے ساختہ سہارے ہیں۔ یہ ادب پاکستانی افراد کی تمثال کی تلمیع میں مصروف ہے، بے معنی انسانیت پرستی، رومانس، جرائم، ملازمت اور بے کار اصلاح پسندی کے کمپیوٹروں سے برآمد ہونے والا یہ ادب طمع اور فرسٹریشن کا ماخذ ہے۔ اس صورتحال میں پاکستانی فرد اپنے وجود کے امکانات نہ کھودے تو اور کیا کرے؟ اس کی ذات کے تخلیقی سوتے خشک نہ ہوں یا اس کا ضمیر میکانکی نہ ہو تو پھر اور کیا ہو؟ ہمارے انسانوں کی شخصیتیں اور جذبات مقررہ حد بندیوں اور جہتوں کے پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ کولہو کے بیل بن چکے ہیں، کیا ادب اسی کا نام ہے؟

کمرشل دانشوروں کے لئے انسان اور اس کا سماج خام مال ہیں، ڈرامے، شاعری، اور نثر کی بھٹیوں میں یورپی صنعتی اخلاقیات کا آرٹ اور ڈالر کا انسان اور اس کی وارداتیں، نتیجہ کیپٹل، ٹریڈ بیلنس، نئے شیئرز اور ادب و فن کا انڈسٹریل کمپلکس، پرانی ادبی اجارہ داریاں زوال پذیر ہوتی ہیں اور نئی مرکزی اجارہ داریاں وجود میں آتی ہیں۔ نئی نسل کے

ادیب و شاعر طبع کی اس صورتحال میں لفظ کی حرمت، ضمیر کی حریت، اور خیال کا ترفع کیسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ ادب کے کارخانے تو آرڈر پہ مال سپلائی کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ریڈیو اور ٹی وی کی استقبالیہ کے کمروں میں موجود رجسٹروں پر جن دانشوروں کے نام محفوظ ہیں ان سے پوچھ کر دیکھ لیجیے۔ گتھی سلجھ جائے گی۔

ہمارے دانشور مغربی ثقافت کے مرتبہ خوابوں کو اپنے خواب سمجھتے ہیں۔ "اسے عشق ازل گیر و ابد تاب میرے بھی ہیں کچھ خواب" اجنبی کارخانوں کے ساختہ خوابوں کے خوانچے ہمارے مقدر میں ہیں اور ہمارا نعرہ ہے "خواب لے لو، خواب لے لو خواب" چلیے ریڈیو اور ٹی وی کے ان سات دروازوں سے باہر نکلیں جن میں "علی بابا چالیس چوروں" نے متحد ہو کر پناہ گاہ تعمیر کی تھی۔ آخر سارا ادب خواتین کے سال، امیر خسرو کی صد سالہ تقریبات، مزدوروں اور کسانوں کے ہفتے وغیرہ میں تو مقید نہیں ہے۔ گوشِ نصیحت نیوش اور دیدۂ عبرت نگاہ کے لئے گلی گلی، محلے محلے اور شہر شہر ہزاروں ادبی میلے لگے ہیں۔ ادبی انجمنوں کی صورت میں، رسالوں اور اخباروں کی صورت میں، شعری مجموعوں اور نثری کتابوں کی صورت میں بڑے وسیع پیمانے پر ادبی ذخائر موجود ہیں۔ یہ سب کچھ اگر ایک جگہ جمع ہو جائے تو شاید پنجاب یونیورسٹی کے حجم کی بیسیوں اور لائبریریاں تشکیل دینی پڑیں لیکن اگران "اشیاء" کا جو ادب اور ادبی تخلیق کے نام پر منصۂ شہود پر آ رہی ہیں۔ گہری نظر سے تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ ادب تو ان میں بہت کم ہے البتہ غیر قومی ثقافت کی عظیم الشان طلسماتی بستیاں، رنگ برنگے چمکیلے سائبانوں تلے نئے مسافروں کی آمد کے منتظر ہیں۔ حاتم طائی تو کوئی کوئی ہوتا ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شہروں، حویلیوں اور طلسماتی بستیوں کی نعمتوں کو ٹھکرا دے۔ اور تو تنہا صحراؤں، عفریتوں، جنگلی بلاؤں، اور پہاڑی جانوروں سے ٹکرا جائے ورنہ یورپی ثقافت کی بستیاں تو یاجوج ماجوج

کی دیوار ہو) جنہیں انتظار حسین کے افسانوی کردار اور وزیر آغا کے کلچر ہیرو ابھی تک چاٹ ہی نہیں پائے یا پھر اصحاب کہف کا وہ غار جو تین سو سال کے لئے انہیں سلا دیتا ہے اور جب وہ غار سے باہر آتے ہیں تو سکے بدل چکے ہوتے ہیں' انور سجاد کو ابھی تک فسطائی خوابوں کے غار میں محو استراحت ہے یہ نقطہ اس کی فہم سے باہر ہے۔

ہمارے دانشوروں اور ادیبوں میں تخلیقی ادب کے ضمن میں جو نظریات رائج ہیں ان کا اجمالی جائزہ اس ایلیانیشن کی وضاحت کر دے گا جس کے نتیجے میں نفی ادب کا امکان تو درخشندہ ہوتا ہے' تخلیقِ ادب خوابِ گران ہی رہتا ہے' کچھ ادیبوں اور شاعروں کا ارسطو کی پیروی میں یہ عقیدہ ہے کہ ادب کیتھارسس کرتا ہے یعنی وہ عذاب جو انسانی شریانوں میں اُبلتے لاوے کی مانند تیر رہا ہوتا ہے اس سے نجات دلاتا ہے' کیا پتے کی بات ہے مادی اور ٹھوس صورتحال جو عذابوں کی تولید کا منبع ہے وہ تو موجود رہے اور عذابوں سے نجات مل جائے! اور وہ بھی کیسے؟ اس عقیدے کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب سے یعنی ادیب جذباتی قے کرتا ہے اس کے سر کا غبار ضمیر کی کثافت اور معدے کا بحران سب کچھ ایک غلیظ قے کی صورت میں باہر آ جاتا ہے۔ کیتھارسس ہو جاتا ہے۔ ادیب کا بھی اور قاری کا بھی۔ اب انہیں کون کہلائے ادب جلاب کی گولیاں نہیں ہوتا انسانی عذابوں کو اس درجہ پر لے جاتا ہے کہ قاری خود عذاب میں مبتلا ہو کر نجات کی راہیں دریافت کرے۔ کیتھارسس کرنے والا ادب سامراجی افیون کا کیپسول ہے کہ تشدد کرنے والے ادارے اور ثقافتی دبستان انسانی ضمیر کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ یوں ادیب اور قاری ایلیانیشن کا نشانہ بنتے ہیں اور اس ذمہ داری سے نجات حاصل کر لیتے ہیں جس کا اصل اصول غیر قومی سماج اور غیر منصفانہ سماجی تنظیم کی تبدیلی ہے۔

یہ نظریہ کہ ادب لذت پرستی' عیش پرستی' سرخوشی و مستی کا وسیلہ ہے۔ ہیڈونسٹ فلسفیوں کا عطا کردہ ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ تسلیم کرتا ہے کہ ادب ذہنی عیاشی اور وقت گذاری کا ایک ذریعہ ہے چنانچہ ان کے مطابق ایسی نظمیں' غزلیں' ڈرامے' مضامین' انشائیے' افسانے اور ناول لکھنے چاہئیں جن میں دنیا کے خوبصورت مسائل سے معریٰ' دلچسپ' پرسکون اور جنت نشان قرار دیا جائے تاکہ اس قسم کے مطالعہ کے بعد قاری اطمینان سے آفس ورک کر سکے' بچوں کی دیکھ بھال میں دلچسپی لے اور تازہ دم ہو کر ہر قسم کے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یوں ادب جز وقتی عمل قرار پاتا ہے۔ انسان' اس کی ذات' سماج اور قوم کے مسائل طاقِ نسیاں کی زینت ہو جاتے ہیں۔ ایسا ادب گاڑیوں' بسوں' ہوائی جہازوں' انتظار گاہوں اور ہوٹلوں میں بھی پڑھا جاتا ہے اور اس سے رات کو خواب آور گولیوں کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ ایسے ادب کا فکر' فلسفے اور حقائق کی تہہ در تہہ گہرائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ذہنی لذتیت کی یہ صورتحال ہمارے کثیر تعداد قاریوں' اور دانشوروں کو ناکارہ کر رہی ہے۔ ایسا ادب سماجی تجزیہ کا کشٹ اٹھانے سے گریز کرتا ہے' یورپی' سامراجی' سپر سٹرکچر کے محافظوں کی نیندوں میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

ملوکی مفکروں اور بنیادی عقائد کے علمبردار دانشوروں کے نزدیک ادب کا منصب یا تو اصلاحِ معاشرہ' فنی و جمالیاتی قدروں کی تشکیل ہے یا سیاست سے فرار ہے یعنی ادب کو یا ادبی ہونا چاہیئے یا اخلاقی یا تصوراتی۔ حالی اور مولانا نذیر احمد کی تقلید میں لکھا جانے والا ادب کہ جس میں اخلاق اور اصلاح کے تصورات افراد کے لئے ہوتے ہیں برطانوی حکومت کے لئے نہیں۔ ناسخ' انشا' رجب علی بیگ سرور' اور ذوق کی روایت میں لکھا جانے والا ادب کہ جو لفظی بازیگری اور فنی موشگافیوں سے رابطہ رکھتا ہے ملکی اور قومی انتشار سے منہ ... [illegible]

اختر شیرانی، سجاد حیدر، یلدرم کی پیروی میں لکھا جانے والا ادب کہ جس میں مظاہر فطرت کی تصویر گری، تصوراتی محبوباؤں سے اظہار عشق اور انسان کے رومانی رجحانات کا تو بڑا چرچا ہے مسلمانوں کی تحریک آزادی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اصلاح معاشرہ کا ادب تلقین کرتا ہے کہ عوام کی سہولت کے لئے سڑکیں بنائی جائیں، بینک کھولے جائیں، فینانس کمپنیوں کو سودی کاروبار کی اجازت دی جائے۔ یتیموں کو خیرات دی جائے، شیطانی کام نہ کئے جائیں، فسطائی طبقوں کی اطاعت کی جائے، تعلیم عام کی جائے۔ آزادیٔ نسواں بڑی نعمت ہے، زندگی میں تنظیم پیدا کی جائے۔ ایسے کام کئے جائیں کہ خلق خدا رہتی دنیا تک یاد رکھے۔ فیملی پلاننگ ہونی چاہیئے۔ فلیٹ ڈیو صاف ہونے چاہئیں۔ چیچک کے ٹیکے لگوائے جائیں، سڑکوں پر تھوکا نہ جائے، گاڑی صحیح جگہ پارک کی جائے، ہیلمٹ انسانی سر کا محافظ ہے بقیہ جسم کی حفاظت خدا کرتا ہے۔ صلح صفائی اور امن سے رہا جائے، ہم سب انسان ہیں، سامراج کو برا نہ کہا جائے۔ پرامن بقائے باہمی کوئی بات نہیں، روٹی بانٹ کے کھانی چاہیئے اس پار والا بھی تو ہمارا بھائی ہے، آدھی لے گیا تو کیا ہوا؟ آدھی لے جانے والے آئے دن ہمارے شاعروں ادیبوں اور فنکاروں کی میزبانی کرتے ہیں۔ اور ان کے قلم کو لادینیت کا راتب دیتے ہیں۔ شیر شاہ سوری کے ادبی مقلد توسیع پسندی کو دوستی کہتے ہیں۔

فنی اور جمالیاتی قدروں کی نفیس کے رسیا دانشور بھلے لوگ ہیں کہتے ہیں تشبیہہ کلام کا زیور ہے، استعارہ اس کا پیراہن ہے۔ لفظ نگینے کی طرح جڑا ہونا چاہیئے۔ یعنی تشبیہہ اور استعارہ اگر دوشیزۂ کلام کے بدن سے اتار کر سیف یا کپڑے ٹانگنے والی الماری کی زینت بنا دیئے جائیں تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ لفظ کے معنی کا نہیں بلکہ اس کی نشست و برخاست کا مسئلہ ہے۔ شعر کے لئے وزن بڑا ضروری ہے۔ بحر رمل میں بحر رجز نہ ڈالئے۔ تحریر میں بلاغت ہونی چاہیئے قافیے اور ردیف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لفظ اور خیال کی ہم آہنگی ہو، توازن، اعتدال اور تناسب قائم رہے۔

یہ فنیئے اور جمالیئے معانی کی جہت اور عقیدے کی سماجی افادیت سے گریزاں شاعری اور ادب کی گرامر کے لاینحل مسئلوں کو حل کرنے کے چکروں میں رہتے ہیں کشمیر آزاد ہوا یا نہیں۔ جونا گڑھ ملے نہ ملے، مشرقی پاکستان علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنے یا اسے تسلیم کیا جائے۔ نوآبادیاتی ممالک کے انسانوں پر زندگی کا عرصہ تنگ ہو یا مظلوم اور غریب مسلمان بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں ان کی بلا سے، لفظوں کی نوک پلک درست رہنی چاہیئے۔ فلسطینیوں کا قتل عام ہوتا رہے، یہودی دندناتے رہیں وہ مجاز مرسل کے قواعد کے مطابق شعر لکھیں گے۔ غزل کا مطلب ہے عورتوں سے بات چیت، عورتوں کی آزادی سے ان کا تعلق۔ غزل بڑی نازک صنف ہے وہ عورتوں کے بارے میں بڑی نازک باتیں کریں گے۔ سیاست جہنم میں گئی۔

سیاست ________ کو بے نقاب کرنا ادب کا کام نہیں۔

ادب تو فقط صنعت، مراعات النظیر، لف و نشر، ایہام، تلمیح اور کنایہ وغیرہ وغیرہ کے درست استعمال کا نام ہے، یہ فنیئے اور جمالیئے نہ تو ادب کے منصب کو سمجھ پائے ہیں اور نہ ہی ادیب کے رول کو۔ کہ پاکستان میں ادب اور ادیب کو تو مغربی سامراج کے فنی، ثقافتی، سیاسی اور قانونی نظام کی بیخ کنی کا کٹھن کام کرنا ہے اور نظریۂ پاکستان پر مبنی نئے منصفانہ ریاستی نظام کا سنگ بنیاد رکھنا ہے۔

ہمارے دانشوروں کا ایک اور گروہ داخلیت کو اپنی فکری زندگی کا کل اثاثہ جانتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ادبی تخلیق کا تعلق ذات کے آئیوری ٹاور سے ہے۔ ادیب اور شاعر اپنی ذات کے تاریک اور پرخطر براعظموں کے سیاح ہیں یا وجود کے ان گہرے

سمندروں کے غواص ہیں جن کو خارجی حقائق اور معروضی معاشرے کی ہوا تک نہیں لگی ۔ وجود کے یہ نئے کولمبس اوڈواسکوڈی گاما' یا اٹھیں آبدوزیں ؟ ایسے مابعد الطبیعات کے اصولوں کی ترغیب کرتے ہیں جسے نئے زمانے کے قوم پرست فلسفیوں اور حب الوطن سماجی مفکروں نے تجریدی مابعد الطبیعات کہا ہے ۔ جس کی تشریح یہ ہے کہ ملوکی یا سامراجی فکری دساتیر جس شئے کو مجرد یا ماورائی قرار دیتے ہیں اس کا سراغ لگایا جائے ۔ اور اسے مزید مستحکم کیا جائے ۔ داخلیت پسندوں کا کہنا ہے کہ ادب اس ان دیکھے یا انجانے کی تلاش کا نام ہے جس کا مادی دنیا کے موجود یا امکان سے کوئی تعلق نہیں ۔ لاشعور اور تحت الشعور اور اجتماعی لاشعور کے تجربے ہی حقیقی ادب کا سرچشمہ ہیں ۔ بھنگ' افیون' چرس' شراب' ایل' ایس' ڈی کے نشوں سے ابھرنے والا اختلال' حواس' جنسی بے راہ روی' اور تہذیبی انتشار کا ادب داخلیت پسندوں کے لیے عظیم ہے کیوں شعور اور اس کے مادی روحانی رشتے سے نجات مل جاتی ہے ۔ نئی ادبی نظریہ سازی یہ ثابت کر چکی ہے کہ ادب شعور سے جنم لیتا ہے' شعور میں ترفع پیدا کرتا ہے اور شعور کی تشکیل بھی کرتا ہے ۔ داخلیت پسندوں کا ادب ڈی جنریشن کی عمدہ مثال ہے کہ نہ تو خود ادیب یا شاعر کو شر اور ظلم کی حقیقت کی خبر ہو اور نہ ہی قاری ان مسائل کا عقلی شعور حاصل کر سکے ۔ روم جلتا رہے ۔ نیرو کی بانسری آٹھویں سُر کی تلاش میں گم رہے ۔ آٹھواں سُر جو کہ وہم ہے' سراب ہے' عنقا ہے ۔ داخلیے رہتے تو مادی دنیا میں ہیں لیکن باتیں بے بنیاد خیالی کائناتوں کی کرتے ہیں ۔

اردو ادب میں دو نظریے ایسے ہیں جن کے وسیلے سے ادیب اور قاری کے شعور نے زندگی اور سماج کے ارتقا ر اور مسائل کو کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے' ایک تو حقیقت نگاری رہی ہے اور دوسرا ترقی پسندانہ' جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس نظریے کے پیروکار سماج کی پراگندگی' خباثت اور بدحالی کی تصویر کشی کرتے ہیں جن مسائل اور صورتحال کا جیسے کہ وہ ہیں ویسے ہی مطالعہ سرانجام دیتے ہیں لیکن مسائل اور صورتحال کے ماضی اور مستقبل سے انہیں بحث نہیں ہے یہ نظریہ اس لیے موثر اور آدھی حقیقت کے طور پر قابل قبول ہے کہ حقیقت نگار سماجی اور سیاسی بازیگروں کی پردہ پوشیوں اور پردہ داریوں کو بے پردہ اور بر سر عام کرتے ہیں ۔ وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے ان برائیوں اور بے انصافیوں کے رُخ سے نقاب اُلٹتے ہیں جو سماج میں پرورش پا رہی ہیں یا جن کی ترویج میں سماج دشمن ابلیسوں کا ہاتھ ہے ۔ حقیقت نگاری میں سماجی اور سیاسی بحرانوں کا جو پورٹریٹ تیار کیا جاتا ہے اس سے قاری کے تجربوں کی شدت اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ۔ قدیم عہد میں نظیر اکبر آبادی کی نظمیں' جدید عہد میں سعادت حسن منٹو کے افسانے اس نظریے کی مثالیں ہیں ۔ حقیقت نگاری کا نظریہ چونکہ پاکستانی سماج کی پاکستانی بنیادوں کی بازیافت اور تخلیق سے کوئی غرض نہیں رکھتا اس لئے اس میں بھی سماج کی آدھی حقیقت اُجاگر ہوتی ہے اور یوں قاری کے حسی شعور کو عقلی شعور میں نہیں بدلا جا سکتا کہ پاکستان میں ادب کا ایک منصب بھی ہے کہ وہ قوم کے حسی سطح کے تجربوں کو عقلی اور فکری سطح کے تجربوں میں منتقل کرے ۔

جہاں تک ہمارے ادب کے ترقی پسندانہ نظریے کا تعلق ہے یہ امر اختلافی نہیں ہے کہ اس نظریے نے اردو ادب کو وہ نیا آہنگ دیا جس سے اس کی تاریخ کے اوراق خالی تھے ۔ یعنی ترقی پسندوں نے ادب اور زندگی کا طبقاتی بنیادوں پر مطالعہ کیا ۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک ادب کو طبقات اور طبقات کی سیاست سے مربوط نہ کیا جائے گا صحیح اور حقیقی شعور کی تشکیل ناممکن ہوتی ہے ۔

ترقی پسندوں نے اُردو قارئین کے لیے بہت بڑا ادبی ذخیرہ جمع کیا ہے۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سماج کے بہت سے ناسوروں کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ان کا ادب نظریات کا انسائیکلو پیڈیا ہے یا عقیدہ پرستی کی لغت تو ہو سکتا ہے کہ پاکستانی انسان کے عمل اور عملی مسائل سے کوسوں دور رہا ہے' یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بھی آخر الامر ڈس الوژن منٹ کا نشانہ بنی کہ جب تک تلفظ ثقافت اور عمل کا حصہ نہ بنے لفظ بھی جھوٹا ہوتا ہے اور عمل بھی جھوٹا۔ ترقی پسندوں نے انقلاب کے قاعدے اور گائیڈیں تو لکھی ہیں لیکن وہ پیچیدہ اور بنیادی سیاسی' سماجی' ثقافتی مسائل کا درست بنیادوں پر احاطہ نہ کر سکے اور خصوصاً اس لیے بھی کہ یہ نظریہ پاکستانی سماج کی روایتی روح کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے

۱۹۴۷ء سے آج تک ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر نفی' ادب کا تو اہتمام ہوتا رہا ہے۔ تخلیقِ ادب یا حقیقی پاکستانی ادب کی تخلیق کے اسباب مہیا نہ ہو سکے۔ کمرشل ادیبوں سے ترقی پسندوں تک' لذت پرستوں سے لیکر داخلیت زدوں تک کسی نے بھی ایسا ادب تخلیق نہیں کیا جسے ہم آخری تجزیے میں ذمہ داری کا ادب کہہ سکیں۔ یا جسے ہم ایسا ادب کہہ سکیں جو سماج اور اس کی تبدیلی میں ہراول دستے کا کام کر سکے۔ ایلینا ئیشن اور اور ڈس الوژن منٹ کے حوالے سے پیدا ہونے والے ادبی دبستان' قومی ثقافت اور بین الاقوامیت کے نیکی اور خیر پر مبنی عناصر کو آپس میں مربوط کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں اکثر پاکستانی دانشور صرف یہی سوال اٹھانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایڑیاں مارتے مارتے ہماری ایڑیاں چھل گئی ہیں،

چشمے کہاں ہیں؟

چشمے کہاں ہیں؟ کا جواب تو سر دست میرے پاس یہی ہے کہ پاکستان کے صرف انہی ادیبوں اور شاعروں نے یہ چشمے دریافت کئے ہیں جنہوں نے اپنا رابطہ مسائل سے استوار رکھا ہے۔ یہ وہی ادیب ہیں جن کا مطمع نظر مغربی سامراجی ثقافت کی منہائیت اور پاکستانیت کی تلاش رہا ہے۔ ان کے لیے' قومی بقا' قومی دفاع' حب الوطنی' سماجی انصاف' اور انسانی مساوات کے مسائل زیادہ اہم رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ادب کے ذریعہ قومی فلسفے' قومی علوم اور قومی خودی کی بازیافت کا فرض پورا کرنے کا جتن کیا ہے۔ ہر کٹھن اور خطرناک مرحلے پر عوام کی ثقافتی راہنمائی کا بارِ گراں اٹھایا ہے ــــ ▲▲

عجائب گھر ۳

احمد داؤد

۳۶۱ - اے، موہن پورہ - راولپنڈی

(پاکستان)

"رات کے اس پہر جب چوکیداروں کی آنکھ نیند سے بوجھل ہو گی تو میں شہر کے چار چفیرے جنتی سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر کو چنگاری دکھاؤں گا اور تم ——"

اُس نے شہادت کی اُنگلی پہ مجھے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم اس جلتے شہر کے آخری گواہ ہو گے۔"

اس نے ہاتھ نیچے کیا، انگلی جھکائی تو میں اپنی جگہ پر آ گیا اور اس کی آنکھوں میں بنے شہر کے نقشے کو آگ لگتے دیکھنے لگا۔ عمارتوں کے پتھر پگھل رہے تھے اور بندے شعلوں کی رتھ تلے کچلے جا رہے تھے۔ میں نے سہم کر شعلوں کی لہر سے بچنے کے لیے ایک طرف چھلانگ لگانی چاہی تو اس نے مجھے شانے سے دبوچ لیا۔ اب میرا رُخ ساحل کی طرف تھا جہاں تفریح منانے والوں کا انبوہ اپنی صداؤں کے مستول اُٹھائے دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بنے شاپنگ سینٹرز، ہوٹلز، مسجد اور میدان میں انسان میلی جھاگ کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ انسانوں کی اس جھاگ میں کہیں کہیں اس کا بچہ آنکھوں پہ دوربین چڑھائے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ چند گھڑی سامنے شہر کی فصیل کو گھورتا رہا اور پھر پلٹ کر بولا ——

"ہم یہاں لہروں سے کھیلنے آئے ہیں۔ کنارے کی ریت پہ تو بچے کھیلتے ہیں۔ وہ دیکھو ——" اس نے بازو کھول کر فاصلوں کو سمیٹا۔

"میں اب بھی تمہارے ساتھ ساحل پہ پہنچ آؤں گا۔"

میں نے بازوؤں کے پیالے پہ چلتے ہوئے کہا۔

"کیوں ...؟"

"اس سمندر میں —— اس سازشی جھیل کے اندر تمہاری بیوی اور ماں ڈوب گئی تھیں اور اب ..." میرا گلہ رندھ گیا۔ میں نے گہری سانس لے کر اپنی بات پوری کی —— ... "اور اب ہمارا بچہ کنارے پہ تمہارا منتظر ہے۔ بھلا اتنی دور آنے میں کیا تک ہے ——؟"

وہ مسکرایا اور کہنے لگا —— "میں ان کی تلاش میں ہی تو ہر روز

کو اپنے وجود کی خیرات دینے آتا ہوں۔ مگر اس بے نیازی سے"
اس نے حقارت سے سمندر کو گھورا اور میرے شانے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے
بولا ——

"آؤ واپس چلتے ہیں۔ میرا بیٹا انتظار کر رہا ہے۔ وہ دیکھو
غباروں کے جمگھٹ کے پاس شاید اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

ہم سمندروں کی گونج اپنی پشت پہ لیے ساحل کی طرف بڑھے،
بھیگے کپڑوں سے گرتی پانی کی بوندیں اور نمکین ہوا ہمارے جسم کو
گدگدا رہی تھی۔ ساحل پہ لیٹی عورتیں پہیوں والی کرسیوں پہ بیٹھے
بوڑھے اور اونٹوں پہ سوار جوان دھوپ کے بے انت بادبان تلے بھیڑ بھڑاتے
سمندر کا لطف لے رہے تھے۔ ہمارے قریب سے اونٹوں کی ایک
قطار گزری۔ ان کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سریلی آواز اور چوڑے
پاؤں کے نقش ریتیلی زمین پہ ابھرنے لگے۔ ایک زور کی لہر آئی اور
سارے نقش مٹا کر پلٹ گئی۔ ساحل کے قریب پھیلی دکانوں میں قسم
قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کاغذ کی کشتیاں، گتے کے
جہاز، کھنگروں میں لٹکے آدمی، بھنی سبزیاں، اور پرندے، مگرمچھ کی
کھال کے کوٹ، نئے فیشن کے لباس، ٹوپیاں، کھلونے، آدھے
جسم والی عورتوں کی چھاتیوں پہ سجے ہوئے بریزیئر۔ لوبان اور کافور کی
مرتبان اور ... بند اداروں کے منہ جلے گاہک
شیشوں میں جھانکتے منگروں میں لٹکے مرد انہیں عاجزی سے
اپنی طرف بلاتے، آدھے دھڑ والی عورتیں آنکھ مار کر سینے کا ساز
بجاتیں۔ ... بچے کاغذوں ... اپنے لہو کی خوشبو پا کر توبوں میں
کلبلاتے اور گاہک اپنی اپنی ... کا جہاز لیکر شور مچاتا واپس
ہوتا اور ... میں گم ہو جاتا۔ ہم گمشدہ لوگوں میں راستہ
بناتے ساحل کی طرف آ رہے تھے کہ اس کے بیٹے نے ہمیں دیکھ کر
زور سے پکارا اور پھر ہماری طرف دوڑنے لگا۔ دوڑتے ہوئے اس
کی پشت پہ تنا گیا سنیٹرز، ریسٹوران اور مسجد کا مینار ہچکولے کھا
رہا تھا۔ مینار کی چوٹی پہ بیٹھی چیل نے اپنے پنجوں میں پکڑی ہتھیلی
سے ایک لکیر نوچی اور نیچے سڑک کی جانب اچھال دی۔ سڑک کے
پاس ہم تینوں اکٹھے ہو گئے۔ ہماری پشت پہ پھیلا جلالی سمندر کبھی اتنی
تیزی سے کروٹ بدلتا کہ لہریں سڑک پہ آ جاتیں۔ اور جب ہم تینوں
اوپن ائیر کی طرف جا رہے تھے تو ایک ایسی ہی لہر نے ہمارے قدموں کو
چوما تھا۔ ہجوم نے پاگلوں کی طرح نعرہ لگا کر سمندر کی دہشت کا
منہ چڑایا تھا۔

"ابو —— ابو" اچانک اس کا بیٹا پلٹا اور اپنے لفظوں پہ
زور دیتے ہوئے بولا ——

"ابو میں نے آپ کو اس کشتی میں دیکھا تھا"

"کیسے؟ ——" ہم دونوں نے واپس مڑ کر دور نیلی خلاء
میں گھورا ——

"میں نے دیکھا کہ آپ مجھے پکار رہے ہیں۔ میں نے دوربین
میں آپ کو دیکھا تھا اور آپ کی آواز بھی سنی تھی" —— بچہ گلے میں
لٹکی ہوئی دوربین سے کھیلتے ہوئے بولا۔

ہوا کی خنکی میں ہمارے بدن خوف سے کانپے۔

میں نے لڑکے سے دوربین لیکر آنکھوں سے لگائی۔ دور
جہاں پانی اپنے وقار اور طمانیت کے ساتھ سمندر کی ڈھلوانوں کو سہارا
دیئے ہوئے تھا۔ ایک کشتی تیرتی چلی آ رہی تھی جس کے مسافروں نے
اپنی باہوں کے کشکول پناہ کی تلاش میں زمین کی جانب پھیلائے
ہوئے تھے۔

"آؤ کچھ کھا پی لیا جائے" اس نے میری محویت کا رخ موڑا۔
وہ بچے کو کندھے پہ بٹھائے اوپن ائیر کی طرف بڑھا۔ میں اس کے
قدموں کے نشانوں پہ پاؤں رکھتا اپنے عقب میں کشتی کے مسافروں کی واویلا
سنتا ان کے ساتھ چلتا رہا۔ ہوٹل میں بکھری میزوں کے چہروں پہ آدمیوں کی
... پڑی تھی۔ گاہک ایک نظر میز پہ ڈالتے، گلے میں لٹکی

دوربینوں سے منظر کی دید کرتے، کچھ سوچتے اور پھر آرڈر دیتے۔ اور بے معنی باتوں کے جنگل میں گم ہو جاتے۔

بیرہ ہماری میز پہ برتن لگانے لگا۔ میں نے مسجد کی مینار پہ بیٹھی چیل پہ نظر ڈالی۔ پچھلے کئی زمانے سے شہر کی انتظامیہ اسے یہاں سے اُڑانے کے لیے ہر جتن کر چکی تھی۔ مگر اب تو یوں لگتا تھا جیسے یہ انہوں نے ہی یہاں پتھر کی سِل تراش کر اس میں جان ڈال کر بٹھادی ہو۔ میں اس کی طویل عمری پہ غور کرتا ہوا سمندر کو دیکھنے لگا جہاں شہر شہر مایوسی کے لنگر ڈالنے کے بعد مسافروں کی کشتی اب ہمارے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ابو — ! ہم بھی اس کشتی کی سیر کریں گے"۔ بچے نے کراکری کی ترتیب توڑ کر اونچی آواز میں کہا۔ گاہکوں نے ناپسندیدگی سے اسے گھورا۔

"بہت جلد ہم اس کے مسافر ہوں گے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا اور پھر منہ پہ ہاتھ دھر لیا گویا لفظ واپس انڈیل رہا ہو — میں نے دوربین اپنی گود میں رکھی اور اس پہ اپنے ہاتھ مضبوطی سے جماتے ہوئے کہا —

"ہمارا مستقبل بچے پہ بے نقاب ہو رہا ہے"۔

"کیا کروں — بے بس ہوں" وہ سامنے بیٹھے بوڑھے کو دیکھ کر بولا — "جو بات بچوں سے چھپاتے ہیں، وہ اسی کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں"۔

ہم نے دُکھ سے سر ہلایا اور کھانے کی خوشبو میں ڈوب گئے۔

سامنے بیٹھے بوڑھے نے اپنی ہتھیلی میز پہ دھری اور اس کی ریکھاؤں میں اُتر گیا۔ اس کے قریب کی میز پہ بیٹھا جوڑا آلکسی سے دیواروں کو گھور رہا تھا۔ عورت اپنی گود میں بیٹھی بلّی کی پشت سہلا رہی تھی اور مرد کا ہاتھ پتلون کی جیب میں اُترا کسی شے کو ٹٹول رہا تھا۔

بوڑھے نے پلکیں جھپکا کر ریکھائیں گنیں اور خوفزدہ ہو کر بھینچنے لگا۔

...... مینار پہ بیٹھی چیل نے اپنے پنجوں میں پکڑی ہتھیلی سے عمر کی ریکھائیں نوچیں اور نیچے پھینک دیں۔ بوڑھے کے لبوں سے کراہ نکلی اس کا سر چھاتی پہ ڈھلک گیا۔ ہوٹل کے ملازم آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ چیل کے پنجے میں ایک نئی ہتھیلی جھول رہی تھی۔

اوپن ایئر ہوٹل کے سامنے سڑک پر اور دکانوں کی قطاروں کے سامنے روشنی ہو رہی تھی۔ لوگ غروب کا منظر دیکھنے آ رہے تھے۔ ہمارے سروں پہ پھیلی دھوپ کے بادبان سورج کے سفر کے ساتھ ساتھ لمبے ہو رہے تھے۔ لوگ کاروں، بگھیوں، مشکی گھوڑوں پہ سوار، سائیکلوں کی تنگ گدیوں پہ سمٹے، لوگ لوگوں کے کندھوں پہ بیٹھے ہوئے ساحل کی طرف آ رہے تھے۔ کبھی کوئی گاڑی زور سے ہارن بجا کر گزرتی تو اوپن ایئر کے گاہک منہ بنا کر اسے گھورتے اور پھر کسی بگھی میں بیٹھی عورت کو دیکھ کر بگھی کی قدامت کے ساتھ عورت کی عمر کی نسبت پہ بحث کرنے لگ پڑتے۔ بھکاریوں کی ٹولیاں امیر سیاحوں کو دیکھ کر بھنوروں کی طرح بھنبھاتی ان کا تعاقب کرتیں۔ اپنے جیبوں سے قصیدوں کے ٹیپ نکال کر بجاتیں اور سکّے کی کھنک میں لمبی عمر کی دُعا دے کر نئے گاہک کا رُخ کرتیں۔ کبھی کوئی مضبوط باہوں — سیاہ بالوں میں لپٹی چوڑی چھاتی والا کوچوان بگھی کے گھوڑوں کو چابک سے چھیڑتا ہمارے سامنے سے گزرتا تو ہوٹل کے ملازم بگھی میں بیٹھی عورت کو تعظیم سے جھک کر بلاتے، کوچوان حقارت سے انہیں دیکھتا اور بگھی لہروں کے پاس جا کر روک دیتا۔ عورت پائیدان پہ رکھے ریشمی قالین کے ٹکڑے پہ پاؤں ٹکاتی اور کسی اونٹ کی پشت پہ سوار ہو کر اپنا فاصلہ آسمان کے قریب کر لیتی۔

"میں اس منظر کا گواہ ہوں اور جب شہر جل جائے گا تو مجھے شہادت دینی ہو گی"۔

"بالکل — یقیناً"۔ اُس نے میرے خیالوں کا ورق پڑھتے ہوئے تائید میں سر ہلایا اور بیرے کو آئس کریم لانے کو کہا۔

لڑکے نے میز تلے سے ہاتھ بڑھا کر میری گود میں رکھی دوربین

پیچھے سے اٹھائی اور آنکھوں سے لگا کر پرجوش مسکراہٹ سے بولا۔

"ابو — بڑی بڑی مچھلیاں" — اور وہی کشتی، اس میں آپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

اس نے جلدی سے دوربین چھین لی اور پیار سے بولا۔

"اس کے شیشے خراب ہیں۔ تم آئس کریم کھاؤ —

اور — اور" وہ بات بنانے کی کوشش میں سٹپٹا گیا۔

سامنے بیٹھے جوڑے نے پلٹ کر ہمیں دیکھا اور پھر شو کیسوں میں لٹکے ہنگریوں، بوتلوں میں بند لاوارث بچوں، کافور کی مہک اور تابوتوں کی چمک میں کھو گئے۔ عورت نے اپنی گود میں رکھی بلی کو سینے سے چمٹا لیا۔ گریبان کے بٹن کھولے اور اپنی چھاتی بلی کے منہ میں دے دی۔ مرد نے کاہلی سے پہلو بدلا۔ اور جیب سے ہاتھ نکال کر انگوٹھا چوسنے لگا۔ روڈ کے کسی موڑ سے بینڈ کی آواز آ رہی تھی۔ کلارنٹ شہنائی — اور ڈرم۔ تینوں ساز اپنی سروں کا سفر تیزی سے طے کرتے ہماری طرف آ رہے تھے۔ بچے نے بینڈ کی آواز سن کر متجسس آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگا۔ ہم دونوں نے آنکھیں چار کیں اور سڑک پہ دیکھنے لگے جہاں ہجوم پہاڑی بادل کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بینڈ بجانے والوں کی ٹولی کے درمیان چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہجوم کی قیادت کرتے ساحل کی طرف آ رہے تھے۔ جنازے کے پلنگ کے چاروں طرف مرنے والے کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ اونچی دھنوں کے ساتھ ہجوم قہقہے لگاتا ایک دوسرے کو گدگداتا آگے بڑھ رہا تھا۔

"ابو — ابو — یہ تو ...." لڑکے نے میت کے چاروں طرف لٹکی تصویروں میں ایک تصویر دیکھی اور حیرت سے چلایا۔

"یہ تو ہمارے چیف سکاؤٹ ہیں — کیا ہوا انہیں؟"

"مر گئے — خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔"

بچے نے تھوک نگلتے ہوئے۔ ایک بار اور کہا —

"انہوں نے مجھے میڈل دیا تھا جب میں سکول میں تھا مجھے یاد ہے۔"

"نہیں کوئی اور ہوگا" — وہ بولا۔

"اچھا" — بچے نے لمحہ بھر کو کچھ سوچتے ہوئے کہا —

"وہ بھی اسی طرح کا تھا"

ادبی ایئر کے گاہکوں میں کسی نے سالن کی پلیٹ جنازے کی طرف اچھالی۔ ہجوم نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ بینڈ کی دھنوں میں پھرتی آ گئی۔ مینار پہ بیٹھی چیل نے اپنے پر پھیلائے اور دھوپ کا راستہ کاٹا۔ کسی نے جوتا فضا میں اچھالا۔ جو مرد کے بستر پہ جا گرا۔ کہیں سے انڈوں کی بوچھاڑ آئی اور جنازے کی سفید چادر زرد ہو گئی۔ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے ہجوم نے ہاتھ ہلائے تو پکنک مناتا ہجوم ان کے گرد اکٹھا ہونے لگا۔ ایک عورت نے اپنی برزیئر اتار کر گوپھن بنائی اور پتھر جنازے کی طرف پھینکے۔ ایک پتھر بینڈ کے ڈرم سے ٹکرایا۔ عجیب آواز نکلی —

"عجیب لوگ ہیں ابو" — بچے نے پریشان سا ہو کر کہا۔

"بادشاہ مر جائے تو لوگ خوشی کا اظہار اسی طرح کے عجیب طریقے سے کرتے ہیں۔"

"اب ہمیں میڈل کون دے گا؟" بچے نے پوچھا — "اور وہ چیف سکاؤٹ۔"

وہ ہلکے سے مسکرایا اور بچے کے شانے تھپتھپا کر بولا۔

"ایک ہی رات کی بات ہے۔ صبح جو آدمی سب سے پہلے شہر میں داخل ہوگا لوگ اسے بادشاہ بنا لیں گے۔"

"اچھا ابو" — بچے نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں —

"تبھی سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"ہاں — لیکن اس دفعہ شاید ایسا نہ ہو۔" اس نے بچے کو نظر انداز کر کے میری طرف رخ کیا اور سرگوشیوں میں بولا —

"میں صبح ہونے سے پہلے کسی نیک لمحے میں شہر کو آگ لگاؤں گا اور تم اس کے گواہ رہنا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ کہیں سے ایک آنسو میری پلکوں پہ طلوع ہوا۔

جنازہ پانی کے اندر چلا گیا تھا۔ مچھلیوں نے لہروں کی شکنیں چیر کر سر باہر نکالے اور اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے آنے والے مہمان کو سلامی دی۔ مینار پہ بیٹھی چیل نے ہتھیلی سے کئی لکیریں نوچ کر نیچے پھینکیں۔ سامنے سمندر کے متحرک ماتھے پہ تیرتی مہاجروں کی کشتی ساحل کے پاس آ لگی تھی۔ مسافر ہاتھ ہلا ہلا کر جنازے کے ساتھ آئے ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ وہ اپنی پسلیوں پہ تنے چمڑے کو ڈھول کی طرح پیٹتے۔ بچوں کے کملائے چہروں کو سورج کے چمکتے تھال میں رکھ کر لوگوں کی طرف بڑھاتے۔ لوگ حقارت سے انہیں دیکھتے۔ بینڈ بجانے والی ٹولی نے اس دخل اندازی کے خلاف ماتمی دھنیں بجائیں۔ اور اپنے ساز غصے میں کشتی کے مسافروں کی طرف دے مارے۔ منچلے نوجوانوں نے ریت کے گولے اور تھوک ان پر پھینکی۔ ایک عورت نے دودھ کی بوتل خالی کی اور پھر اس میں نمکین پانی بھر کر کشتی میں بیٹھے بچوں کی طرف اچھالا۔ قہقہے بلبلوں کی طرح اٹھے اور مسافروں کی فریاد پہ جھاگ بناتے چاروں اور پھیل گئے۔

ایک زور کی لہر آئی اور توازن بگڑ گیا۔ مسافروں نے ڈوبتے سورج کی کرنوں سے چمٹ کر ایک مرتبہ پھر پکار کی۔

بچے نے چپکے سے دوربین آنکھوں سے لگالی۔

غروب کا منظر شروع ہو چکا تھا۔ ساحل پہ آئے لوگوں نے اشتیاق اور مسرت کے انتہائی جذبوں کے ساتھ سمندر میں گم ہوتے آفتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ رات سرمئی لہروں کے ساتھ نازل ہو رہی تھی۔ قہقہے۔ سیٹیاں۔ تالیاں۔ شور۔ چیل پنجوں میں دبوچی ہتھیلی سے ریکھائیں چن چن کر پھینک رہی تھی۔

"ابو! — ابو! — کشتی ڈوب رہی ہے اس میں آپ بھی"

میں نے لپک کر بچے سے دوربین چھینی اور اس کی طرف مڑا۔

وہ اٹھا اور تیزی سے سمندر کی طرف بھاگا۔

"سنو — میری بات سنو" — میں نے پکارا۔

لہروں نے میری صدا کو پلٹ کر مجھ پر دے مارا۔

"سنو — خدا کے لیے سنو، میری بات سنو!"

میں اس کے تعاقب میں لپکا۔ کمر تک آتی پانی کی لہر نے مجھے جھٹکا دیا۔ سامنے کشتی کے مسافروں کے اوپر نیچے ہوتے سر ہلتے ہاتھ سورج کے ساتھ ساتھ سمندر میں سیڑھی سیڑھی اتر رہے تھے۔

غروب آفتاب کا منظر لوگوں کو پاگل بنا رہا تھا۔

قہقہے۔ تالیاں۔ شور۔ سیٹیاں۔ کاغذ کی کشتیاں۔ گتے کے جہاز۔ ہینگروں میں لٹکے لوگ۔ بوتلوں میں بند بچے۔ کافور کی شیشیاں۔ تابوت کھلونے۔ ٹافیاں۔ پتہ نہیں کیا کیا۔

سمندر نے اچانک اپنے حلق سے ساحل کی طرف پھینکا۔

"سنو، میری بات سنو" — میں نے فریاد کی۔

اس نے جواب دیے بغیر باہیں پھیلائیں۔ سمندر کی غلاظت کو شہر کے دامن میں گرنے سے روکنا چاہا مگر لہروں کے طشت پہ ناچتی رات نے اسے کشتی کا مسافر بنا دیا ▲▲

ایک ضروری اعلان

ہم زبان کے لیے عصری ادب اور مسائل پر مضامین بھیجئے۔ تعارف، انٹرویو، سوانحی خاکے، اور شخصی مطالعے شائع ہو سکیں گے — (ادارہ)

شکایت

ہرچرن چاولہ

کرنگسبا - اوسلو - ناروے

دیوار نیچے سے اوپر کی طرف اٹھائی جاتی ہے پھر اٹھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اگر اٹھانے والے کے ہاتھوں میں فن ہے اور ذہن میں سیدھاپن ہے - دیواریں اپنے کندھوں پر تاج محل اٹھاتی ہیں - بنانے والے کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر بہت اونچا کر دیتی ہیں۔
ان ہی دیواروں کے میناروں پر چڑھ کر کوئی خدا کا نیک بندہ اذان دیتا ہے اور محمود و ایاز کو اس کے حضور حاضری دینے کو بلاتا ہے۔ یہی دیواریں مندروں کے کلسوں کا سر اونچا کر کے بنانے والے اور بنانے والے کے بنانے والے کی عظمت کے گن گاتی ہیں۔

دیواریں میری پناہ گاہیں ہیں۔ یہ مجھے سردی، گرمی، بارش، طوفانوں اور خطرناک دشمنوں سے بچاتی ہیں۔ ان ہی کی اوٹ سے کبھی کبھی معصوم اور بے گناہ لوگوں کے سینے بھی میں نے چھلنی کئے ہیں۔ ان ہی اینٹ اور گارے کے چند مجموعوں سے میں نے بھائی کو بھائی سے اور خون کو خون سے جدا کیا ہے۔ کبھی کبھی اونچائیوں کی طرف خود کو بڑھنے سے معذور پا کر میں نے ان اونچائیوں سے نیچے گر کر خودکشیاں بھی کی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں خودکشیاں بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں۔
میں بہت بڑا ہوں، بہت عظیم ہوں۔ دنیا جانتی اور مانتی ہے۔ شہر والوں نے میرے بڑے بڑے بت بنا کر شہر کے چوراہوں پر ایستادہ کئے ہیں مگر میں نے لفظوں کی اینٹیں اوپر سے نیچے کی طرف جوڑی ہیں اسلئے خود کو کبھی کبھی بہت بونا محسوس کرتا ہوں اگر میں لفظوں کو نیچے سے اوپر کی طرف چن چن کر دیواریں بناتا۔ ذہن میں سیدھاپن رکھتا کیونکہ دیواروں کی مضبوطی اور دیرپائی کے لئے سیدھاپن پہلا سبق ہے تو میں ان پر کھڑا ہو کر اور بھی عظیم ہو سکتا تھا تب میرے اندر کے بونے پن کا احساس بھی اپنی موت آپ مر جاتا ——— راج معمار کے ہاتھ ساہول آتے ہی سیدھاپن آجاتا ہے تو قلم میرے ہاتھ میں آکر کیوں سیدھا نہیں چلتا۔ شکایت میں کس سے کروں۔ بے جان قلم سے۔ یا رواں دواں ندی کی طرح بہتے رگ کے اس خون سے جو میرے ذہن کے منبع سے نکلتا اور ہاتھ کے دہانے سے گر کر قرطاس کے سمندر میں

غرق ہو جاتا ہے ۔

آہ! ہرجن چاولہ

کر مٹھر ہے ۔ اس کی موت پر افسوس کیا جا سکتا ہے تو اس کے دوسرے جنم پر خوشی کیوں نہیں منائی جا سکتی ۔ اس کے دوسرے جنم کی کہانی کچھ اس طرح ہے ——

اتوار ۲۶ مارچ سنہ ۸۹ء شام، ادبی سنگم میں اس نے اپنا افسانہ "شکایت" پڑھا ہے اور خوب داد سمیٹی ہے ۔ ایک دوست سے ملنے کے بعد رات ساڑھے نو بجے وہ اپنی کار پر گھر لوٹ رہا ہے ۔ سمیتا اور اُلے وال کے درمیان رِنگ روڈ پر، وہاں جہاں اوپر ریل کا پل ہے اور نیچے سڑک، وہ تھوڑا سا دائیں طرف مڑتا ہے تاکہ آگے ملنے والے چوک سے بائیں جانب اپنے گھر کی گلیوں کی طرف مڑ لے سکے ۔ آج سارا دن برف باری ہوتی رہی ہے ۔ ذرا سا پیر پھسلتا ہے اور کار اُس کے کنٹرول سے باہر ہو کر دائیں طرف مڑتی ہے اور پل کی دیوار کے ساتھ بنے جمی ہوئی برف کے پہاڑ پر اُس کا اگلا پہیہ چڑھ کر دیوار پر چڑھ جاتا ہے ۔ کار پلٹا کھاتی ہے اور چھت کے بل آ پڑتی ہے جیسے شیرش آسن کر رہی ہو ۔ چھت زمین پر، چاروں پہیے آسمان کی طرف ۔ فرمائی گیاں ۔ بیچ میں سیٹ بیلٹ سے بندھا الٹا لٹکا ہوا ہرجن چاولہ ۔

دو منٹ بعد وہ خود کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کر کے اور دروازہ کھول کر باہر آ جاتا ہے ۔ چند کاریں آگے رُکی ہوئی ہیں اور تقریباً اتنی ہی پیچھے ۔ کچھ لوگ دوڑ کر اس کے قریب پہنچتے ہیں ۔ ایک نارویجین حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر پوچھتا ہے

"چوٹ تو نہیں آئی ؟"

"نہیں ۔"

"گھبراہٹ تو نہیں ہے" —— دوسرا سوال کرتا ہے ۔

"نہیں ——"

ہرجن چاولہ الٹی پڑی ہوئی کار میں گھس کر انجن بند کرتا ہے ۔ لائٹس آف کرتا ہے ۔ سب حیران پریشان اُس کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ۔ ایک آدمی ٹوٹی ہوئی کار اور پھر اُس کی طرف دیکھتا ہوا کہہ رہا ہے ——

"کبھی ہتھوڑی سے بادام توڑو تو چھلکا چکنا چور ہو جاتا ہے مگر گری بالکل صحیح سلامت نکل کر دور جا پڑتی ہے ۔ خدا کی قدرت ہے!"

اُن میں سے ایک ایک ٹیکسی کو روک کر اُس کے اندر لگے فون سے پولیس کو اطلاع کرتا ہے ۔ پھر چاولہ سے پوچھتا ہے ۔

"میں آپ کے لئے رکوں؟ ویسے آپ کے لئے آگے اور پیچھے والی کار والے تو رکیں گے ہی ۔"

"تو ٹھیک ہے —— شکریہ ؟"

دس منٹ بعد دو پولیس آفیسر اپنی گرین سٹیشن ویگن میں آ جاتے ہیں ۔ بڑے پیار، خلوص اور حلیمی سے ایک پوچھتا ہے ۔

"آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی ۔ گھبراہٹ تو نہیں ؟"

"نہیں —— سب ٹھیک ہے ۔"

"اور سب بھی ٹھیک ہیں ؟" آس پاس کھڑے لوگوں سے وہ پوچھتا ہے ۔ پھر ہرجن چاولہ کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے ۔

"فکر مت کیجیے ۔ کچھ نہیں ہوا!"

دوسرا آفیسر اپنی ویگن سے ایسے مواقع پر مدد کرنے والے ادارے فالکن کو فون کرتا ہے ۔ کچھ دیر بعد وہ ہرجن چاولہ سے فالکن کا ممبر شپ کارڈ، ویگن کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس لے کر پھر اپنی ویگن کی طرف چلا جاتا ہے ۔ دوسرا آفیسر پاس کھڑا اپنی باتوں سے ہرجن چاولہ کا دل بہلاتا رہتا ہے ۔

"آپ کا بیگ بڑا خوبصورت ہے جیسے کسی ادیب کا ہو"۔
"شکر ہے کہ ہم پُل کے نیچے کھڑے ہیں اور بھیگ نہیں رہے ہیں"۔

"فالکن کو ہم نے پولیس وین سے فون کیا ہے اس لئے وہ بہت جلد آجائیں گے"۔

"آپ کی انشورنس اگر کامپری ہنسو ہے تو کار کی مرمت پر آپ کا کچھ بھی خرچ نہیں ہوگا"۔

تھوڑی دیر بعد فالکن والے آجاتے ہیں۔ ایک طرف وہ ایک ٹائر رکھ کر دونوں پولیس آفیسر اور دو فالکن والے کار کو پلٹ کر اس کے پہیوں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ کار کے اگلے پہیئے ان کی ویگن کے پیچھے کرین پر باندھ دیئے جاتے ہیں۔ پولیس آفیسر ہرجن چاولہ سے ہاتھ ملاتا ہوا کہہ رہا ہے۔ "بیلٹ نے آپ کو بچا لیا ہے۔ اپنے دوستوں کو بھی کہئیے گا کہ بیلٹ ضرور باندھا کریں"۔

پندرہ منٹ بعد فالکن والے کار اور کار مالک کو اس کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔

گھر آکر ہرجن چاولہ وہسکی کا ایک پیگ پیتے ہیں۔ بیوی اُن کے چہرے پر خوشی تاڑ لیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کئی مہینوں سے شیرس آسن کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آج سے پھر شروع کر رہا ہوں۔ بھگوان کی یہی خواہش ہے کہ میں یہ آسن کرتا رہوں اور اپنی عمر بڑھاتا رہوں ـــــ پھر وہ اپنی بیوی، لڑکے چندر شیکھر اور لڑکی بیٹو کو ساری کہانی سناتے ہیں۔ نیچے جاکر کوئی بھی کار دیکھنے کی خواہش نہیں کرتا ـــ گری سلامت نکل آئے تو بادام کے چھلکے کی ٹوٹ پھوٹ کی کون پروا کرتا ہے۔

سُلطان صاحب!
اُسی کل والے پُرانے ہرجن چاولہ کی نئی کہانی "شکایت" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے اگلے پرچے کی بس پکڑ ہی لوں گا۔ اوپر والا تمام واقعہ بھی ہو بہو اسی طرح چھاپ دیجئے یہ بھی ایک افسانہ ہی تو ہے اور ادھر کا ایک رُخ اور رویہ بھی پیش کرتا ہے۔

مخلص ـــــ ہرجن چاولہ ▲▲

فضا ابن فیضی

مئوناتھ، بھنجن (یوپی)

تو ہے معنی، پردۂ الفاظ سے باہر تو آ
ایسے پس منظر میں کیا رہنا سرِ منظر تو آ

آج کے سارے حقائق واہموں کی زد میں ہیں
ڈھالنا ہے تجھ کو خوابوں سے کوئی پیکر تو آ

تو بھی اِک عکس لیکن یہ حصارِ آئینہ
لوگ تجھ کو دیکھنا چاہیں، برونِ در تو آ

توڑنا ہے عصرِ حاضر کا تجھے افسوں تو اُٹھ
پھینکنا ہے بند پانی میں کوئی پتھر تو آ

ذائقہ زخموں کا یوں کیسے سمجھ میں آئے گا
اس کے ہاتھوں میں کماں ہے تیر کی زد پر تو آ

عکس ہیں اچھے بُرے چہروں کے سارے خلط ملط
اپنے آئینے میں لے کر کچھ نئے جوہر تو آ

چاندنی کا شہد ٹپکے ہے قلم سے بُوند بُوند
کھولتا ہوں رات کو اشعار کے دفتر تو آ

اس جگہ آہنگ میں ڈھلتی ہیں دل کی دھڑکنیں
آ مرے گہوارۂ احساس کے اندر تو آ

دیکھ! اس کی آنچ سے پگھلے ہے کیا کیا کائنات
جب سلگ اُٹھیں مری آواز کے تیور، تو آ

جسمِ خاکی، تجھ کو شیشے کی حویلی ہی سہی
اے چراغِ جاں! کبھی فانوس کے باہر تو آ

بارہا جی میں یہ آئی، عمرِ رفتہ سے کہوں
شام ہونے کو ہے اے بھولے مسافر گھر تو آ

ہے بحث کا جو مرکزی نقطہ، نکال دے
اچھا تو بیچ سے یہی فقرا نکال دے

اپنے تمام خواب کہیں دور پھینک آ
تصویر میں جو رنگ ہے گہرا نکال دے

بے سمتیوں کی دھند ہے گہری، سفر دراز
اب تو ہی ڈھونڈ کر کوئی رستا نکال دے

چہروں کو دیکھ کر کے خط و خال سے الگ
جو زنگ آئینے میں ہے سارا نکال دے

آشوبِ آگہی کا سفر سامنے ہے اب
تلووں سے احتیاط کا کانٹا نکال دے

وہ بھی سنے گا غور سے پھر تیری گفتگو
تو درمیاں سے حرفِ تقاضا نکال دے

رکھتا ہوں لب پہ یوں سخنِ معتبر بہت
چُپ ہوں کہ تو نہ پھر کوئی نکتہ نکال دے

تھے جو ادا شناس، گئے دور دیس وہ
کنکریٹ، جیب کا ہیرا نکال دے

بس خنجروں کی بھیڑ میں سر کو بچائے رکھ
لیکن جو تیرے سر میں ہے سودا، نکال دے

پڑھتے رہو ہمیں، کہ ہمارا مطالعہ
شاید غبارِ دیدۂ بینا نکال دے

کیوں لکھوے کوئی ایسی کہانی فضاؔ کے گرد
اپنی کتاب سے یہ حوالا نکال دے

غلام حسین ساجد

۳۰۔ ایف، عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن۔ لاہور (پاکستان)

طائرِ عشق کے پر بھی کھولیں
کاش ہم خواب کے در بھی کھولیں

کر چکے ربط کی تشہیر بہت
اب کبھی اپنے ہنر بھی کھولیں

اب کبھی خود سے تعارف بھی کریں
ہو سکے تو یہ مگر بھی کھولیں

جن درختوں کو لہو سے سینچا
کاش وہ دستِ ثمر بھی کھولیں

اِس اُداسی میں اضافہ ہوگا
ہم اگر وجہِ سفر بھی کھولیں

جو دریچوں کو کھلا چھوڑ گئیں
وہ ہوائیں کبھی در بھی کھولیں

رازِ ساجد جو کبھی کھولے تھے
اب اُنہیں بارِ دگر بھی کھولیں

رہیں جو منتظر تو کیوں بہار کے
بندھے نہیں کسی کے اختیار کے

یہ تو نہیں تو کس لئے پلٹ پڑے
ہم اُس گلی میں زندگی گذار کے

کہیں وہ میرے آس پاس ہی نہ ہو
میں دیکھ ہی نہ لوں اُسے پکار کے

ہیں کچھ ہرے شجر مری نگاہ میں
مگر وہ پیڑ ہیں ندی کے پار کے

رکیں کہ آسمان ہے دُھلا ہوا
چلے چلیں گے پھر تھکن اُتار کے

کُھلے ہوئے ہیں آنسوؤں میں آئینے
یہ نقش ہیں اُسی مرصّع کار کے

یقیں نہیں کہ سانس لے رہا ہوں میں
عجیب رنگ ہیں مرے خمار کے

نہیں ہے وہ ہماری دسترس میں
مگر اصرار کب ہے پیش و پس میں

مکرّر زندگی بخشی گئی کیوں ؟
میں شامل تھا اگر مرگِ نفس میں

کھلیں آنکھیں تو سونے کی طرح تھیں
یہ کیسا زہر تھا، ہونٹوں کے مَس میں

اُسے اب یاد بھی کرنا پڑے گا
جسے بھولا نہیں اتنے برس میں

یہ کیوں بڑھتے ہی پتھر ہو گئے ہیں
چلے تھے کس ارادے کی ہوس میں

مناسب ہے تماشا ہی کریں ہم
نہیں اِس وقت وہ اپنے بھی بس میں

یہیں سے چاندنی چھٹکے گی ساجد
کھلیں گے پھول بھی اس خار و خس میں

مختار شمیم

گورنمنٹ نیو گرلز کالج (قلعہ میدان) اندور

خیالِ وحشتِ دل آئے ساز گار مجھے
پکارِ دشتِ تمنا ہے پھر پکار مجھے

ہر ایک تیغ بہ انداز منصف و حاکم
ہر ایک کہہ تو رہا ہے گناہ گار مجھے

میں ایک نقطۂ بے فیض و بے سبب کیا تھا
جو لفظ لفظ پہ ہوتا نہ اختیار مجھے

وہ نکتہ چیں ہے مگر میرا معترف بھی ہے
تراشتا ہے تو کہتا ہے شاہکار مجھے

مری اُڑان نئے آسمان مانگے ہے
نئی زمینوں پہ اے فکر و فن اُتار مجھے

بدن سے جیسے مری روح کھینچے جاتا ہے
شمیم کون چلا کر کے سوگوار مجھے

بڑا حوصلہ نوجوانوں میں تھا
مقدر مگر کارخانوں میں تھا

بسیرا تو کچے مکانوں میں تھا
وہ رہتا مگر آسمانوں میں تھا

لہو کی تڑپ آسمانوں میں تھی
مزا زندگی کا اُڑانوں میں تھا

مری بات کیوں قتل گاہوں میں ہے؟
مرا ذِکر تو مہربانوں میں تھا

اِسی ایک احساس میں لٹ گیا
کہ وہ شخص بھی پاسبانوں میں تھا

سفینہ تھا موجِ بلا آشنا
ہواؤں کا رُخ بادبانوں میں تھا

قیصر شمیم

معرفت بک لینڈ، شب پوٹرام ڈپو۔ ہوڑہ (مغربی بنگال)

ایک سمندر سے نکلے ہم ایک سمندر میں ڈوبے
دن بھر باہر تیر رہے تھے، شام ہوئی گھر میں ڈوبے

شہر سے گھبرا کر بھاگے تو ایک کھنڈر میں ٹھہرے ہم
کون سے منظر سے اُبھرے تھے کون سے منظر میں ڈوبے

جادوگر کی چیز بنا کر چھوڑا سنگ تراشوں نے
پانی سے تو بچ نکلے ہم لیکن پتھر میں ڈوبے

کوئی جھلک ملتی تھی شاید اپنے شکستہ ڈھانچے کی
جو پیکر بھی سامنے آیا ہم اس پیکر میں ڈوبے

کیسے لمحوں کی آوازیں چاروں جانب گونج اُٹھیں
ہم مُردے اُٹھنے سے پہلے شورِ محشر میں ڈوبے

گھٹتی بڑھتی موجوں ہی کے رحم و کرم پر سب کچھ تھا
کتنی بار نہ جانے قیصرؔ ہم تو دن بھر میں ڈوبے

شاہین بدر

۱۰۔ کنائی سل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

ہر طرف نیلا دھواں پھیلا گئی نیلی ہوا
شہرِ دل کو کر گئی ویران زہریلی ہوا

رات بھر سلگا کیا یادوں کے آتش دان میں
میرے کمرے میں چلی آئی تھی برفیلی ہوا

شاخِ دل کے سارے پتے اشک بن کر گر پڑے
چل رہی ہے موسمِ خوش رنگ میں پیلی ہوا

کانپ اُٹھا کرب کے شعلے سے شبنم کا وجود
تشنہ لب گل کے دہن کو چھو گئی گیلی ہوا

جھک گئی ہیں شبنمی آنکھیں حیا کے بوجھ سے
دے گئی رنگِ ادا پھولوں کو شرمیلی ہوا

جو بھی چہرے ہیں، کھلے مکتوب ہیں شاہینؔ بدر
پڑھ رہی ہے ایک اک تحریر پتھریلی ہوا

ظفر کلیم

مومن پورہ ۔ ناگپور ۔ ۱۸

دشمن کو امان دے رہا ہوں
خطروں میں جان دے رہا ہوں

ہوں مدعیٔ سزائے قاتل
میں اپنا بیان دے رہا ہوں

آواز سنے گا کون میری
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

اگلے پل کی خبر نہیں ہے
صدیوں پہ دھیان دے رہا ہوں

قرضوں سے کٹ رہی ہیں سانسیں
قسطوں میں جان دے رہا ہوں

تخلیق کا ہے اُمنگ مجھ کو
لفظوں کو زبان دے رہا ہوں

ایک اچھائی کے سوا کیا ہے
مجھ میں سچائی کے سوا کیا ہے

موت سچائیوں کا پربت ہے
زندگی رائی کے سوا کیا ہے

منزلوں کی تلاش کا حاصل
آبلہ پائی کے سوا کیا ہے

دل پہ ناکامیوں کا پتھر بھی
اپنی رسوائی کے سوا کیا ہے

شہر بھی تو نہیں ہے تیرے بغیر
دشت تنہائی کے سوا کیا ہے

ذوقِ تشہیرِ شعر و فن بھی ظفر
بزم آرائی کے سوا کیا ہے

دین محمد درد

پریس رپورٹر: احاطہ بدیاں۔ پی او بی ۹۔ ساہیوال (پاکستان)

جھونکا ہوا کا جو کبھی پروائیوں میں تھا
بدلی جو رُت تو دشت کی پہنائیوں میں تھا

تو سامنے سے گذرا تو پھر سے یاد آگیا
وہ زخم جو کہ روح کی گہرائیوں میں تھا

میرا رفیق تھا کہ عدو، اس ہجوم میں
جو بھی تھا محوِ دیدۂ تماشائیوں میں تھا

وہ روبرو تھا پھر بھی نگاہیں نہ مل سکیں
جلوہ کچھ ایسا حسن کی رعنائیوں میں تھا

کرتا ہے اب شعور کی باتیں ہر ایک سے
وہ شخص جو کبھی ترے سودائیوں میں تھا

احباب کے خلوص میں وہ بات اب کہاں،
جو لطفِ زندگی کبھی تنہائیوں میں تھا

اہلِ نشاط سمجھیں نہ سمجھتے دلوں کی بات
اے درد کتنا درد ان شہنائیوں میں تھا

فرازِ غم سے کسی نے تجھے پکارا نہیں
"تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں"
وہ میری ذات پہ اک عرصۂ قیامت تھا
تمہارے قرب میں لمحہ بھی گذارا نہیں
نگاہ بس میں ہے اپنے نہ اختیار میں دل
کسی بھی چیز پہ اپنا تو اب اجارہ نہیں
جو میرے دردِ مسلسل کا کچھ علاج کرے
اب اس طبیب سے کہہ دو مجھے گوارا نہیں
تمہارے ساتھ جسے کچھ نہ کچھ تو نسبت ہو
مرے نصیب میں ایسا کوئی ستارہ نہیں
لہو لہو کریں دل اپنا، جاں گنوائیں اگر
بساطِ عشق میں پھر کوئی بھی خسارہ نہیں
صلیبِ وقت پہ لٹکے ہوئے زمانہ ہوا
کسی بھی لمحۂ پرشوق نے اُتارا نہیں
نہ جانے کب سے میں بیٹھا ہوں گوش بر آواز
ابھی کسی نے کسی سمت سے پکارا نہیں
وہی سرابِ تمنا، وہی طلسمِ خیال
وہ سیلِ درد ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

حفیظ مالیگانوی

۸۳۹ - نیا پورہ' مالیگاؤں (ناسک)

دوسروں کے خون میں جب بھی نہا لیتے ہیں لوگ
جشن اپنی بربریت کا منا لیتے ہیں لوگ

ہو کوئی بھی شہر لیکن تختۂ مشقِ ستم
کیا قیامت ہے' علی گڑھ سا بنا لیتے ہیں لوگ

اس تکلف سے کہ پتھر دل کوئی نہ کہہ سکے
آئینوں سے اپنے چہروں کو سجا لیتے ہیں لوگ

شاہ راہِ زندگی میں دیکھ کر تاریکیاں
دوسروں کے خون سے ہولی جلا لیتے ہیں لوگ

جب کبھی آواز اٹھاتا ہے کوئی انصاف کی
شور و غل سے آسماں سر پر اٹھا لیتے ہیں لوگ

ہاں گیا وہ دور جب اک دوسرے کا پاس تھا
اب تو یہ ہے آنکھ سے کاجل چرا لیتے ہیں لوگ

لفظ سچائی کا ہو جاتا ہے جب بارِ گراں
اے حفیظ اپنے لہو میں خود نہا لیتے ہیں لوگ

خون اچھالا جو ایک پتھر نے
آگ محسوس کی ہے گھر گھر نے

آج پھر وقت کے جزیرے میں
سر ابھارا نئے سمندر نے

آبرو رکھ لی سنگ ریزوں کی
مل کے مٹی میں چند گوہر نے

کچھ نہ کہہ کر بھی کہہ دیا سب کچھ
سلوٹوں کی زباں سے بستر نے

میری راہوں میں پھول کی صورت
آگ دہکائی کسی ستمگر نے

توڑ کر ہاتھ رکھ لیا اپنا
بعدِ تخلیقِ فن خود آذر نے

اس کی کونین میں مثال نہیں
جس کی تصدیق کی ہے کنکر نے

اعتبار اب کسی پہ بھی نہ رہا
شعبدے وہ دکھائے اکثر نے

زندگی دی ہے فکر و فن کو حفیظ
عصرِ حاضر کے ہر سخن ور نے

تسکیل احمد شکیل

۱۸۶ - جی ٹی روڈ، شب پور، ہاوڑہ ۲

میرے خواب کی دنیا مجھ کو بھی نظر آئے
اے خدا! کبھی اپنی یہ اُمید بر آئے

جھوٹ ہی سہی لیکن سب سے ہنس کے باتیں کر
شاید اس طرح تیری شخصیت نکھر آئے

قصہ وہ سُنانے سے احتراز کر جس سے
دِل اُداس ہو جائے اور آنکھ بھر آئے

دامنِ عقیدت کو آنسوؤں سے بھر لینا
چلتے چلتے رستے میں جب کوئی کھنڈر آئے

غیرت کے شعلوں میں یہ نگر جھلستا ہے
کیسے شہر میں ہم بھی گاؤں چھوڑ کر آئے

مانگنے کہاں جائیں ایسی کوئی بینائی
جس سے زخمِ سینہ بھی پھول سا نظر آئے

اے تسکیلؔ! وہ بھی تھے میری طرح لرزیدہ
عکس جو مرے دِل کے آئینے میں آئے

مشتاق جاوید

کلکتہ - ۲۴

(نذرِ شاہین بدر)

آنکھوں میں اضطراب کا منظر لیے پھرا
اپنے شکستہ خواب کا پیکر لیے پھرا
اک واردات ہوتی رہی روز قتل کی
شمشیرِ بے نیام ستمگر لیے پھرا
پانی کی ایک بوند کی خاطر وہ دشت دشت
ہونٹوں پہ تشنگی کا سمندر لیے پھرا
اک شہرِ سنگ و خشت میں بھی سب کے واسطے
شاداب پھول دستِ پیمبر لیے پھرا
شفاف پیرہن میں تھا بوسیدہ ہر وجود
میں شہر شہر دیدۂ ششدر لیے پھرا
ہر شخص مِل رہا تھا جب اُس سے بصد خلوص
پھر کیوں وہ آستین میں خنجر لیے پھرا
سرسبز خواب راکھ میں تبدیل ہو گئے
چنگاریاں وہ آنکھ کے اندر لیے پھرا
قاتل تو کوئی اور تھا لیکن وہ بے گناہ
دامن پہ داغِ خونِ پیمبر لیے پھرا
قطرے میں ڈھل سکا نہ جب احساس منجمد
پھر کس لیے وہ دھوپ کا لشکر لیے پھرا
مقصد میں کامیاب تھے اس کے سبھی حریف
جاوید صرف ہاتھ میں پتھر لیے پھرا

محمد غلام رسول اشرف

تکیہ معصوم شاہ۔ مومن پورہ ناگپور ۱۸

ہر موڑ پہ کتنے ہی سرابوں سے ملا ہوں
میں وقت کے صحرا میں بھٹکتا ہی رہا ہوں

آواز مری قید ہے کتنے ہی دلوں میں
میں کتنے ہی ذہنوں میں ابھی گونج رہا ہوں

بنتا ہے سنورتا ہے مجھے دیکھ کے جو شخص
اس سے کوئی پوچھے کہ میں اس کے لئے کیا ہوں

جس سمت گزرتا ہوں کھل جاتی ہیں کلیاں
میں صبحِ گلستانِ محبت کی ہوا ہوں

بن جاتی ہے انجان مجھے سن کے بھی دنیا
لگتا ہے کہ جیسے کسی مفلس کی صدا ہوں

سلطان شاہد

۲۷، منگلوار واڑہ، مالیگاؤں (ناسک)

ہم عذابِ قبول و رد میں رہے
یعنی میزانِ نیک و بد میں رہے

سبز موسم کے لوٹ آنے تک
زرد پتے ہوا کی زد میں رہے

سامنا پھر ہوا بلندی سے
آج کوئی نہ اپنے قد میں رہے

پھر ردا خواب کی نہ ہم اوڑھیں
کوئی دشمن تو اپنی حد میں رہے

سات رنگوں کی اک کمان لئے
سارے بادل کرن کی زد میں رہے

اس صدی کے نگار خانے میں
اک ہمیں اپنے خال و خد میں رہے

غالب عرفان

معظم پورہ۔ نیو ملے پلی۔ حیدرآباد

ترا خلوص موثر دکھائی دیتا ہے
یہ اجنبی سا نگر گھر دکھائی دیتا ہے

مری نگاہ سے اوجھل رہا ہے جو ہر دم
مرے شعور کا محور دکھائی دیتا ہے

جو ایک قطرہ بٹ کر مری نگاہ میں تھا
بکھر کے ایک سمندر دکھائی دیتا ہے

نہ اتنا ذہن کو بھٹکاؤ دل کی راہوں پر
شعور پہلے ہی بے گھر دکھائی دیتا ہے

وہ آدمی جو نئی وسعتوں کا پیاسا ہے
ستاروں کا سمندر دکھائی دیتا ہے

یہ زندگی کا تسلسل یہ موت کا کھٹکا
ازل کی گود میں محشر دکھائی دیتا ہے

ہجوم شہر میں عرفان کس کو کس سے ہو
ہر ایک شخص پیمبر دکھائی دیتا ہے

خسرو متین خسرو

۲۸۲۔ شاہ نقی۔ میرٹھ، (یو۔پی)

جو شخص دور سے اچھا دکھائی دیتا ہے
قریب آ کے وہ کیسا دکھائی دیتا ہے

کبھی جو ہم نے لگایا تھا دل کے آنگن میں
وہ پیڑ ان دنوں سوکھا دکھائی دیتا ہے

جو سارے شہر میں پھرتا ہے اجنبی کی طرح
وہ شخص ہی مجھے اپنا دکھائی دیتا ہے

دمک رہا ہے سروں پر جواں جواں سورج
زمیں پہ پھر بھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے

عجب ادا سے تراشا ہے مجھ کو فطرت نے
کہ قطرہ قطرہ میں دریا دکھائی دیتا ہے

پریشاں حال سا اک اجنبی نہ جانے کیوں
گلی کے موڑ پہ بیٹھا دکھائی دیتا ہے

سردار آصف

گمٹی اِلہ، شاہجہاں پور (یوپی)

جھیل چمکے نہ کسی پیڑ کا سایا چمکے
دور تک مجھ کو سلگتا ہوا صحرا چمکے

جانے کب نکلے گا سورج میں بہت پیاسا ہوں
برف ہٹ جائے تو بہتا ہوا دریا چمکے

تیرگی تھی تو مرا سایہ بھی مجھ سے روٹھا
شمع جلتے ہی مگر کتنے ستارا چمکے

آئینہ بن کے پھرا کرتا ہوں گلیوں گلیوں
مدتیں بیت گئیں کوئی تو چہرا چمکے

چاند چمکا ہے دھنک چمکی گھٹا میں چمکیں
دیکھتے جائیے اس جسم سے کیا کیا چمکے

رونق گیاوی

گولے گھر، جھریا (بہار)

اب سرخ سا گلاب بھی لا منظری میں ہے
اک لمس پائمال نہاں سرجری میں ہے

اس شہرِ بے چراغ میں جگنو کی موت تھی
دم توڑتا سلوک مری بہتری میں ہے

سینے میں ہی اٹھا دھواں دفن ہو گیا
سمجھا تھا آسمان کی یہ ہمسری میں ہے

ہم چھان کر شعاعوں کو پیتے تھے رات دن
اب جنسِ احتیاط کہاں بے زری میں ہے

ہر آنکھ انجماد کے نکتے پہ جم گئی
کٹتی ہوئی سی برف بہت لاغری میں ہے

سہما ہوا ملا تھا سمندر کا دیوتا
اب کشتیٔ حیات مری رہبری میں ہے

رونق جو ہے شگفتہ نئے سال کی طرح
اس کو کہاں یقین کسی جنوری میں ہے

مصطفیٰ مومن

دھنباد (بہار)

سمندر کی تہہ میں اُتر جاؤں میں
کہ دشتِ بدن میں بکھر جاؤں میں

کبھی آبجوؤں سے بچ کر چلوں
کبھی دھوپ پی کر سنور جاؤں میں

گپھاؤں میں پرچھائیوں سا رہوں
پہاڑوں کے پیچھے ٹھہر جاؤں میں

چلوں گھر سے اِک مرتبہ اس طرح
پلٹ کر نہ پھر اپنے گھر جاؤں میں

فضاؤں میں اُڑ جاؤں میں بھاپ سا
یا شعلوں کی صورت بکھر جاؤں میں

خورشید درخشاں ہم زلف ہم

معرفت — حنیف صاحب بیڑی مرچنٹ
نزد لسن اسٹینڈ۔ برگھپہ۔ مونگیر (بہار)

عجیب شورِ تخیل کے آسمان میں ہے
وہ سبز سبز سمندر ہمارے دھیان میں ہے
فضا فضا ہے درندہ لہو لہو منظر
ستم زدہ ہے پرندہ مگر اُڑان میں ہے
اُبھرتی ڈوبتی چیخوں کا پاسبان ہے وہ
یہ اور بات ہے کہ بے لچکی زبان میں ہے
فصیلِ جسم پہ عریاں خطوط چپکاؤ
ہوس پسند نظر آج امتحان میں ہے
ہزار سخت سہی موسموں سے لرزاں ہے
ازل سے جیسے کوئی دغدغہ چٹان میں ہے
تمام رات جو بھٹکا ہے تیرگی بن کے
وہ محوِ خواب اُجالوں کے سائبان میں ہے
اُڑا رہا ہے فضاؤں میں لفظ کی کشتی
عجیب زور صداؤں کے بادبان میں ہے
مرے وجود میں پنہاں ہے رازِ یزدانی
کھنچا ہوا کوئی منصور جسم و جان میں ہے
چلو کہ پیاس بجھا لوں یزید کے گھر میں
عطش کا ذائقہ کب سے مری زبان میں ہے
انا پرست طبیعت کو کیا کروں یارب!
مری زمین بھی اب جیسے آسمان میں ہے
میں آگیا ہوں درخشاں یقیں کے مرکز پر
وہ روشنی کی طرح حلقۂ گمان[1] میں ہے

[1] بہ حالتِ مجبوری

اجنبی خوف کی دستک

طاہر نقوی
اے ۳۰۳/ ۵۶۱ گلشن اقبال، کراچی، پاکستان

باہر سے ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔ کمرے میں جاکر میں نے پیچھے مڑکر دروازے کی طرف دیکھا کہ جس کی وجہ سے میں گھر میں اس انداز سے داخل ہوا تھا کہیں وہ میرے پیچھے ہی تو داخل نہیں ہو رہا ہے۔ پھر اطمینان کرنے کے لئے میں نے بیوی پر نظر ڈالی اور اپنے اندر کے خوف سے لرزتے ہوئے جسم کو نڈھال انداز میں مسہری پر گرا دیا۔ اور اپنے اعصاب اور سانس کی رفتار کو درست کرنے لگا۔ میری بیوی پریشان کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اس میں کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں معلوم ہوئی تھی شاید یا اس لئے نہیں پوچھ رہی تھی کہ سب کچھ بتانے کی حالت میں نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے جوتے اتارے، کپڑے تبدیل کئے۔ اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ غسل خانے میں مجھ پر پھر وہی خوف غالب آگیا اور میرے اندر محن پار کرکے کمرے میں جانے کی ہمت نہ رہی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں جیسے ہی غسل خانے سے باہر نکلوں گا باہر سے کوئی آکر مجھے دبوچ لے گا۔ جب بیوی نے گھبرا کر آواز دی اور غسل خانے میں ہی چلی آئی تو میں موقع غنیمت جان کر اس کے ساتھ ہی باہر آگیا۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک گھورے جا رہی تھی۔ شاید میرے چہرے سے خوف و ہراس کے اثرات ابھی تک نمایاں تھے۔

"آپ پر خوف کیوں طاری ہے۔ کیا ہوا ہے" اُس نے پریشانی سے پوچھا۔ جواب دینے کی کوشش میں میرے دل کی دھڑکنیں اور بھی تیز ہوگئیں۔ اور ہونٹ لرزنے لگے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا جواب سن کر کہیں میرے اردگرد موجود ہی نہ مجھے پکڑ لے۔ یا پھر کہیں میری بیوی ہی حقیقت حال سے آگاہ ہوکر مجھے دھتکار ہی نہ دے۔ مجھے جواب دینے میں ناکام دیکھ کر اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور کھانا لینے چلی گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی میری نظریں غیر شعوری طور پر کبھی دروازے پر پڑتیں کہ کوئی اچانک ابھی داخل ہوکر مجھے پکڑ لے گا اور کبھی کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کوئی مجھے غصیلی نظروں سے نہ جھانک رہا ہو۔

شام ہوگئی تھی لیکن دفتر سے آنے کے بعد سے ابھی تک میں کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ بیوی جب بھی کام سے چند لمحوں کے لئے فرصت پاتی میرے کمرے

میں داخل ہوتی اور حیرانی سے مجھے دیکھتی جیسے پوچھ رہی ہو کہ باہر کیوں نہیں نکلتے۔ کمرے میں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو اور کبھی اس طرح دیکھتی جیسے میں کہیں دھواں بن کر اڑ تو نہیں گیا ہوں۔ میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے وہم کی تردید کرتا اور اس کے گمان کا مضحکہ اڑانے کی بھی کوشش کرتا۔ شام کو کام سے فراغت کے بعد وہ آئی اور میرے سامنے سے رسالہ اٹھا کر پرے پھینکتے ہوئے بولی ـــــ

"ابھی آپ تیاری نہیں کر رہے "

"تیاری ـــــ کیسی؟ ـــــ"

"رات کو کھانے پر جانا ہے، بھول گئے کیا؟"

میں نے اپنے اندر اتنے لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پائی۔ مجھے یہی گمان رہا کہ سب لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میری کمزوری پکڑی جائے گی۔ میں ان سب کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا ـــــ

"تم جاؤ میں گھر پر ہی رہوں گا ـــــ"

اس نے تعجب کی نظریں مجھ پر پھینکیں۔

"آپ ہی نے تو یہ پروگرام بنایا تھا ـــــ کیا ہو گیا ہے آخر؟"

"کچھ بھی تو نہیں" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ آواز میں خوف شامل تھا ـــــ اس نے یہ خوف محسوس کر لیا۔

"آپ کو چلنا پڑے گا۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی"

میں اندرونی کشمکش سے دوچار تھا۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ وہاں جاؤں ممکن ہے طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا مگر اندر سے ہمت نہیں پڑ رہی تھی بس یہی خوف تھا کہ میں سب کے سامنے ظاہر ہو جاؤں گا۔ سب میری کمزوری پکڑ کر لعن طعن کریں گے اور پھر میں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ مجھے سوچتا دیکھ کر میری بیوی اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال کر جھول گئی۔

"آپ چلیں گے نا ـــــ"

مجھے محسوس ہوا جیسے اسے میری کمزوری معلوم ہے اور وہ بھرے مجمع میں جا کر اسے سب پر عیاں کرنا چاہتی ہے لیکن میں انکار نہ کر سکا کہ کہیں وہ میری اندرونی کیفیت سے آگاہ ہو کر زیادہ شک نہ کرنے لگے۔ اسی لئے میں نے خوشی سے حامی بھر لی۔ وہ اس قدر خوش ہوئی جیسے بہت دنوں کی مایوسی کے بعد کوئی خوشی میسر آئی ہو۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ لہجے میں اعتماد کی کمی تھی۔

"رکشہ گھر پر آ جائے تو ......"

"ہاں تو جا کے لے آئیے"

وہ بہت خوش تھی، مجھے یہی شک رہا کہ کہیں اس لئے تو خوش نہیں کہ وہاں جا کر ضرور سب کے سامنے پکڑی جائے گی۔ میں خود ہی اس بات کی نفی بھی کرتا کہ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟ جائیے جلدی سے رکشہ لے آئیے۔ دیر ہو رہی ہے"

"میرا خیال ہے کہ تم پڑوس کے بچے کو بھیج کر ......"

میں بات مکمل نہ کر سکا۔ کچھ لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے خوشامدانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پڑوس میں چلی گئی۔

گھر سے نکلنے کے بعد پہلے میں نے اطمینان کر لینے کے لئے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر جلدی سے رکشہ میں جا بیٹھا۔ رکشہ والے نے مجھے تعجب اور طنزیہ ہنسی کے ساتھ دیکھا۔ میں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ بیوی بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اب اس کی نظروں میں حیرانی اور پریشانی کے ساتھ الجھن بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہاں جا کر جب رکشہ رکا تو میں بیٹھے بیٹھے کرایہ ادا کر کے اسی طرح دروازے پر جا پہنچا۔ میں رکشہ والے کے تاثرات کے بارے میں قیاس اچھی طرح کر سکتا تھا۔ میری بیوی جلدی جلدی قدم رکھتی ہوئی میرے ساتھ ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم جھجک نے پکڑ لئے۔ باہر لان میں سب لوگ بیٹھے

خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چند آوازیں اُبھریں
—— "آ گئے ... آ گئے"

اور اس کے ساتھ ہی ملی جلی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔
میں نے بیوی کو دیکھا، میری نظروں میں اعتماد بالکل نہیں تھا۔ میں
یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب ابھی تک میری ہی تاک میں لگے ہوئے تھے۔
ان کو میری کمزوری کا علم ہو گیا ہے۔ میں اب ان کے سامنے چھپا نہیں
رہ سکتا۔ اس خیال سے میرے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔
رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ میری بیوی نے میرے چہرے کو
مددگار نظروں سے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی ——
"آگے بڑھئے —— سب لوگ کیا کہیں گے۔"

اور میں اپنے من من بھر کے قدم رکھتا ہوا ان کے نزدیک جا پہنچا
اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ لوگ اتنی دیر میں کیوں آئے؟" کسی نے پوچھا۔

"دیر —— ر —— ر —— میں؟" میں ہکلا کر رہ گیا لیکن
فوراً ہی میری بیوی نے جواب دے کر میری مشکل آسان کر دی۔

"انہیں دفتر میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر رکشہ دیر میں ملا۔"

"ہاں ہاں یہی بات تھی" —— میں نے بھی ہاں میں ہاں ملانے
کی کوشش کی جیسے یہ بہت ضروری ہو۔

"آپ تو ہمیشہ بھابھی کی ہاں میں ہاں ملاتے آئے ہیں۔"
اس پر ایک ملا جلا قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے بھی اس ہنسی میں شامل ہونے
کی کوشش میں اپنا منہ کھول تو دیا مگر آواز نہ نکل سکی۔ یہ بھی بہت
اچھا ہوا کہ فوراً ہی کھانا شروع ہو گیا۔ میں کھانے کے دوران ہر ایک کی
طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتا اور ہر ایک کو کھانے میں مصروف پا کر
اطمینان کر کے میں بھی کھانے لگتا۔ لیکن ہر لمحے مجھے یہی خوف ستاتا
رہا کہ کہیں اچانک ان میں سے کوئی بول کر میرے اندر چھپا ہوا چور باہر
نہ لے آئے۔ کہیں میری ساکھ ختم نہ ہو جائے۔ کھانے کے بعد سب لوگ

اسی طرح پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور قہقہے بلند ہونے لگے۔
میں ایک کونے میں بیٹھا سب کو باری باری دیکھتا رہا۔

"آج آپ بول نہیں رہے ورنہ آپ تو کسی اور کو بولنے ہی نہیں
دیتے۔"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ میں آپ سب کی باتیں سن رہا ہوں"
ہمت کر کے میں نے کہنے کو یہ کہہ دیا مگر یہ کہہ کر جسم پر ٹھنڈے پسینے
کی وجہ سے مجھے ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ میں آج واقعی بول نہیں پا رہا
تھا۔ بولتا بھی تو بہت ہمت کر کے دھیمی آواز میں جیسے سرگوشی
کر رہا ہوں۔ ان سب کی باتیں میرے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ
کی طرح داخل ہو رہی تھیں۔ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ اور وہاں
سے اٹھ کر اندر کمرے میں لیٹ گیا۔ میرا ذہن سنسنا رہا تھا۔ میرے
پیچھے میری بیوی بھی داخل ہو گئی۔

"طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہے —— تم جاؤ وہاں باتیں کرو" —— میں
تنہا ہی اپنے وجود کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا تھا۔

"نہیں —— میں اکیلی وہاں کیا کروں گی۔"

"اکیلی؟ اتنے سارے تو ہیں" ——

"آپ کے بغیر تو میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔"
میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے

"پتہ نہیں آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے" اس کے شفاف گالوں
پر آنسو ڈھلک آئے۔ میں بے چین ہو گیا۔ جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں
میں لے کر میرے دل کا سارا خون نچوڑ لیا ہو ——

"بھئی ٹھیک ہوں —— تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔" میں
نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا —— میری آواز اعتماد اور یقین سے یکسر
خالی تھی۔ اور خود مجھے محسوس ہوا جیسے میں کنویں میں سے بول
رہا ہوں۔ میری بیوی کو میرے جواب سے ذرا سا بھی اطمینان نہ ہوا

کیوں کہ اس نے میری آواز کی کمزوری اور لہجے کی لڑکھڑاہٹ محسوس کرلی تھی۔ ہم دونوں کو یہاں علیحدہ کرے میں دیکھ کر کچھ لوگ، آوازیں دیتے ہوئے اسی طرف آگئے۔

"ارے آپ دونوں یہاں کیوں آگئے آخر؟"

میری بیوی نے آنسو پونچھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ان کی طبیعت کچھ خراب سی ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ اردگرد کی ہر شے کا پیلا رنگ میرے سُتے ہوئے چہرے پر اکٹھا ہو گیا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش میں انہیں اور بھی بے ترتیب محسوس کرنے لگا۔ میرے چہرے کے تغیرات دیکھ کر میری بیوی نے اُن لوگوں سے کہا ___

"دراصل انہیں تنہائی کی ضرورت ہے۔"

اور سب لوگ مجھ پر نظریں پھینکتے ہوئے چلے گئے۔ ان کی نظروں سے مجھے ایسا لگا جیسے انہیں میری اندرونی کیفیت اور خوف کا علم ہے۔ یہ کسی بھی وقت یک آواز ہو کر کہہ دیں گے ___

رات کو جب ہم گھر پہنچے تو میرے ذہن میں یہی الجھن تھی کہ میں صبح دفتر جاؤں یا نہ جاؤں ___ جاتا ہوں تو یہ خوف بھی میرے ساتھ رہے گا کہ کہیں کوئی دفتر میں میری کمزوری نہ پکڑ لے اور نہ جاؤں تو یہ خوف مجھ پر مستقل طور سے کہیں غالب نہ آجائے۔

آخر میں نے دفتر جانے کا فیصلہ کیا۔

دفتر کے لیے رکشہ لینے کی کوشش کی، مگر ناکامی ہوئی۔ دیر ہو رہی تھی۔ میں پیدل ہی چل دیا۔ دفتر کوئی ڈیڑھ دو میل دور تو تھا ہی ___ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوا تیزی سے چلتا رہا۔ کوئی میری طرف دیکھتا تو میں لرز کر رہ جاتا کہ کہیں آکر وہ مجھے دبوچ نہ لے۔ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا کہ پیچھے سے آکر اچانک کوئی مجھے قابو نہ کر لے۔ دفتر پہنچ کر میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور چھٹی تک وہیں بیٹھا رہا۔ نہ کسی سے ملا نہ بات چیت کی۔ جب دو آدمیوں کو آپس میں بات کرتے ہوئے دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ میرے ہی بارے میں بات چیت کر رہے ہوں۔ یہ سوچ کر میں نظریں نیچی کر لیتا اور اپنے آپ کو اپنی ہی نظروں میں گرا ہوا پاتا۔ پھر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ دو ایک ساتھی میرے پاس آئے بھی اور نہ ملنے کی شکایت بھی کی۔ بولے ___

"کیا آج کام زیادہ ہے؟"

"ہاں ___ بہت زیادہ ___"

اور وہ کچھ بور ہو کر اُٹھ گئے۔ دفتر کا وقت بڑی مشکل سے گذرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے وہاں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک صدی گذر گئی ہو۔ گھر پہنچا تو میری بیوی نے پُر امید نظروں سے مجھے دیکھا مگر میرے چہرے پر اُڑتی ہوئی ہوائیوں اور گھبراہٹ سے میری اندرونی کیفیت کا اس نے اندازہ لگا لیا۔ میں ابھی آیا ہی تھا کہ بیوی نے بتایا کہ کوئی صاحب آئے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہیں یہ وہی نہ ہو جو آتے ہی مجھے دبوچ لے گا۔ اور پھر سارے محلے کو میرے بارے میں علم ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ۔ جا کے منع کر دو ___ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہی پھر جا کر پتہ نہیں اس نے کیا جواب دیا۔

میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میری بیوی نے مشورہ دیا کہ میں دفتر سے چھٹی لے لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر بیوی ہی کی ضد پر میں ڈاکٹر کے ہاں بھی گیا۔ وہ بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔ کچھ دوائیں دیں۔ جن سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوا۔ میری بیوی مجھے کبھی تفریح اور کبھی فلم دیکھنے کا مشورہ دیتی۔ مگر میں راضی نہ ہوتا۔ میں اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بس یہی ڈر لگتا تھا کہ باہر کوئی میری تاک میں چھپا کھڑا ہوگا۔ اور مجھے دہکتی ہوئی لال لال آنکھوں سے گھور رہا

ہوگا۔ کمرے سے نکلوں گا تو میری کرکری ہو کر رہ جائے گی۔ باہر نکلنے کے خیال ہی سے مجھے پھریری آجاتی۔ خوف کا بھوت ہر طرف خونیں پنجے گاڑے نظر آتا۔ خوف کے اس احساس کی آنچ میرے جسم کو پگھلانے لگی تھی۔ ایک نامعلوم خوف کے بوجھ سے ہر وقت میری روح دبی رہتی جیسے مجھے اپنے وجود کی چہار دیواری سے باہر جھانکنے کی اجازت نہ ہو۔ یہ دنیا جو بظاہر اتنی وسیع ہے مجھے تنگ معلوم ہوتی ہے۔ میری زندگی خوف کی پتھریلی چکنی چٹان پر تیزی سے پھسلتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا۔

وقت کا پنچھی اپنی اڑان میں مصروف رہا۔ اور میری چھٹیاں ختم ہو گئیں لیکن میری حالت میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب میں اپنی بیوی سے بھی خوف زدہ رہتا۔ وہ میرے قریب آتی میں دور ہو جاتا۔ سوچتا کہیں یہ میری کمزوری نہ اُچک لے۔ وہ چپکے چپکے روتی۔ میں اُسے روتا ہوا دیکھتا لیکن اسے تسلی نہ دے پاتا۔ میں اس کے نزدیک جانے کی کوشش کرتا تو وہی خوف ایسا کرنے سے باز رکھتا۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اور یہ بھی کہ کل مجھے دفتر جانا ہے وہاں میں وقت کیسے گذاروں گا۔ کبھی سوچتا کہ چھٹی اور لے لوں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میری بیوی نے آکر میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا، چہرہ اس کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا میرے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ابھی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے گی۔ عین اُسی لمحے کال بیل بجی اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی دوڑی ——

چند لمحے بعد ایک نوجوان عورت میری بیوی کے ساتھ داخل ہوئی چہرے سے غمگین لگتی تھی۔ ٹھیک اُسی لمحے مجھے پھر وہی جانا پہچانا خوف محسوس ہوا کہ یہ آنے والی عورت میری کمزوری ہی بیان کرنے آئی ہے۔ میری بیوی مجھے تیز اور گہری نظروں سے گھور رہی تھی۔ چہرے پر معنی خیز تاثرات تھے۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ اچھا تو تمہاری اس تمام کیفیت کی اصل وجہ یہ عورت ہے۔ میں اپنی بیوی کی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی ان نظروں اور اپنے اندر خوف کے احساس کی وجہ سے میں عجیب ملی جلی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ساتھ ہی خوف کا احساس مجھ پر غالب ہونے لگا۔ اور میرے اندر اور پورے جسم پر رونگٹے رونگٹے میں لرزہ سا طاری ہونے لگا ——

"یہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

میری بیوی معنی خیز اور طنزیہ لہجے میں کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت میری سوجھ بوجھ کوئی کام نہ دے سکی۔ میں نے آواز دینا چاہا تھا مگر اپنی خوف زدہ کیفیت کی وجہ سے آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ عورت ابھی تک اُسی طرح کھڑی تھی۔ میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں اُسے بیٹھنے کو کہا اور اسی کے ساتھ یہ بھی احساس ہوا کہ میں جس کی وجہ سے خوف زدہ ہوں اُن کی مدارت کر رہا ہوں۔ میں نے اسے پہچاننے کی بڑی کوشش کی، دماغ پر زور ڈالا، اپنی یادوں کے پس منظر پر نظر دوڑائی، شناساؤں کے چہرے یاد کئے۔

"آپ مجھے پہچانتے نہیں شاید" ——

"جی —— جی ہاں! —— میں نے ہکلاتے ہوئے کہا —— مجھے لگ رہا تھا جیسے اب میرا دماغ اس خوف کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اور یہ پرزے پرزے ہو کر بکھر جائے گا۔ اس کے باوجود میں نے ان پرزوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ——

"اس کوشش میں ناکام ہو گیا ہوں۔"

"ہاں! ٹھیک ہے —— جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا ہو ——

"آپ مجھے بھلا پہچان بھی کیسے سکتے ہیں، ہماری کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

وہ میری متغیر حالت کو بھی بغور دیکھ رہی تھی۔ میری طرف سے جواب نہ پاکر خود ہی بولی ـــ

"آپ دراصل میرے شوہر کو جانتے ہیں۔"

میں پھر اپنے دوستوں کے بارے میں اپنے خیالات دوڑانے لگا۔ اس دوران میں مسلسل میں یہی محسوس کرتا رہا کہ کوئی اب میرے پیچھے سے آکر کبھی ابھی دبوچ لے گا۔ میں غیر ارادی طور سے کئی بار اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اردگرد دیکھ بھی چکا تھا۔ میں وہاں کسی کو نہ پاکر میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمایاں ہوتیں اور میرے کپڑوں پر ٹپک جاتیں۔ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے بتایا ـــ

"آپ مظفر صاحب کو جانتے ہیں؟"

"مظفر ـــ ہاں ـــ"

اس لمحے میرا دل خوف سے یک دم اچھل کر حلق میں آکر اٹک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس کا خوف میرے اردگرد رہتا ہے وہ مظفر ہی ہے جو ابھی کسی کونے سے نکل کر مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لے گا۔

"میں ان کی بیوی ہوں ـــ"

اس وقت میں خوف کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور مجھ پر لرزہ سا طاری تھا کہ بس ابھی مظفر اور اس کی بیوی دونوں مل کر مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جاکر سب کے سامنے ننگا کر دیں گے۔ میں نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے تاثرات کی جگہ خوشی کے تاثرات لانے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت غیر شعوری طور سے میں نے پھر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے اندرونی خوف کو چھپانے کی کوشش میں کہا ـــ

"مظفر کیسے حال ہیں، وہ خود نہیں آیا؟"

اس کی آواز گلوگیر ہوگئی ـــ اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"وہ سخت بیمار ہیں اور ڈاکٹر ناامید ہوگئے ہیں۔"

"اوہ! غم کی ایک لہر میرے دل سے اٹھی اور اس کے لئے ہمدردی کا ایک طوفان امڈا لیکن مجھے برابر یہی خوف کھاتا رہا۔

"مجھے معلوم نہ ہوسکا، افسوس!"

"اس وقت میں آپ کے پاس نہایت مجبور ہو کر آئی ہوں۔"

"جی ـــ جی کہئے ـــ"

اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے جو اس کے کپڑوں پر ٹپک رہے تھے۔ مجھے بھی مسلسل یہی احساس رہا کہ میرے پیچھے سے مظفر آجائے گا۔ وہ گھڑی گھڑی پہلو بدل رہی تھی اور کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"جو کہنا ہے کہئے" میں نے ہمت کر کے کہا۔ لیکن یہی خوف رہا کہ اب یہ وہی بات کہہ دے گی جو خوف بن کر میرے لاشعور تک میں گھس گئی ہے۔ میرا حلق خشک ہوگیا، رواں رواں کانپنے لگا۔ اور دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں ـــ

"انہوں نے آج مجبوری کی حالت میں بتایا کہ آپ نے ان سے تین سو روپے لئے تھے اور اب مجھے ان روپوں کی سخت ضرورت ہے۔"

یہ سن کر میرا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا جیسے مظفر نے آکر میرا گریبان کس کر پکڑ لیا ہو اور میرے دماغ میں قہقہے گونجنے لگے۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ روپے لیکر وہ اٹھ کر جانے لگی تو مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اردگرد سے ہٹ کر اور میرے اندر سے باہر نکل کر سارا کا سارا خوف اس کے پیچھے ہولیا ہو۔ اسی لمحے میری بیوی میرے پاس آئی اور روٹھے ہوئے لہجے میں بولی ـــ

"آپ نے یہ روپے کیوں لئے تھے بھلا۔"

اچانک میرے پورے جسم میں جولانی کی ایک لہر آئی اور میں نے اس کے وجود کو اپنے بازوؤں میں بھر کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ـــ

"بھئی! اسی روز تمہاری سالگرہ تھی۔" (بقیہ صفحہ ۵۴)

مجرم

عابد قمر
گوکل پور ۔ پٹنہ

وہ ایک ایسے مکان میں مقیم تھا جہاں نچلے طبقے کے لوگ ایک ایک کمرہ میں مع فیملی رہتے تھے ۔۔۔۔۔ ہ ۔۔۔ تھا ہوکر مہینوں اسٹیشن پر رات گزارنے کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں اسے نوکری مل گئی تھی ۔ ۔۔۔ منہدم سی عمارت میں ایک کمرہ بھی ۔

جب وہ یہاں آیا تھا پورا مکان خالی تھا آہستہ آہستہ ۔۔۔ اور ۔۔۔ آ گیا ۔ نچلے خاندان کا فرد ۔۔۔ ہونے کے بھی وہ ان مکینوں میں گھل مل گیا تھا ۔ فرصت کے اوقات میں کتابوں کی ورق گردانی کرتے دیکھ کر لوگ ۔۔۔ اسے ماسٹر صاحب کا نام دے رکھا تھا ۔

تمام لوگ اس سے معمولی رقم قرض لیتے رہتے جو دیر سویر ادا ہو جاتا ۔ زیادہ تر عورتیں ۔۔۔ سے روپے مانگتیں کبھی گڑگڑا کر اور کبھی ۔۔۔ کر !

مرد اپنے اپنے کام سے واپسی پر مختلف نشیات میں کھو جاتے ۔ گالی گلوج کا بازار گرم رہتا ، ہفتہ عشرہ میں چھرے تلوار کی نوبت بھی آجاتی ۔ پورے محلے میں اسی قماش کے لوگ تھے ۔ ان ہنگامی موقعوں پر گلی آدمیوں سے بھر جاتی ۔ عورتیں بھی کمر کس کر میدان میں اتر آتیں ۔ اور یوں لگتا جیسے کوئی بڑا بلوہ ہو گیا ہو ۔

ایک دو مکان میں رہنے والے بڑے لوگ اپنے کوٹھے سے محو تماشا ہوتے اور بس !

سامنے چھوٹے سے میدان میں مسجد کے پاس ، دن رات جوا ہوتا رہتا ۔ پولیس آتی اور پیسے لے جاتی ۔ اتفاقاً کوئی پکڑا بھی جاتا تو راستے ہی سے کچھ لے دے کر واپس آجاتا ۔

بڑے لوگوں کو ان معاملوں سے کوئی سروکار نہ تھا ۔ ہاں کبھی کبھی بلوہ ہوئے کافی دن ہو جاتے تو ان میں سے کوئی استفسار کرتا کہ "بھئی آخر ماجرا کیا ہے ، سب خیریت تو ہے ۔" گویا بہت دنوں سے میدان شور نہ ہونے سے اُن کی تفریح میں خلل پڑ جاتا ۔ وہ بھی ایسے موقعوں پر راہ فرار ہی اختیار کیا کرتا ۔ یا تو کمرہ بند کر کے غائب ہو جاتا یا بند کمرے میں سونے کی ریہرسل میں لگ جاتا ۔

جھگڑا ختم ہوتے ہی بلکتی جھکتی عورتیں جب اپنے اپنے ٹھکانے پر آتیں ۔ تو انہیں ہر دلعزیز ماسٹر صاحب کی یاد آتی ۔ کئی عورتیں اس کے کمرے کو بند دیکھ کر فریاد کی دہائی دیتی واپس ہو جایا کرتیں ۔ کبھی کبھی وہ پکڑا جاتا ۔ ایسے میں ہر ۔۔۔ کا

سدا پایسے دعوتِ قربت دے کر اپنی بات منوانا چاہتا لیکن فطرتاً عیاش ہوتے ہوئے بھی وہ ان کی دعوت نہ قبول کر پاتا تھا۔ شاید ان کے مردوں کے کرخت لہجے اور جنگجو فطرت نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ گھر سے الگ ہونے کی وجہ سے اس کے وجود میں ایک خلا رسا پیدا ہو گیا تھا۔ بچوں کی قربت میں وہ اپنا آپ بھلا بیٹھا۔ اسے یک گونہ راحت ملتی۔

صبح سویرے وہ رات کا بھلایا ہوا جیا کھاتا۔ گندے ننگے بچے اس کے ارد گرد اچھلتے کودتے ہوئے چیا چباتے رہتے۔ ان چھوٹے چھوٹے نادار بچوں کی باشعور باتوں میں وہ کھو سا جاتا۔ سودا سلف، جھاڑو بہارو، پانی حاصل کرنے کی مہم اور کوڑا کرکٹ کی صفائی یہ سارے کام وہ بحسن و خوبی انجام دیتے۔ وہ سوچتا کاش یہ انمول رتن زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو پاتے تو کیسے جگمگا اٹھتے۔ ان کے والدین سے جب وہ استفسار کرتا تو سب قسمت کو کوسنے لگتے۔

تمام بچوں میں بھولی اسے بہت بھاتی۔ پانچ سات برس کی یہ بچی توتلی زبان میں جب بولتی تو وہ جھوم اٹھتا۔ جب وہ اس سے پوچھتا کہ روپے میں کتنے پیسے ہوتے ہیں۔ تو وہ جواب دینے سے قاصر رہتی لیکن ایک روپیہ دے کر جب وہ اسے چائے بسکٹ اور سگریٹ لانے کہتا۔ تو وہ ایک ایک پائی کا حساب دے ڈالتی۔ اس کی موجودگی میں یوں تو بچے مغلظات بکنے سے احتراز کرتے۔ لیکن آپس میں لڑ جانے پر یا چھینا جھپٹی میں کوئی گالی بولتا تو بھولی بگڑ کر کہتی ——

”جیب ماتل بساب ہے رہے۔ ہم ماتل ساب کہہ دیبئے؟“

اور وہ انجان بن کر کہتا ——

”ہاں بھولی بتا تو کیا ہوا؟“

وہ توتلاتے ہوئے کہتی ——

”دیکھو ماتل باؤ ای ہوا، منو تو بولا.....“ اور وہ گالی بک کر فوراً اپنے کان پکڑ بیٹھتی۔ کبھی کبھی دھینگا مشتی میں وہ گر پڑ جاتی۔ یا اس سے کوئی لڑ بیٹھتا تو وہ بے دریغ گالی بکنے لگتی۔

اور جیسے ہی اس کی آنکھیں اپنے ماسٹر بابو سے چار ہوتیں اس کا احساسِ انفعال بیدار ہو اٹھتا۔ وہ فوراً بھاگ کھڑی ہوتی۔

دن تو اس گھر میں صبح چار بجے سے رات بارہ بجے تک بازار کا سا ہنگامہ رہتا لیکن اس سے کوئی خلل نہ پڑتا۔ بس ایک معاملہ اس کی پریشانی کا باعث ہوتا۔ جہاں کوئی اپنے بچوں کو مارنے لگتا تو وہ بے کل ہو اٹھتا۔ خاص کر عورتیں اس بیدردی سے بچوں کو زدوکوب کرتیں کہ وہ سہم سہم جاتا۔ سوچنے لگتا آخر یہ اتنی مار برداشت کیسے کر لیتے ہیں۔ متوحش ہو کر وہ روتے بلکتے بچے کو بلواتا۔ اسے پیسے دے کر چپ کراتا۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کی اس کمزوری سے واقف ہوتے گئے ——

ایک رکشہ چلانے والا نیچے رہتا تھا۔ دسویں کلاس پاس تھا۔ اس کی بول چال، اور وضع قطع میں خاصہ رکھ رکھاؤ تھا۔ اور وہ خلیفہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے کوئی اولاد نہ تھی۔ اکثر وہ کہانی قصے کی کتابیں مانگ کر لے جاتا۔ خود پڑھتا اور بیوی کو بھی سنایا کرتا۔

ایک دن خلیفہ اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ بھولی کی ماں اسے مار پیٹ رہی تھی۔ آواز سن کر وہ بڑی طرح پریشان ہو رہا تھا۔ اتنے میں بھولی روتی چلاتی آئی۔ وہ اسے دس پیسے دے کر چپ کرانے لگا۔ بھولی پیسے لینے سے انکار کرتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔ جسے وہ کچھ نہ سکا۔ خلیفہ نے بتایا کہ وہ چار آنے مانگ رہی ہے۔ اس نے ایک چونی دی۔ اور فوراً بھولی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

خلیفہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر بڑی متانت سے یوں گویا ہوا ——

”ماسٹر صاحب! آپ بھولی سے بھی زیادہ بھولے ہیں۔ آپ جیسا ہمدرد آدمی کم ملے گا۔“ —— وہ بولا ——

”کتنی حیوانیت سے یہ لوگ بچوں کو مارتے ہیں، میں تو کانپ

اٹھتا ہوں۔"

خلیفہ نے کہا ــــ "وہ تو صحیح ہے ماسٹر صاحب! لیکن آپ نے میرے لفظ پر غور نہیں کیا کہ ہم نے آپ کو بھولا کیوں کہا" ــــ؟

وہ مسکراتے ہوئے بولا ــــ "ہاں شاید بھولی کی مناسبت سے آپ نے مجھے بھولا کہا" ــــ

"نہیں حضور" ــــ! وہ یکایک سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جب سے آپ کی فطرت سے لوگ باخبر ہو گئے ہیں بچوں کی بہت زیادہ پٹائی ہونے لگی ہے۔ دراصل ان کے ماں باپ آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وقتِ ضرورت دس، بیس پیسے اس طرح حاصل کر لیتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ! نہیں بھئی ــــ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ سٹپٹا کر بولا ــــ

لیکن خلیفہ کے جانے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں سچ مچ ایسا ہی تو نہیں ــــ نہیں، نہیں ــــ یوں نہیں ہے ــــ خلیفہ اولاد کی محبت کیا جانے۔ بھلا چند پیسوں کے لئے، کوئی اس طرح بچوں کو سزا دے گا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا ــــ اکثر بچے مار کھاتے ہی اس کے پاس دوڑے آتے لیکن اس سے دس بیس پیسے لیکر جب وہ بازار سے واپس ہوتے۔ تو ان کے ہاتھوں میں بجائے بسکٹ، ٹافی کے، چائے کی پتی، چینی، نمک اور مصالحہ کے قسم کی چیزیں ہوتیں۔

پھر وہ بدبدانے لگا ــــ اگر ایسا ہے تو بہت برا ہے ــــ یعنی بچے صرف اس لئے مار کھائیں کہ وہ رو دھو کر پانچ دس پیسے مجھ سے حاصل کریں۔ اس نے کافی غور و خوض کیا لیکن یہ مسئلہ اس سے سلجھایا نہ گیا۔

ماہ کا آخری دن تھا۔ صبح وہ سو کر اٹھا تو اس کے پاس صرف دو روپے تھے۔ اسے کئی ایک کام کرنے تھے۔ سیلون جا کر شیو کرانا۔ لانڈری سے کپڑے لانا۔ نہانے کے لئے صابن، سگریٹ کا ڈبہ، رات کے لئے کراسن تیل اور پھر آفس جانے کے لئے بس کا کرایہ ــــ!

وہ سوچ رہا تھا ان میں کس چیز کو فوقیت دی جائے۔

یکایک بھولی کی بری طرح چیخنے اور اس کی ماں کی گالی گلوچ، اور مار دھاڑ کی آواز سے کوٹھا گونجنے لگا۔ اور پھر بھولی روتی چلاتی اس کے کمرے کی جانب بھاگی چلی آ رہی تھی۔ اس کی ماں پیچھے پیچھے اسے رگید رہی تھی۔ دروازے پر آ کر ماں نے ایسا دھکا دیا کہ وہ اس کے کمرے میں فرش پر آ گری۔ ننھی ننھی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ کلائی سے خون خون رسنے لگا۔ دروازے پر کھڑی اس کی ماں چلا رہی تھی ــــ

"آج مار کے تیرا کھتے کر دے ہی۔ سسری نیا چپل گھلا دیہس۔ اب لا کہیں سے دو روپیہ۔ نکل ماسٹر صاحب کے کمرے سے ــــ نکل ہرامجادی!"

بھولی کی ماں بکتی جھکتی چلی گئی لیکن کمرے سے چلانے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں ــــ

"لے کے آ چپل ــــ نہیں تو دو روپیہ لا۔ کھالی ہاتھ آئی تو جان مار کے پھینک دے ہی!"

وہ بھولی کو اٹھا کر چمکار رہا تھا ــــ "شام کو چپل آ جائے گا جا ماں سے کہہ دے۔"

بھولی بلک رہی تھی ــــ "نا تم ہم کو روپیہ دو ــــ ہم نا جائی۔ دو روپیہ دو پہلے!"

وہ سوچ رہا تھا ــــ دو ہی روپئے تو ہیں اپنے پاس۔ ابھی کیسے دے دوں ــــ کل پرسوں دے دوں گا۔ طرح فرار اختیار کرتے ہوئے وہ باہر نکلنے کے لئے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

بھولی دروازہ پر کھڑی ہاتھ پکڑے سسک رہی تھی۔ یکایک اس کی

ماں، بیچ بیج شیرنی کی مانند چیختی دھاڑتی آئی ــــ

"اگے، بیتیل لائی ــ؟" اس نے جھپٹ کر بھولی کا ہاتھ کھینچا۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر ایک لات اس زور کی رسید کی کہ وہ سامنے کی چہار دیواری کی منہدم منڈیر سے جا ٹکرائی۔ ساتھ ہی ایک دھماکہ ہوا۔ کئی اینٹوں کے ساتھ بھولی بھی نیچے جا گری۔

ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر نہ جا سکا۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ یکایک اس کے کانوں میں بھولی کی ماں کے بین کی آوازیں گونجنے لگیں ــ

"ہم ای کہا تر مارا تھا کی نگوڑی ماسٹر صاحب کے پاس جا کے رو دے گی۔ تو دو روپیہ ماسٹر صاحب دیدیں گے ــ ہائے ہم ای نا جانت رہی کی نگوڑی کیسے ہو جائے گی۔ ہائے ای کا ہو گیا رے میا ــ!"

وہ سینہ پیٹ رہی تھی ۔۔۔ اس کے ہاتھ پاؤں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد خلیفہ بھولی کے باپ کے ساتھ تجہیز و تکفین کے لئے چندہ لینے آیا۔ اس کے لرزتے ہاتھوں نے جیب سے دو روپے کا نوٹ نکالا اور خلیفہ کے گمچھے میں ڈال دیا۔

خلیفہ کی شعلہ بار آنکھوں کی تاب نہ لا کر اس کی ویران نظریں چوکھٹ سے یوں لگ گئیں، جیسے وہ کوئی مجرم ہو ــــ

▲▲

بقیہ اجنبی خوف کی دستک

اور مجھی تحفہ دینے کے لئے میرے پاس پیسے نہ تھے"۔

مجھے ایسا لگا جیسے ابھی تک میرا بال بال جکڑا ہوا تھا اور اب ایک عرصے کے بعد اس خوف سے آزاد ہو کر اپنی بیوی سے ملا ہوں ــ ▲▲

اُلجھی ڈور کا سرا

شبنم سحر
۵۲۹، چوڑی والان۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

سنو دوست! تم نے زندگی میں کیا کچھ نہیں پایا ...... عزت، شہرت، دولت، بیوی، بچے ـــــ پھر ..... پھر تم اس قدر اُداس اور کھوئے ہوئے سے کیوں دکھائی دیتے ہو ......؟ بتاؤ میرے دوست تم کو کس کی تلاش ہے؟ کون سے دُکھ کا بوجھ اپنی ناتواں روح پر لادے پھر رہے ہو .....؟؟ ـــــ مجھے بتاؤ میرے دوست میں تمہاری مدد کروں گا۔

میرا پیارا دوست ندیم مجھ سے ہمکلام ہے۔ جواب میں "میں" اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔

اس طرح مت دیکھو میرے دوست، میری روح کراہ اُٹھتی ہے۔ مجھے بتاؤ کس نے تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لی ہے۔ کون تمہاری راتوں کی نیند اُڑا کر لے گیا ہے۔ کیوں تم خود کو بھلانے کے لئے دنیا بھو لے جا رہے ہو۔ ندیم یہ کہتے کہتے مجھے جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ لیکن میرے ہونٹوں پر بدستور خاموشی کے قفل پڑے ہیں۔ ایک لفظ میرے ہونٹوں سے نکل کر بازار ... ہنگاموں میں گم ہو جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دل کا روگ لگا بیٹھے ہو اور یہ سوچ کر کہ تم شادی شدہ ہو پشیمانی کے سبب اندر ہی اندر گھلے جا رہے ہو۔ یہ کہہ کر وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری ہے۔ میری آنکھوں میں کسی بھی رنگین جذبے کا جھلملاتا عکس نہیں ہے۔ اس کے برعکس میری کھوئی ہوئی آنکھوں میں قبرستان جیسی ویرانی بسی ہوئی ہے میں چلتے چلتے چونک کر راہ گیروں کو دیکھتا ہوں، ہر کوئی اپنی دھن میں مست چلا جا رہا ہے کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ جب اپنی فکریں بڑھ جاتی ہیں تو انسان دوسروں کے بارے میں سوچنا بند کر دیتا ہے۔ میں کرب سے سوچتا ہوں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں تاریکی کے گہرے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ یہ تاریکی میری روح کے اندر ہے جس سے باہر کون جانے ......

اماں یار! کچھ بولو گے بھی یا نہیں۔ اِدھر بھابی میری جان کھا رہی ہیں کہ تم کیسے دوست ہو جو اپنے دوست کی پریشانی نہیں جانتے ـــــ پورا گھر تمہارے لئے پریشان ہے

مگر تم ہو کہ ......

ندیم اب بری طرح ناراض ہو گیا ہے ۔

ندیم! تم مجھے تنہا چھوڑ دو ۔۔۔ میں نہ جانے کیسے یہ الفاظ کہہ پاتا ہوں ۔۔۔

تنہا چھوڑ دوں ۔۔۔ تنہا کمرے میں بیٹھ کر سوچنے ہی میں تو تمہارا یہ حال ہوا ہے ۔۔۔ خدا کی قسم ایسے دم پاگل لگتے ہو ۔ ذرا اپنے شکن آلود کپڑوں کو دیکھو کیا تم ایسے ہی تھے ۔۔۔ مجھے بتاؤ تم کیا ڈھونڈتے رہتے ہو ۔۔۔

ندیم ...... تم ...... میں ..... میں ..... دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے میں ہچکچاتا ہوں ۔۔۔ ہاں ۔ ہاں کہو کس کی تم کو تلاش ہے ۔

مجھے ..... مجھے ..... سکون کی تلاش ہے ۔ میں جلدی سے کہہ دیتا ہوں ۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے میرا سارا جسم پسینے میں تر اور ہو جاتا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ میرا دوست یہ سن کر ایک قہقہہ لگائے گا اور میری بے وقوفی پر دل کھول کر ہنسے گا ۔ مگر میری امیدیں دم توڑتی نظر آرہی ہیں میری امید کے برخلاف وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھ کر کچھ سوچنے لگا ہے ۔

ہم لوگ چلتے چلتے ایک ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں ۔ ہوٹل بھی ویران ہے ۔ بالکل میرے دل کی طرح ..... ہم دونوں ادھر ایک کونے پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ہمارے بیٹھتے ہی ویٹر بن بلائے مہمان کی طرح ہمارے پاس آدھمکتا ہے ۔ ندیم نے چائے کا آرڈر دے دیا ہے ۔ اور میں سگریٹ سلگا لیتا ہوں ۔

تو تم کو سکون کی تلاش ہے ...... لیکن یہ اچانک تم کو سکون کا دھیان کیسے آگیا ۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے ۔ پتہ نہیں کیسے ....، بس ایک دن اچانک مجھے ایسا لگا جیسے ...... جیسے میری یہ زندگی مشینی ہے ہر وقت ہنگامے ...... ہر وقت بھیڑ بھاڑ ۔۔۔ کبھی دوستوں کی تو کبھی رشتے داروں کی اور ..... اور اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اب تک مجھے کیوں خیال نہیں آیا کہ سکون میری زندگی میں عنقا ہے اور تب ہی سے میں سکون کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں ...... مگر میری زندگی اور بھی بوجھل ہو گئی ہے ۔ میں تھکی تھکی سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیتا ہوں ۔ ویٹر چائے لے کر آیا ہے ۔ چائے کی پیالی میں سے اٹھتی ہوئی گرم گرم بھاپ اور خوشبو میری سانسوں کو معطر کر رہی ہے ۔

ندیم نے پیالی میری جانب سرکا دی ہے ۔

دیکھو دوست! یہ سکون بالکل اس بھاپ اور خوشبو کی طرح ہے جس کو تم محسوس تو کر سکتے ہو لیکن چھو نہیں سکتے ۔ اگر تم سکون چاہتے ہو تو سکون کی طرف سے غافل ہو جاؤ ۔ یقین مانو سکون اور شادمانی کے پھول خود بخود تمہاری جھولی میں آگریں گے ۔۔۔ تم جو اس قدر اداس، افسردہ اور ماحول سے کٹے کٹے پھر رہے ہو تو اسی لئے نا کہ تم سکون کے متلاشی ہو ۔ بقول تمہارے جب ہی سے تم بے سکون ہو ۔ جب تم سکون کو پانے نکلے ۔۔۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ ۔۔۔ ندیم مجھ سے پوچھتا ہے ۔

۔۔۔ اور میں چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہوں ۔ میرے ذہن کی گرہیں کھلتی جارہی ہیں ۔ یہ تو میں نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ میں سکون کی تلاش میں بے سکون ہو گیا ہوں ۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں بہت مطمئن اور خوش تھا ۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میری روح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے ۔

نہ جانے کیوں ہم کبھی کبھی خود اپنے اوپر پریشانیاں مسلط کر لیتے ہیں اور پھر انہی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے پریشان ہوتے رہتے ہیں ۔ الجھی ہوئی ڈور کا سرا میرے ہاتھوں میں آگیا ہے اور میں پھر سے پر سکون ہوتا جا رہا ہوں ۔۔۔ ▲▲

ہر تخلیق پر اپنے نام کے ساتھ اُردو میں اپنا پورا پتہ ضرور لکھئے ۔۔۔ !

اُدھا چہرہ

شمیم صادقہ
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ویمنس کالج، مریم منزل
گردنی باغ — پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

اس مخصوص پہچان نے اُسے بُری طرح چونکا دیا۔

ٹرین کھلنے ہی کو تھی۔ مسافر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ قلی نے اس کی اٹیچی کھڑکی سے اندر ڈال دی۔ جب ہی کسی کے ہاتھ نے اُسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ حیران و خجل سی اپنی منتشر سانسوں کو یکجا کر پائی تھی کہ موقعہ کی نزاکت نے اسے سنبھال لیا۔

ٹرین نے منٹوں میں رفتار پکڑ لی تھی۔

"آپ!"

"تم!" ———

دو الفاظ بہت ہی عام اور بے حد خاص، بہت روایتی اور بالکل مخصوص، اس اختصار میں کتنی تفصیل پوشیدہ تھی، وہ اس کا تصور کر کے اندر اندر کانپ گئی۔ بہت گہرائیوں کے اندر چھنا کا سا ہوا اور بہت کچھ ٹوٹ کے بکھر گیا۔ چکنا چور ہو گیا۔ کرچیں بھرا یہ وجود، وہ نہ جانے کب سے اُٹھائے اُٹھائے پھر رہی تھی۔ آج کیا ٹوٹا تھا جو کل نہ ٹوٹ چکا ہو۔ جڑنے اور بکھرنے کی یہ داستان، کچھ کہی ہوئی تھی، اور کچھ اَن کہی ———

اُسی نے اس کے لئے، لوگوں کو اِدھر اُدھر سرکا کے تھوڑی سی جگہ بنا دی تھی وہاں وہ اپنے بڑے سے ہولڈال پہ اپنا بریف کیس رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ گئی۔ اور وہ اس کے سامنے تقریباً ترچھا ہو کر کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے برتھ کی زنجیر پکڑ رکھی تھی اور پیچھے سے لوگوں کے دھکے نے اُسے تقریباً جھکا ڈالا تھا۔ اس کے بریف کیس پہ اتنی جگہ تھی کہ وہ بہ آسانی بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا جی چاہا، وہ اُسے ہمیشہ کی طرح پکار کے کہے —
"بیٹھئے تو — خوامخواہ بور دیئے جا رہے ہیں۔" مگر اس کے لب جیسے سِل گئے تھے — وہ تو یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ پہلے کی نسبت اتنا دبلا کیسے ہو گیا ہے۔ چہرے پہ وقت کے قدموں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ کتنا بدل گیا ہے۔ آج اس نے سفید بے داغ قمیص کی جگہ بے حد عامیانہ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے — وہ بس اُسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بھی تو اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں کتنے ہی سوال تھے ——— بے کل اور بے چین سے سوالات نے اس کے چہرے کے گرد

دھواں سا بکھیر ڈالا تھا ۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی یونہی رک گئی اور مسافروں کا ایک سیلاب در آیا۔ سوار ہونے والوں میں اکثریت اُجڈ لوگوں کی تھی ایک شخص تو پوری قوت سے اُسے دھکیل کر اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش میں تھا۔ اور اس کے لیے توازن قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ شدتِ ضبط سے اس کے چہرے کی نسیں کھنچ گئی تھیں۔ اس نے بے بسی سے اپنے بریف کیس کی بچی ہوئی جگہ کو دیکھا ـــ پھر اسے اور بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولی ـــ

"آپ بیٹھ جائیے۔ یہاں کافی جگہ ہے۔"

وہ چونکا ـــ اس کے ہونٹوں پہ ٹھٹھری طنزیہ مسکراہٹ اُبھری۔

"جی شکریہ ـــ اِٹس آل رائٹ۔"

وہ اس طنزیہ مسکراہٹ پر اندر اندر کھول اٹھی۔ مرد کسی خوش فہمی کا شکار رہتا ہے وہ آج تک نہیں جان سکی ـــ تو "خوش فہمی اور اہم" کا طلسم اب تک باقی ہے ـــ وہ سوچ کے جھلائی۔ ـــ پھر سنبھل گئی۔ یہ جھلاہٹ بھی کتنی لایعنی ـــ کتنی فضول اور بے وجہ تھی ـــ اُسے خود پہ ہنسی آئی ـــ اور جب خود پہ ہنسی آئے تو ہنسنا شاید گریۂ بے اختیار سے بھی معنی خیز ہوتا ہے، اچانک وہ پوچھ بیٹھا ـــ

"تم ـــ آپ ـــ اس طرح اکیلی سفر کر رہی ہیں"

وہ پھر اندر سے سلگ اُٹھی ـــ آخر حاکمانہ احساس غالب آ ہی آگیا ـــ اپنے ایک پرانے خیال کو تقویت دینے لگی وہ ـــ اس کے اندر مینرس کی شروع ہی سے زبردست کمی ہے' بے تہذیب ان کلچرڈ ـــ اس کا جی چاہا زور سے کہہ دے ـــ کسی سے ذاتی سوال کرنا بدتمیزی ہے ـــ کیا یہ حق اسے ہے کہ وہ اس کی مصروفیتوں کے متعلق کچھ پوچھے ـــ اچانک اس کا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اس نے سوچا ـــ بہرحال آج وہ اجنبی ہے۔ چار، پانچ گھنٹوں کے اس سفر کے بعد پھر نہ جانے کبھی ملاقات ہو یا نہیں ـــ شاید نہیں ـــ اُس کے اندر کی آواز نے اسے اُسی لمحے باخبر کیا ـــ زندگی ان راستوں سے کبھی نہیں گزرے گی۔ ابھی جو اتفاقاً وہ تھوڑی دیر کا ہم سفر بن گیا ہے تو شاید اسی کے انتظار کی کوئی طلب رہی ہو ـــ نافہم سی ـــ شاید وہ اس کے متعلق بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہے ـــ

لمحے وزنی سل کی طرح گر کے چکنا چور کر سکتے ہیں اور آرے کی طرح چیر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ اُسے اسی پل محسوس ہوا۔ اور اُسے لگا جیسے اس کا ریزہ ریزہ ہونا ـــ سلف منتشر ہونا۔ اس کی اہانت آمیز مسکراہٹ ـــ اُس کی طنزیہ نظر کی معنی خیزی۔ الفاظ کے دریچوں سے لاشعور کے تاریک کمروں کی تصویروں کو ٹٹولنا۔ یہ سب کتنا بے معنی ہے۔ ان گنت قیمتی لمحے اختیار سے گذر کر ماضی کے غار میں کھو چکے ہیں۔ یہ پل پھر بھی اسی تاریکی کی امانت ہے ـــ کیا وہ نہیں جانتی۔ کیا یہ محض اس کی خود فریبی نہیں تھا ـــ مگر پھر اس کی مخصوص فطرت نے جھنجھلا کے اسے بتایا ـــ یہ خود فریبی صرف اسی کی نہیں ـــ بلکہ اسی کی نہیں ہے ـــ

شاید اس کا ذہن بھی انہیں راستوں سے گذر رہا تھا۔ اس نے سوچا ـــ آج ایسا کیوں ہوا ؟ ـــ ہمیشہ تو اس کی سوچیں مخالف ہوا کرتی تھیں ـــ کیا اس نے بھی ہار مان لی ہے ؟ کیوں وہ اس کے بریف کیس کی بچی ہوئی جگہ ـــ پہ اس سے تھوڑا الگ ہو کے بیٹھ گیا ہے ـــ

اُس نے اس کی طرف دیکھا ـــ وہ بھی اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا بے چین دل بے آواز چیخ پڑا ـــ آخر تم جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھتے کیوں نہیں کہ میں تھوڑی دیر بعد اُتر جاؤں گی ـــ اس کی قربت نے فاصلے کے احساس کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ اُسے یاد آیا ـــ اکثر وہ اس کے ساتھ تانگے اور رکشے میں بیٹھتی تو قصداً جہاں اس کا

کوئی شناسا نظر آتا اس کے پاس سرک آتی اور اس کی سراسیمگی پگھلی کر نہیں پڑتی ۔۔ وہ کبھی کبھی کرکے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے چھیڑتا اور وہ راہ گیروں کی طرف اشارہ کرکے منہ چڑا دیتی ۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے ؟" اس نے سوال کیا ۔

وہ دوسری مرتبہ چونکی ۔ یہ آج بغیر الفاظ کے اس کے دل کی زبان کیسے سمجھنے لگا ۔ یہ آگہی اسے کہاں سے ملی ؟ ۔۔۔ اس کی بے چین آنکھوں کی کربناک تحریر سے ، لمحات کی گریز پائی کے درس سے یا کہ خود اس کی روح بھی اسی پل صراط پہ چلی کے آبلہ پا ہوئی جا رہی ہے ۔۔

"ٹھیک ہوں ۔۔ آپ کیسے ہیں ؟" ۔۔

" میں ٹھیک ہوں ۔۔۔ حال ہی میں ٹرانسفر ہوگیا ہے "

وہ بے حد محتاط جواب دیکر چپ ہوگیا ۔۔۔ وہ جانتی تھی وہ کتنا باتونی ہے ۔۔ بے بات کی بات نکال کو گفتگو کو ازحد دلچسپ اور مزاحیہ بنا دینے کا گر اسے آتا تھا ۔ پھر کیا آج میری طرح وہ بھی خوفزدہ ہے ۔۔ ؟

اس خوف کا سرا کیا ہے ۔۔ فاصلے کی ابتدا کب ہوئی ۔ جیسے ذرا سی دراڑ ، بہت بڑی خلیج بن گئی تھی ۔۔ واقعی لمحات سراب ہوتے ہیں ۔ اور الفاظ انسان کے سب سے بڑے دشمن ! ۔۔

"دیکھو میڈم ! ۔۔۔ میں خاصا صحت مند ہوں ۔۔ خوبصورت بھی ہوں ۔۔۔ اچھی ملازمت ہے ۔ ترقی بھی ہوگی ۔ ایسا نہ ہو ، تم میرے بدلے کسی اور کو پسند کرنے لگو "

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی تھی ۔

" بھئی ۔۔ تم ریشنسٹ ہو ۔۔ کسی کو دل سے خوش آمدید کہہ دوگی ۔۔۔ تو پھر ۔۔۔ میں ہوں بہت تنگی " ؟

"عجیب مصیبت ہے ۔ آج رش کتنی زیادہ ہے "

۔۔۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ۔۔

پھر ٹرین رک گئی ۔۔ ایک موٹے سے آدمی نے اوپر کا برتھ سے اٹیچی کھینچی تو اٹیچی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کے پیروں پر آگری ۔ اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے پیروں کو تھام لیا ۔

وہ بالکل حواس باختہ ہوگئی ۔ جلدی سے اس نے اپنے بیگ سے ایوڈکس کی شیشی ڈھونڈھ نکالی ۔ اس کے پیر کے انگوٹھے اور دوسری انگلی میں لگایا ۔ اور اپنے رومال کے دو ٹکڑے کرکے لپیٹ دیا ۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور ایسے اچانک ہوا کہ وہ خود ہی جیسے ہی گرہ لگا کے اٹھی خود سے ہی نظریں چرا کے ایک طرف سمٹ گئی ۔

وہ بھی خجل سا تھا ۔ اور بڑی مشکل سے صرف یہ کہہ سکا ۔۔

"شکریہ ! ۔۔۔ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی ۔۔

گاڑی رکی تھی ۔ وہ آہستہ سے اٹھنے لگا ۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا ۔۔

" دیکھئے ۔۔۔ میں دیکھتا ہوں ۔ شاید یہاں کافی مل جائے ۔ ورنہ چائے والے کو بلواتا ہوں "

"اوہ ۔۔ اتنی چائے مت پیو میڈم ۔۔ ہارٹ اٹیک سے مر جاؤگی تو جیتے جی میں بھی مر جاؤں گا ۔ ہاں "

"یہ جو تم کافی کی پیالی رکھے رکھے دیکھا کرتی ہو ۔ کیا سوچتی ہو ۔۔ کیا کسی کو ریسیو کرتے ہوئے خود کو ہی سونپ دیا کیا "

" پلیز ۔۔ مذاق مذاق ہوتا ہے ۔ نیوڑا کر اس نے پلٹ '

" یہ لیجئے ' ۔۔۔ اچھی چائے ملی ہے ۔ میں نے خود بنوائی ہے " ۔۔۔ اس نے کھڑکی کے پاس سے پکارا ۔ اس نے دیکھا ' چائے دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ اور پیالی خود اس کے ہاتھوں میں بھی لرز رہی تھی ۔۔۔ جیسے کہیں زلزلہ آگیا ہو ۔۔ حالاں کہ وہ بالکل ساکت اور جامد تھی ۔

اس نے خلاف عادت ٹھہر ٹھہر کے چائے پیا ۔ جیسے اس کا ایک ایک قطرہ کسی بہت ہی مشکل فلسفیانہ کتاب کے الفاظ

کی طرح ہو ـــــ پھر بھی، جو وہ سمجھ سکی، اس کا اعتراف اس کے لئے سمجھ لینے سے مشکل تر تھا۔ اُس نے پیالی واپس کر دی۔ ذرا سی دیر میں گاڑی پھر چل پڑی۔ سامنے والا آدمی اُتر چکا تھا۔ سو کوشش ذرا کم ہوا تو کھڑکی سے ہوا آنے لگی۔ اچانک ایک تیز جھونکے نے اس کا آنچل، اس کے منہ کی طرح کر دیا ـــــ

"جانتا ہوں تمہیں ہلکا گلابی رنگ بہت پسند ہے۔ جچتا بھی ہے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ دفتر میں بھی اسی کو پہن کر جاؤ" ـــــ

"آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ـــــ

"یہی کہ جتنی دیر تم باہر رہتی ہو میری جان سولی پہ ہوتی ہے" "آئی ایم ناٹ سو چیپ" ـــــ وہ تقریباً چیخ پڑی۔

اس چیخ کی گونج آج بھی اس کے اندر لرز رہی تھی ـــــ اس کا چہرہ اب بھی اس لمحے کو یاد کر کے پسینے سے بھیگ گیا ـــــ اس نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا ـــــ

"آج کتنے عرصے بعد آپ کو اس رنگ میں......"

اُس نے بات کاٹ کر کہا۔ جیسے اپنے بے ساختہ الفاظ پر شرمندہ ہو

"آپ سے ملاقات ہوئی ہے"۔

"جی ہاں ـــــ اتفاق کی بات ہے"

"آپ کی ماں تو ٹھیک ہیں نا؟" ـــــ اس نے رسمی طور پر پوچھا ـــــ

"جی شکریہ!" ـــــ

"کہاں ہیں وہ ـــــ ؟" اس نے پھر پوچھا۔

اُس نے خالی خالی نظروں سے چھت کی طرف اشارہ کیا ـــــ وہ پھر بول اُٹھی ـــــ

"وہ ختم ہو گئیں ـــــ اور آپ نے مجھے اطلاع......"

مگر پھر الفاظ گھٹ کے رہ گئے اور وہ خلا کو دیکھنے لگی۔

"بھئی ـــــ وقت یا تو دفتر کے لئے ہے یا ماں کے لئے آخران کے کرنے کے کام ہیں؟ ـــــ دانی نوکر تو ہیں ـــــ تمہیں میرے قریب تر رہنے کا عذر چاہیئے"

"ماں کی خدمت صرف ذمّہ داری تو نہیں، فرض بھی ہے"

"فرض ـــــ فرض ـــــ فرض ـــــ!" وہ پھر پسینہ خشک کر رہی تھی۔

بہت سارے نئے مسافر ارد گرد آ بیٹھے تھے۔

ایک نوعمر لڑکا ایک فلمی رسالہ دیکھ رہا تھا جس کی پشت پر کسی ایکٹرلیس کی عریاں تصویر چھپی تھی۔ دفعتاً اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"کس کلاس میں پڑھتے ہو مسٹر!"

"میٹرک کا امتحان دیا ہے"۔

"اور یہ بازاری رسالے پڑھنے لگے۔ ہم آپ سے بڑے ہیں۔ بڑوں کا لحاظ تو کرنا چاہیئے"

وہ ـــــ یکبارگی چونک اٹھی ـــــ یہ الفاظ کس کے تھے؟ ـــــ کب کے، اپنے یا مانگے کے۔

"کہو تو آج تمہارے بھائی کو یہیں سلا دوں!" ـــــ

"آپ ہوش میں تو ہیں؟"

"ارے میڈم! تھوڑی سی ٹریننگ ـــــ تم تو بگڑ گئیں ـــــ ارے بھئی، مذاق ہے ـــــ"

"یہ مذاق ہے" ـــــ وہ چیخ اُٹھی، اس کا بھائی بظاہر اخبار پڑھتا رہا ـــــ اور وہ خود اپنی پابندیوں سے اسی طرح لڑی کہ پاش پاش ہو گئی۔ ان کرچیوں کو چننا اس کے بس کا نہ تھا۔ وہ کتنی لہو لہان کتنی آبلہ پا ہو چکی تھی۔

کتنا مضحکہ خیز سوال تھا ـــــ کلچر اہم ہے یا دولت۔ بغیر دولت کے کلچر سے وہ اپنی پہچان رکھتی تھی ـــــ مگر بغیر کلچر کی دولت نے اس سے اس کی پہچان چھین لی تھی، پھر بھی وہ ان پُرخار راستوں سے اپنی بازیافت نہیں کر سکتی تھی۔

شدتِ کرب اور ضبط کی انتہا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا ـــ

نڈھال ـــ یہ بےبسی اور یہ خوف ـــ وہ اندر سے لرزہ براندام ہوگئی ـــ ٹرین پھر تیز رفتار ہوگئی تھی۔ اس کی منزل قریب آتی جارہی تھی، لمحۂ گذراں نے اسے پھر خوفزدہ کردیا۔ شاید وہاں لمحوں سے کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی ـــ فرار ـــ خودفریبی ـــ سکون ـــ نہ جانے کیا۔؟ ـــ

"آپ کی فیملی؟" ـــ وہ آخر دار پر چڑھ گئی ـــ

وہ ہنس پڑا ـــ

"میں جانتا تھا ـــ تم یہ ضرور پوچھوگی ـــ مگر شاید تم کو یہ سن کر دکھ ہو کہ میں اپنی ایک فیملی رکھتا ہوں!"

حسبِ مزاج آج بھی اس کے طنز کا وار بہت گہرا تھا ـــ

"تجھے ـــ؟"

"صرف ایک!" ـــ

اگر وہ واقعی دار پر ہوتی اور اس سے آخری خواہش پوچھی جاتی تو شاید وہ ان لمحوں کو واپس مانگ لیتی، ـــ کچھ ایسی ہی شرمندگی اور افسردگی محسوس کررہی تھی وہ حالاں کہ اس کو، ازدواجی زندگی کی خوشیوں سے اُسے کوئی واسطہ نہ تھا ـــ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ کوئی غیر مرئی طاقت اس کے الفاظ کی صدا چھین لے ـــ ایسا ہی کچھ محسوس کیا تھا اُس نے ـــ اور بدستور مسکراتی رہی ـــ

"بھئی ـــ تم چھٹیوں میں گھر جانے کا پروگرام مت بنایا کرو"

"کیوں آخر؟" ـــ

"اسلئے نہیں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس لئے کہ جب تم نہیں ہوتیں ہو میرا ذہن شکوک کے جہنم میں جلتا رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ـــ آئندہ آپ میرے بغیر ہی رہیں گے۔"

"کتنی اپ ٹو ڈیٹ تھی ٹرین ـــ ڈارلنگ تمہارے بغیر جینا محال تھا"

گاڑی کے رکتے ہی اس کے شوہر نے کھڑکی کے پاس آکر کہا ـــ اور وہ جو کہ بہت ہی کلچرڈ تھی ـــ اس بے حد بازاری اور سطحی اظہارِ محبت کے سائبان میں چھپ کر اسے بغور دیکھنے لگی کہ شاید وہ پچھتاوے کی دھوپ میں جل رہا ہو ـــ مگر اس کے ہونٹوں پر بڑی منجمد سی، تلخ سی، تیکھی سی ایک مسکراہٹ تھی۔

اس کا شوہر اسٹیشن پر سامان رکھوا رہا تھا اور وہ ایک چوڑی والے کے سامنے رک کر چوڑیاں پیک کرواتے ہوئے اسی کو دیکھ رہا تھا ـــ سرخ رنگ کی چوڑیاں نیلے کاغذ میں لپٹی جارہی تھیں ـــ اس کا جی چاہا وہ اس کے ہاتھوں سے چوڑیاں لے لے کہ یہ تو اس کا حق تھا، صرف اس کا ـــ

وہ کھینچتی چلی گئی ـــ

اس نے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھا اور پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا ـــ معاً اس کے سنجیدہ مزاج، کاروباری بڑی عمر کے شوہر کی نظر اس کے پیکٹ پر پڑی ـــ اس نے جیب سے ایک دس کا نوٹ چوڑی والے کو بڑھا دیا اور وہ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی ـــ ▲▲

اعلانِ ملکیت ماہنامہ "ہم زبان" مالیگاؤں

مقامِ اشاعت ـــ نشاط مارکیٹ سنٹر، قدوائی روڈ، مالیگاؤں

وقفۂ اشاعت ـــ ماہانہ

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر ـــ سلطان سبحانی

قومیت: ـــ ہندوستانی

میں مالک، مدیر، طابع و ناشر سلطان سبحانی اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات درست ہیں۔

دستخط سلطان سبحانی

مورخہ ۶؍ اپریل ۱۹۷۹ء

چابک بدستِ امام

سلطان سبحانی

جزیرے میں وردی پوش خود ساختہ امام نے سر ابھارا اور اپنا چابک فضا میں لہرا کر جزیرے والوں سے خطاب کیا — "میں برحق ہوں".........

"بدنہاد — بدکردار — بدہیئت!" پورا جزیرہ چیخ اٹھا۔

اس نے اپنا خطاب جاری رکھا۔

"لوگو! اس وقت پورا جزیرہ میرے محاصرے میں ہے۔ میں تمہیں راہ راست پر لے جانے کے لئے ظاہر ہوا ہوں۔ مجھے پہچانو، اگر تم لوگوں نے مجھے اپنا امام تسلیم کر لیا تو اس جزیرے میں ایک سبز سورج طلوع ہوگا جو تمہاری بے شباہت زمینوں کو ہریالیوں سے ڈھانک کر ثمر بار کر دے گا۔ یہ چابک دیکھ رہے ہو۔ یہ اژدرِ موسیٰ سے مشابہ ہے۔ اس کا اعجاز ہے کہ یہ برق کی طرح لپکتا ہے اور انسانوں کی کھال پھاڑ کر ان کی ہڈیوں پر میرا نام لکھ کر انہیں میری بیعت میں لے آتا ہے۔ یہ چابک ہی دراصل تمہارا نجات دہندہ ہے۔ اسے بھی پہچانو، اور اپنے اس پاسبان کو بھول جاؤ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تمام بکھرے ہوئے جزیروں کے درمیان اتحاد کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ اتحاد کی علامت وہ نہیں بلکہ میں ہوں۔ یہ چابک گواہ ہے۔ تمہارا وہ پاسبان تو موجِ ریگ کی مانند ہے جو اس وقت پانی کے قطرے کو ترس رہا ہے۔"

"منافق!" انسانوں کے دور تک پھیلے ہوئے کوہِ ندا میں بازگشت ہوئی — "تم یہاں یزیدیت لیکر نمودار ہوئے ہو۔ وہ سبز سورج تو صدیوں پہلے طلوع ہو چکا ہے، تم کس سورج کی بات کر رہے ہو؟ سبز سورج کے نام پر تم نے پورے جزیرے میں بارود بچھا دیا ہے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔"

اب اس وردی پوش کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کے چہرے میں چھپا ہوا ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ کھڑے ہوئے کان، آنکھوں کے گہرے گڑھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور لمبوترے چہرے پر وحشیانہ تناؤ۔

"میں فوق ہوں۔"

"ماں...... بھیڑیا!" ایک بچہ سہم کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔
"احسان فراموش!" کوہ ندا بپھر گیا۔ "نورِ حق بننے سے پہلے اپنی سیاہ کاریوں کا حساب دو!"

اچانک وردی پوش کی خونخوار آنکھوں میں دو سرخ تیلیاں سی جل اٹھیں اور اس کے دائیں بائیں سے بہت سارے فوجی بوٹ نکل کر کوہ ندا کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک شور اٹھا اور کوہ ندا منتشر ہو گیا لیکن اپنے پیچھے چند کچلی ہوئی لاشیں چھوڑ گیا جن میں کچھ لاشیں بچوں کی تھیں۔

وردی پوش نے فخر سے کہا ـــــ

"سبز سورج طلوع ہو چکا ہے۔ اب باغیوں کے حواریوں کے ہاتھ کاٹنے کا موسم شروع ہوگا۔ اب ان کے ہاتھ مذہب کے تاجروں کو نذر کئے جائیں گے۔ اب یہ چابک پورے جزیرے پہ لہرائے گا۔"

پورا جزیرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

اس تاریکی میں آہنی سلاخوں کے پیچھے میں موت کے قدموں کی آواز سن رہا ہوں۔ میرے جسم سے ایک شاخ پھوٹ نکلی ہے جس کے سرے پر ایک پتی شمع کی طرح روشن ہے۔ پوری کوٹھری میں بس اتنا ہی اجالا ہے۔ میں بیمار ہوں، میرے دانتوں سے خون رس رہا ہے۔ یہ خون وہ ہے جس نے اس جزیرے میں شادابی کی لہر دوڑا کر اسے شاندار مستقبل سے ہمکنار کر دیا تھا، یہ شاخ گواہ ہے۔ یہ خون وہ ہے جس نے اس جزیرے کو بارود، وردی اور فوجی بوٹوں اور زنجیروں سے نجات دلائی تھی۔ یہ خون وہ ہے جو ہمیشہ نسلِ آدم کی خدمت میں موجزن رہا ہے لیکن آج اس پر تہمت دھر دی گئی ہے۔ یہ شاخ مجھے کب تک سنبھالے گی۔ یہ پتی کب تک روشن رہے گی؟ ـ شاید ہمیشہ۔ میرے بعد بھی۔

مجھے پیاسا مارا جا رہا ہے۔ ہر طرح کی اذیت دی جا رہی ہے۔ کھانا، بستر، دوا، پانی وغیرہ ہر چیز سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس بیماری میں بھی مجھے وردی دار بوٹوں سے کچلا جا رہا ہے۔ طرح طرح سے خوفزدہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نظریاتی حریفوں کے تمام جلوس نکال دیئے گئے ہیں۔ ہر رات اس کوٹھری سے باہر قبر کھودی جا رہی ہے تاکہ میں گھبرا کر خودکشی کر لوں یا اس منافق اور ظالم کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں۔

یہ ناممکن ہے۔ مجھ پہ یہ شاخ سایہ فگن ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ظالم فاتح ہوا ہو۔ وادیِ نیل ...... مقامِ گولگتا ...... سرزمینِ فرات اس شاخ کو تا نگاہ دے لے سنبھال۔

یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔"

وردی پوش نے سبز سورج کے نام پر پورے جزیرے میں دھول اڑا دی۔ جزیرہ گرد و غبار میں کھو گیا۔ جب سب کی آنکھوں میں دھول بھر گئی تو سارا جزیرہ پہ چابک برسنے لگے۔ قیدخانوں کو آباد کیا جانے لگا ـــــ

"لب کھولنا جرم ہے۔ سچ کہنا جرم ہے۔" اس منظر کے پیچھے سازشوں کا ایک بہت لمبا جال بچھایا گیا تھا جو بہت دور تک چلا گیا تھا جس کا آخری سرا دیارِ مغرب میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ایک لازوال سمجھوتہ جس میں چالیس لاکھ ڈالر کی خوشبو تھی۔ خفیہ جماعت کے سربراہ کا سینہ فخر سے بھر گیا۔ "اگرچہ ہم جماعت کی آستینوں میں......

لیکن سبز سورج تو طلوع ہو رہا ہے۔ مساوی حقوق کو آخری سلام۔ بارود، وردی، بوٹ، چابک زندہ باد۔ اب محمود کی صف میں جو بھی ایاز آئے گا اسے کچل دیا جائے گا۔ یہاں نظام سبز ہے۔"

مسلط کردہ جماعتی نظام اور اس کا نقطۂ سفر لہو کے بھنور سے ذرا آگے بڑھا تو جزیرے میں خوف و ہراس احتجاج اور تشدد متصادم ہو گئے۔

وردی پوش نے پھر خطاب کیا ـــــ

"مجھے پہچان لو۔ میں چابک والا ہوں۔ میری اطاعت قبول کرو۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس چابک کی وجہ سے جزیرہ کتنا سبز ہو گیا ہے۔ میں اس جزیرے کا سب سے رحم دل، اور با اصول انسان ہوں۔ مطلق العنانی میرا شیوہ نہیں۔ معاندت، اقتدار کی ہوس

انتقام، جھوٹی شہرت، سازش، دھوکہ، ظلم، بربریت، قتل و خون یا ایسی کبھی ہے میں سراسر پاک اور مبارک ہوں۔ تمہارا پاسبان ایک ظالم انسان ہے۔ وہ قتل کے الزام میں ماخوذ ہے۔ بے انتہا غلطیوں کا مرتکب ہے اور اب اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔ یہ دنیا ہے یہاں سب کو اپنی اپنی غلطیوں کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ خواہ وہ عیسیٰؑ ہو، سقراط ہو یا منصور ہو۔ تمہارے پاسبان نے اگر مجھ پر اعتماد کیا، مجھے ترقی دی تو کیا ہوا۔ جیسے تم لوگ خونی جماعت کا سربراہ کہتے ہو اسے بھی تو تمہارے پاسبان نے پھانسی کے پھندے سے بچایا تھا۔ تو کیا یہ کوئی کارنامہ ہوگیا؟ ۔ آخر ہم لوگ بھی تو اپنا عظیم انسانی فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہم انصاف پسند ہیں۔ انصاف ہمارا ایمان ہے۔ یہ جزیرہ اگر آج بارود کی وجہ سے آتش فشاں بن گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ مکمل سبز موسم چھانے پر گلزار ابراہیم میں بھی بدل سکتا ہے۔ تم لوگ اتنے خاموش کیوں ہو؟ اتنے خشک اور بدمزہ کیوں ہوگئے؟ کیا میرے خطاب نرم و نازک کا تم پر کوئی اثر نہیں؟"

لوگ باہر نکل آئے۔

اُداس لوگ، فکرمند لوگ، مرجھائے ہوئے لوگ، آنسو والے لوگ، غصہ والے لوگ اور وہ سب آپس میں ملے تو وہاں ایک مینار بلند ہوگیا۔ کروڑوں آنکھیں، کروڑوں ہاتھ اور کروڑوں دل ——

وردی پوش کی آنکھوں میں ایک روشن دھبہ سا جھلکا۔ اس نے دیکھا کہ مینار کی سب سے بلند منزل پر جزیرے کا پاسبان کھڑا ہوا ہے، جس کے سر پر ایک شاخ سایہ فگن ہے۔

وہ غصے میں بھڑک اُٹھا —" جزیرے والو! اسے اپنی آنکھوں اور دلوں سے نیچے اُتارو۔ یہ ظالم ہے۔ مجرم ہے۔ ورنہ یہ چابک دیکھ رہے ہو" ....

مینار سے آواز آئی —— "مجرم تم ہو۔ تم سبز سورج اور سبز موسم کے نام پر سب کو سبز باغ دکھا رہے ہو۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو۔ تم عیاش اور بدکار ہو۔ تم نے اقتدار کی ہوس اور انتقام کی آگ میں جل بھن کر پاسبان کو بے گناہ پھانسا ہے۔ تم اور تمہاری خونی جماعت نے سبز سورج کی پرستش کی بجائے اس کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ تم نے اس جزیرے پر سبز موسم نہیں بلکہ سبز کفن ڈال دیا ہے۔ لیکن تمہیں علم ہونا چاہیئے۔ یہ بارود، یہ چابک، یہ فوجی بوٹ حق کو کبھی نہیں مٹا سکتے۔ بد دماغ تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ عیسیٰؑ، سقراط یا منصور غلطی پر تھے۔ کیا اس طرح تم اپنے داغ دھو سکو گے؟ ظالم تم سردار کاہن کی نسل سے تعلق رکھتے ہو۔ اس جزیرے میں نمرودیت پھیلانے کے بعد گلزار ابراہیم کی بات کر رہے ہو۔ اس خطبہ سے تو خونی جماعت کے انداز نگارش کا پتہ چلتا ہے۔ وہ خونی جماعت جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم میں فساد کھڑا کیا ہے، جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو کٹوایا۔ اور جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم کے خلاف سازش کی۔"

وردی پوش کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ اس نے چابک لہرا کر کہا —— "گستاخی بند کرو۔ میں اس جزیرے کا حاکم اور تم سب کا امام ہوں، اگرچہ داڑھی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ امام تو میں بہرحال ہوں۔ یاد رکھو۔ مجھ سے انحراف کا انجام تم سب کے لئے موت ہے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ مُلک کا حاکم خدا ہوتا ہے۔"

مینار سے کروڑوں آوازیں اُبھریں۔

"تم جیسا خود ساختہ خدا نیل میں غرق ہو جاتا ہے۔ آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے اور پتھروں میں دب کر دفن ہو جاتا ہے۔ تمہاری خدائی پر آخ تھو —— آخ تھو!"

مینار پھیل گیا اور پانی کی لہروں کی طرح لچکتا ہوا شاہراہوں پر نکل گیا۔ اور رات میں جب سارا جزیرہ سو گیا تو فوجی بوٹ گلیوں میں پھیل گئے۔ اور سوتے ہوئے لوگوں کو چن چن کر سلاخوں کے حوالے کرنے لگے۔

ساری دنیا کی نظر جزیرے پر مرکوز ہو گئی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک قیدی کو بچانے کے لئے پوری دنیا حرکت میں آگئی۔ اتنا عظیم قیدی کہ تاریخ بھی حیران۔ یہاں تک کہ دیارِ مغرب سے بھی نامہ و پیام چلے۔ شاہوں کے بھی کاغذی گھوڑے دوڑے۔

اور گھوڑے ہنہناتے ہوئے وردی پوش کے بارود خانے میں گھس گئے۔

اس نے دیکھا ہر گھوڑے پر پاسبان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر ایک شاخ ہے جو تلوار کی طرح لپک رہی ہے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا۔ پھر اسے اپنے چاروں طرف پاسبان کی بھیڑ نظر آنے لگی۔ ہر بلند شئے میں اسے پاسبان کا ہیولا دکھائی دینے لگا اور ایک چمکتی ہوئی تلوار۔

جزیرے سے قریب ہی ایک دوسرے جزیرے میں ایک بوڑھی عورت کچھ بچوں کو ایک ظالم بادشاہ کی کہانی سنا رہی تھی —
...... "تو بچو! جو سب کی نیند حرام کر دیتا ہے وہ خود بھی نیند کو ترس ترس جاتا ہے ...."

میں سلاخوں کے پیچھے زخم اور تکلیف سے بدحال پڑا ہوں۔
ابھی کچھ دیر پہلے سفید لباس میں پانچ خاکی بھیڑیئے چابک لیکر مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مجھے ختم کرنے کی کتنی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ میرے جسم سے چالیس کلو خون اور گوشت کم کر دیئے گئے ہیں۔ اس تنگ سی کوٹھری میں بھی مجھے وزن دار فولادی زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا ہے۔ میں بیمار ہوں لیکن میرے ساتھ اتنا بہیمانہ رویہ۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا جو ہمیشہ سچ کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ جھوٹے مقدمے، جھوٹی عدالت، جھوٹے گواہ، انصاف کو قتل کرنے کے لئے کیسے کیسے سامان پھیلائے گئے ہیں۔ وہ حاکم ہو کر آج فقیر سے بھی بدنصیب ہے کہ چاہتا ہے میں اس سے رحم کی بھیک لے لوں۔ کتنا محتاج ہے وہ میرے سامنے۔ مجھے دار پر چڑھایا جائے گا۔ میری سانسوں کی طناب توڑ دی جائے گی۔ میرا وجود مٹا دیا جائے گا لیکن میں تو کروڑوں دلوں میں زندہ ہوں۔ یہ شاخ گواہ ہے کہ دلوں میں بسے ہوئے لوگ کبھی نہیں مرتے۔

.... اور شاخ نے دیکھا کہ خونی جماعت کے سربراہ کے ایک حاشیہ بردار نے بارود خانہ میں حاضر ہو کر وردی پوش کو سلامی دی، سجدہ کیا اور فضا میں انگلی سے ایک نشان بنایا۔ کچھ ہی دیر میں وردی پوش کے چہرے میں چھپا ہوا دوسرا چہرہ ابھر آیا اور خونخوار آنکھوں میں دو سرخ بتیاں سی جل اٹھیں۔

مجھ سے آخری خواہش پوچھی گئی ہے لیکن رحم کی بھیک لے کر کھڑے ہوئے دریوزہ گر کو میں آخری خواہش سے بھی محروم ہی رکھوں گا۔ سچائی، بے گناہی اور انصاف کو قتل کرنے والے بے رحم اور سفاک کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہیں ہونے دوں گا۔ میں جھوٹ، فریب اور ظلم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ .... یہ لوگ اب مجھے مار ڈالیں گے۔
.... اب میں رخصت ہونے والا ہوں۔ اے شاخ ......
اس جزیرے کو اپنی پناہ میں لے، اس کی حفاظت کر۔ ایک مظلوم انسان اپنا اثاثہ اور اپنے ایمان کا حصہ تجھے سونپ رہا ہے ....
کانوں میں اذان کی آواز گونجنے لگی
اور جزیرے کے ایک گوشے میں [illegible] کے نیچے بائیبل کا ایک ورق ہوا سے پھڑپھڑانے لگا۔

........" اور سردار کاہن اور سب صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے لئے، اس کے خلاف گواہیاں ڈھونڈنے لگے، مگر نہ پائی کیوں کہ بہتیروں نے اس پر جھوٹی گواہیاں تو دیں لیکن ان کی گواہیاں متفق نہ تھیں۔"

میں شاخ سے کہہ رہا ہوں۔

"یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی..."
اور دنیا کا پہلا واقعہ تھا کہ سورج رات کے ڈھائی بجے ہی طلوع ہو گیا۔
ایک سفید چمکتا ہوا گھوڑا ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور ایک بیج کو سمیٹ کر جزیرے سے بلند ہوتا گیا۔

اور یہ دنیا کا پہلا اتفاق تھا کہ کسی کے گھر میں موت ہو گئی اور میت کی خبر سات سمندر پار سے آئی۔

"ذرا اپنے گھر میں دیکھو تمہارا کوئی عزیز جل بسا ہے۔"

"دنیا کا سب سے شرمناک، ذلیل اور بدترین واقعہ ....."

لوگ چیختے ہوئے، روتے ہوئے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ پورا جزیرہ دھاڑیں مار مار کر رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ کوہ آتش فشاں کھڑے ہو گئے۔

"وردی پوش کتے! کیا یہی ہے تمہارا سبز سورج۔ تم نے اتنا ظلم کیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ بھیڑیئے! تم نے دنیا کے تمام امن پسند انسانوں کا کلیجہ پھاڑ دیا ہے۔ ایک بے گناہ پر ڈیڑھ سال تک ظلم کیا اور اسے رات کے اندھیرے میں اس طرح مار ڈالا کہ کسی کو خبر تک نہیں ہو سکی۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ اتنی بڑی سازش۔ ذلیل کتے! کیا یہی ہے تمہارا نظام سرسبز۔ ظالم تم نے کسی ایک فرد کو نہیں بلکہ پوری ایک نسل کو، پوری ایک قوم کو قتل کر ڈالا۔ ایک ایک بچے کو شہید کیا ہے۔ لکھ لو کہ یہ خون ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔"

پہاڑ دہکنے لگے۔ گھروں سے عورتیں اور بچے بھی نکل آئے۔ روتے تڑپتے، اور بلکتے ہوئے اور وہ بھی پہاڑوں میں شامل ہو گئے۔ شاہراہوں پر شور مچ گیا ایسا شور جیسے طوفان میں پھنسا ہوا جہاز ڈوب رہا ہو۔ ذبح کئے پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے لوگ۔

اچانک ہر طرف سے وردی والے ٹوٹ اور چابک نکل آئے۔ ماتم کرنے والوں کی کھالیں ادھیڑی جانے لگیں .... بوٹوں سے کچلا جانے لگا۔ سڑکوں پر بے دردی سے گھسیٹا جانے لگا۔ عورتوں اور بچوں کی کھالیں بھی ادھیڑ دی گئیں۔

ایک بوڑھے عیسائی نے اپنے کمسن بیٹے سے کہا۔

"اور بیٹے، یسوع کو گرفتار کرانے کے صلہ میں اس کے شاگرد یہوداہ کو صرف، تیس روپے ملے تھے ...."

وردی پوشوں نے کہا — "نہیں حق پر ہوں۔ میں نے سب کچھ بہت سچ کیا ہے۔ اس جزیرے پر اب مکمل سبز نظام چھا چکا ہے۔"

میں مر چکا ہوں لیکن دیکھ رہا ہوں۔ میری قبر کے گرد سنگینیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ چاروں طرف باوردی بدن ایستادہ ہو گئے ہیں۔ میرا آخری دیدار تو کیا کوئی میری قبر کا دیدار بھی نہیں کر سکتا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میری موت کے بعد بھی مجھ سے اتنی دشمنی ہے کہ صحیفۂ آسمانی کی تلاوت پر پابندی لگ گئی ہے۔ لوگوں کو سجدہ میں زخمی کیا جا رہا ہے۔ میدانوں پر پہرے لگا دیئے گئے ہیں تاکہ کوئی سجدہ نہ کرے ورنہ میری روح کو ثواب پہنچے گا۔ یہ نظامِ سبز نہیں ہے اس کا سفاکانہ قتل ہے۔

لوگ غم و غصہ میں پاگل سے ہو گئے۔ ایک تیز آگ سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ایک زبردست آگ، اور اس آگ نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ ان گنت عمارتوں کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔

"وردی پوش امام! اب تمہارا انجام ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اب ہم تمہیں چین سے جینے نہیں دیں گے۔ اس طوفان کی راہ میں جو بھی حائل ہو گا خاک کر دیا جائے گا .... یہ طوفان اب رک نہیں سکتا۔ بڑھتا رہے گا .... پھیلتا رہے گا ....
.... یہ وہ طوفان ہے جس کا دوسرا نام عوام ہے اور اب تمہارا مقدر ہمارے ہاتھ میں ہے ...."

جزیرے سے ہزاروں میل دور ایک بچی نے اپنی ماں سے پوچھا ——

"ماں ذوالفقار کسے کہتے ہیں؟"

"بیٹی ذوالفقار حضرت علی رضؓ کی تلوار کا نام تھا جو ہمیشہ ظالموں کی صفیں الٹتی رہی اور شاید ابد تک ظالموں کے تعاقب میں رہے گی ——"

▲▲

احتساب

تبصرے ہم زبان کے لئے کچھ ذریعۂ عزت یا ذریعۂ شہرت نہیں ہیں اسلئے اس میں شائع ہونے والے تبصرے ذاتی تعصب، ہم عصری رقابت یا خود ساختہ تنقیدی برتری سے پاک ہیں۔ "احتساب" قتل گاہ نہیں بلکہ تخلیق کے حسن و قبح کو سمجھنے، سمجھانے اور ابھارنے کا پرخلوص گوشہ ہے۔

تنقیدی تناظر

تنقیدی مضامین ــــــ ڈاکٹر قمر رئیس
قیمت ــــــ بیس روپیے
پتہ ــــــ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ

ادب کے کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانا اور اس کا پورا پورا حق ادا کرنا بڑا مشکل کام ہے اس سے زیادہ مشکل امر کسی اہم شخصیت اور اس کے کارناموں کا نہایت انہماک اور دقتِ نظر سے تجزیہ پیش کرنا۔

کوئی شاعر ہو یا ادیب یا مصور، جب اپنے افکار و خیالات یا تاثرات کو نئی اور اچھوتی شکل دیتا ہے تو اس کی پہچان تو بن جاتی ہیں لیکن اس کے یہاں فکر میں تنوع، صلابت اور بلند آہنگی نہ ہو تو اس کا فن پارہ اپنی تجسیم کے وسیلے سے بڑے کارآکر بھی، ادب اور آرٹ کی سربلندی کا باعث نہیں بن پاتا۔

ڈاکٹر قمر رئیس کا نیا مجموعۂ مضامین "تنقیدی تناظر" مدیر "ہم زبان" نے تبصرہ کے لئے مجھے دیا تو سب سے پہلے میں نے اس کے عنوانات دیکھے۔ غالبؔ، اقبالؔ، جاد، نثار اختر، سید احتشام حسین، کرشن چندر اور سجاد ظہیر جیسی بلند قامت شخصیتوں کے ناموں پر نظر پڑی تو گمان ہوا کہ بار بار کا سنا ہوا یہ راگ نئے لَے میں ہی سہی جتنا بجے گا بھدا ہی معلوم ہوگا۔ بالفاظِ دیگر مصنف کی آواز میں اردو کے دوسرے معتبر نقادانِ فن کی آواز کا ارتعاش، زیر و بم یا اس کی تھوڑی بہت گونج تو ضرور ہی سنائی دے جائے گی۔ لیکن بہ نظر غائر مطالعہ نے اس کی نفی کر دی اور بے ساختہ یہ کہنا پڑا کہ محولا بالا شخصیات کے ادبی کارناموں پر انہوں نے جس خوبی سے قلم اٹھایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور ایک ایسی انفرادی طرزِ نگارش سے عبارت ہے جو مروجہ طرزِ تنقید کی سطح سے بلند ہو کر فکر و فن کے ان ہفت خواں طے کئے ہوئے اکابرینِ ادب کے فن اور ان کی شخصیتوں کا صحیح جائزہ ہی نہیں پیش کرتی بلکہ مصنف کو اربابِ نقد و نظر کے زمرہ میں ایک امتیازی حیثیت بھی دیتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ دعویٰ کتنا مدلل ہے کہ ـــ

"ادب کا تنقیدی مطالعہ ادب کے تہذیبی اور عمرانی تناظر میں ہی ان سچائیوں تک رسائی حاصل کرتا ہے جو کسی بھی عہد کے ادب کو دوسرے عہد کے ادب سے متمائز کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے "تنقیدی تناظر" تہذیبی اور عمرانی "تناظر" سے علیحدہ اپنا وجود نہیں رکھتا۔ کسی بھی فن پارہ کے تنقیدی مطالعہ میں، ناگزیر طور پر ان داخلی اور خارجی عوامل کا مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے جن کے زیرِ اثر وہ اپنی مخصوص اور منفرد ہیئت میں معرضِ وجود میں آیا۔" ہر تخلیق اپنے

سماجی، تہذیبی اور شخصی تناظر میں بھی ایک آزاد ادبی اظہار کی حیثیت سے اپنا اور اپنے خالق کا اثبات کرتی ہے۔ اس کی قوت کے سارے آثار اسی تناظر سے ماخوذ اور مستعار ہوتے ہیں، اس میں جو فکری صداقتیں ہوتی ہیں، جو تخیل اور تجربات رنگ بھرتے ہیں، نقاد ان کو دریافت کیے بغیر اپنے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ اس مجموعہ کے وقیع اور کامیاب مضامین اپنے منتخبہ فنکاروں کے ادبی سرمایہ کو اصل روپ میں کچھ اس فنکارانہ طور پر اجاگر کرتے ہیں کہ وہ اپنے افکار و فن کے ساتھ زندہ و متحرک نظر آتے ہیں، اس اعتبار سے اس کا نام ــ "تنقیدی تناظر" صد فیصد موزوں اور اسم بامسمّٰی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس ایک اچھے اور کامیاب تنقید نگار ہیں۔ مخلص اور دیانتدار بھی۔ دراصل تنقید وہی ہوتی ہے جو تعلق و تعصب کی سطح سے بلند ہو ــــ "کرشن چندر ــ ایک جائزہ" اور "عمیق حنفی ــــ ایک مطالعہ" ان کی وسیع النظری کی اور دیانتداری کی بہترین مثال ہے۔ ساتھ ہی یہ سارے مضامین "اردو افسانہ کی نصف صدی"، "اردو افسانے میں انگارے کی روایت"، "جدید اردو ناول میں اظہار و اسلوب کے تجربے"، "ترقی پسند تحریک اور اردو ناول" اور "عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح" تمام فرضی نظریات و تصورات سے دور اپنے اندر جو ٹھوس اور تاریخی حقائق [illegible] رکھتے ہیں وہ تنقیدی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور [illegible] تاثرات سے [illegible] ــــ "تنقیدی تناظر" کا پہلا مقالہ [illegible] اردو [illegible] جدید غزل [illegible] ہے جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ [illegible] جدید اردو غزل [illegible] ناقدین [illegible] کلاسیکی غزل [illegible] آہنگ کی [illegible] دو رنگوں نے ڈوبتے ابھرتے اور تحلیل ہو کر [illegible] میں [illegible] تجربے [illegible] اس تجزیے کے بعد انہوں نے جدید [illegible] امیر و داغ اور ان کے تلامذہ اور مقلدین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول کے اس سرمایہ غزل کو اپنے آرٹ، اپنے اسلوب اور مجموعی آہنگ کے اعتبار سے کلاسیکی روایات کی تجدید و توسیع تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس پر جدید کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ بالعموم ان کے کارناموں کو قابل قدر مانتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ اس سرمایہ غزل میں عصری حقیقتوں کا احساس و عرفان یا تو یا تو نہیں ملتا یا اگر ملتا ہے تو بے حد سرسری اور سطحی۔ انہوں (تلامذہ امیر و داغ) نے غزل میں حسن ادا اور زبان و بیان کے فنکارانہ استعمال کے امکانات کو تلاش کیا اور درجہ کمال تک پہنچایا پھر بھی اسے جدید غزل کی روایت کا حصہ سمجھنا درست نہیں۔ جدید غزل سے میر کے مقابلے میں غالب کا رشتہ نسبتاً کچھ پیچیدہ اور پہلو دار رہا ہے۔ اس کی ایک [illegible] یہی ہے کہ بیسویں صدی میں غالب کی بازیافت [illegible] اجتماعی محرکات کے تحت مختلف حلقوں میں اور مختلف سطحوں پر ہوئی ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں ڈاکٹر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ غالب نے اپنے آپ کو [illegible] اعتراف [illegible] کیا ہے۔ یہاں غالب کو میر سے موازنہ کرتے ہوئے [illegible] بات کہہ گئے ہیں [illegible] بھی [illegible] غالب کے اسلوب فن کے مختلف اجزاء و عناصر کو الگ الگ سمجھنا [illegible] اور برتنا جتنا آسان رہا ہے غالب کے فن کی انفرادیت کو ایک وحدت کی صورت میں پانا اور اس کی پیروی کرنا اتنا ہی مشکل۔ اس موازنہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب جدید غزل کے اولین معمار ہیں اور یہ بات تاریخی نقطہ نگاہ سے اسی حد تک صحیح ہے جس حد تک یہ کہنا کہ حالی جدید نظم کے پیشرو ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کے کلام میں عصری حقیقتوں کے عرفان نے غزل اور نظم کے ایک نئے موڑ کی بشارت دی ہے۔ حالی کے بعد کے ممتاز اور منفرد شعراء مثلاً یگانہ، اصغر، فانی، حسرت اور اثر لکھنوی کے حوالے سے بھی مصنف نے اس "رشتہ" کی بخوبی وضاحت کی ہے جو جدید اردو غزل سے غالب کا رہا ہے۔

"تنقیدی تناظر" کے بقیہ مضامین "سید احتشام حسین اور عصری تنقید کے مسائل" "اقبال کا تصورِ وطن و آزادی" "سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک" اور جان نثار اختر کی طویل نظمیں" بڑے پُرمغز مضامین ہیں اور کئی اعتبارات سے بہت ہی اہم۔ ادب کی ماہیت، انسانی سماج اور تہذیب میں اس کی اہمیت و غایت، مختلف ادبی رجحانات و تحریکات اور ادب پر اثر انداز ہونے والے تاریخی عوامل کی نوعیتوں پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہیں۔ جن پر علیحدہ سے بہ شکل مضمون اپنے تاثرات کا اظہار کیا جائے تو شاید ان کا کسی قدر حق بھی ادا کیا جا سکے۔ تبصرہ کا یہ کالم اس کا متحمل کہاں؟

عتیق احمد عتیق

بھیگا ہوا کاغذ

مجموعۂ غزلیات — ممتاز راشد

قیمت — دس روپے

ملنے کا پتہ — ہ ۔ کے پبلیکیشنز — ۲۰۰۲ پرتاپ اسٹریٹ، گولا مارکیٹ — دریا گنج نئی دہلی — ۲

بھیگا ہوا کاغذ کا مصنف ممتاز راشد دراصل ؎

دل کے زخموں سے سوز نم لیکر
آنکھیں ٹپکا گیا ہے کاغذ پر

چنانچہ ظاہر ہے کہ اس کے اس کاغذِ نم کی کسی بھی تحریر کو مٹانے کے لئے اگر آگ بھی دکھا دی جائے تب بھی وہ کارگر نہ ہوگی بلکہ اس کی تحریر کا رنگ جلنے یا ہلکا ہونے کے دھواں دیکر کچھ اور گہرا، کچھ اور نمایاں ہو کر رہے گا۔

اس کا یہ شعر ؎

کوئی تحریر مٹائیں تو دھواں اٹھتا ہے
دل وہ بھیگا ہوا کاغذ ہے کہ جلتا ہی نہیں

اس کی شعری تصنیف پر بجائے خود ایک بھرپور اور ناقابلِ تردید تبصرہ ہے، کہیں سے بھی کتاب کھولیے، کوئی بھی ورق اُلٹئے اور پڑھئے اس کا ایک ایک شعر اپنے فکر و خیال کی نئی سمتوں، اور نئی وادیوں ہی کی سیر کراتا ہے۔ یہ سمتیں کہیں کہیں بے رنگ و نور اور یہ وادیاں لق و دق صحرا کی طرح بے آب و گیاہ بھی ملتی ہیں۔ لیکن وہ بہر رنگ اپنا جواب آپ ہیں۔ دیکھئے بھیگے ہوئے کاغذ کی کچھ رنگا رنگ تحریریں اور ان کے بکھرے ہوئے رنگوں کے لہریئے بھی تاکہ آپ جان سکیں کہ راشد ان میں کہاں ڈوبا اور کہاں اُبھرا ؎

کوئی تو میرے وجود کی سرحدیں بتائے
بھٹک رہا ہوں میں کب سے اپنی ہی وسعتوں میں

یوں دیکھتی ہے گذشتہ لمحوں کے موڑ سے
اس زندگی سے جیسے کوئی واسطہ نہیں

پتوں کے ٹوٹنے کی صدا گھٹ کے رہ گئی
جنگل میں دور دور ہوا کا پتہ نہ تھا

نغموں کا چاند تیرے لبوں میں اُتر گیا
ظلمت کی جھیل تیری صدا سے سمٹ گئی

بے برگ و بار جان کے جس کو گرا دیا
وہ آخری درخت چمن کا سہاگ تھا

کوئی نہ نکلا اندھیروں کے خوف سے ورنہ
مری صدا سے بہت دور تک اُجالے گئے

تمام دور کی لہریں حقیقی خواب کی صورت
بھاگتی پیاس سرابوں میں ڈوب جاتے گیا

جناب مخمور سعیدی نے غالباً اسی قبیل کے اشعار سے متاثر ہو کر ممتاز راشد کی شاعری کو ان کی داخلی کیفیات کی پروردہ اور ان کی آواز کو جدید غزل کی ایک معتبر آواز قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اس کا شعریت سے مالا مال ہونا ہے اور میری رائے میں یہ وصف انہیں ان کے بہت سے ہمعصروں سے ممتاز کرتا ہے جن کے ہاں اور تو بہت کچھ مل جائے گا مثلاً عصری آگہی، عصری حسیت وغیرہ وغیرہ — لیکن شعریت کا فقدان نظر آئے گا۔ شعریت کا سرچشمہ شاعر کے قلبی احساسات و جذبات

ہوا کرتے ہیں' وہ اُن احساسات و جذبات کے تئیں جتنا مخلص ہوگا ان کے اظہار میں جتنا صادق ہوگا اس کی آواز اتنی ہی شعریت کی حامل ہوگی ۔

تنقیدی فارمولوں کو سامنے رکھ کر شعر کہنے والوں کی رسائی اس سرچشمے تک کبھی ہوتی ہے نہ ہو سکے گی ۔ اور یہ رویہ ہمارے یہاں جتنی عام ہوتا جا رہا ہے' شاعری سے شعریت کے اخراج کا عمل بھی زور پکڑ رہا ہے ۔ شاعری بالخصوص غزل کے سچے قدر شناس ممتاز راشد کو داد اور مبارکباد دیں گے کہ وہ اس وبائے عام کا شکار نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنے کلام کو ان حالات و کوائف کی بے روح کھتونی نہیں بنایا جو خود ان پر نہیں گذرے صرف دوسروں کے بیان کردہ ہیں ــــــ"

جدت طرازی حصارِ روایات میں محدود رہ کر اگر ممکن نہیں تو علم و ادب کے ضابطوں کو برقرار نہ رکھ کر فن کو کمال کا درجہ بھی ہرگز ہرگز نہیں دیا جا سکتا ــــــ۔

عتیق احمد عتیق

شب گرد

اُردو پیکر ــــــ حمید الماس

سفحات ــــ ۹۶، مجلد

قیمت ــــ دس روپئے

ملنے کا پتہ : ۔ حمید الماس ۱۳۵۵ - بی' ٹوان بلاک جے نگر بنگلور

ہندوستان میں بولی جانے والی بہت سی زبانوں میں ایک کنڑا بھی ہے جو ادبی جواہر پاروں سے مالا مال ہے ۔ اور صندل کی طرح مہکتی ہوئی سرزمین کرناٹک کی بہا آفریں روایات کی امین ہے ۔ فطرت کے اسی حسین گہوارے میں اس کی نشوونما ہوئی اور شعر و ادب کے دہکتے اور مہکتے ہوئے گل بوٹوں نے سے وہ یکبارگی تازگی اور دلکشی عطا کی کہ یہ تنوع اور نگارنگی کے خوبصورت پیکر میں ڈھل گئی ۔

برٹش انسائیکلوپیڈیا میں اس کو کسانوں کی زبان کہا گیا ہے مگر یہ صدیوں کے طویل فاصلوں اور زمانے کی آتشیں گردشوں سے ہوتی ہوئی اب دلنواز وادی میں داخل ہوگئی ہے جہاں تہذیب و تمدن اور معیشت و معاشرت کی اعلیٰ قدریں اس کا استقبال کر رہی ہیں ۔

پست و بلند کے بکھیڑوں اور اونچ نیچ کی پگڈنڈیوں سے گذر کر اس زبان کے دانشوروں نے جو حسین لب و لہجہ اور دلکش اسلوب اختیار کیا ہے شب گرد اسی کا مرقع اور منہ بولتی تصویر ہے ۔

اس میں کنڑا کے ۱۷ شاعروں کی ۲۵ تخلیقات ہیں جن کا تمام تر تعلق جدید رنگ و آہنگ اور لہجہ کی نئی تراش خراش سے ہے ۔

یہ درست ہے کہ ہماری زبان سے اس کا کوئی تال میل نہیں' مذاق و مزاج میں بین فرق ہے حالات و ماحول بھی جداگانہ ہیں لیکن جہاں تک عصری حسیت' خود آگہی' اور ذوق جمال کا تعلق ہے دونوں کی سطح برابر ہے ۔ تشبیہات' تلمیحات' استعارات' اور روایتیں الگ الگ ہونے کے باوجود حمید الماس نے کچھ اس ادا اور بانکپن سے انہیں "نظمایا" ہے کہ انداز فکر میں کوئی دوئی نہیں معلوم ہوتی ۔ یک رنگی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور یہ ترجمے کی بڑی خوبی ہے ۔

اُردو کی طرح اس زبان پر بھی ترقی پسند شاعروں کا قبضہ تھا ۔ اس دور کی بہت سی نظمیں یادگار ہیں ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سامراجی نظام کے خلاف کنڑا شاعروں نے بھی علی الاعلان آزادی کے مطالبہ کو شعری پیکر عطا کیا تا اینکہ بساطِ سیاست الٹ گئی ۔ اور ہمارے چمن میں نئی بہاریں آئیں ۔ بعد ازاں اس زبان کے ممتاز شاعر ڈاکٹر گوکاک نے اسے نیا موڑ دیا ۔ موصوف نے حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ " ادب کو خارجی حالات کے اثر و نفوذ سے بچاتے ہوئے

فن کی داخلی اور باطنی ماہیت اور اس کے جمالیاتی اور
تخلیقی عمل کے توسط سے تہذیب و روایت کو سمجھنے کی
ضرورت ہے ۔"

کہتے ہیں آپ کی یہی تقریر جدید شاعری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور نئی نسل کو قوت پرواز ملی۔ شکست و ریخت، ترسیل و ابلاغ، ذات و صفات، حرکت و عمل اور لب و لہجہ کی تہہ داری نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے۔ مگر نئے حوصلوں اور نئی تمناؤں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ اب انہیں نہ صرف خود کلامی اور داخلی علامتوں کے اظہار کا شعری وسیلہ اور سلیقہ حاصل ہوا بلکہ وجودیت اور انکشاف ذات کے پیچیدہ مسائل کا سراغ بھی مل گیا۔ وہ نظمیں جو، ان مصرعوں کے ساتھ شروع ہوتی ہیں فکر و تخیل کا ایک نیا عالم دکھاتی ہیں۔ مثلاً

نظر اٹھا کے دیکھئے ـــــ (بیندرے)
زندگانی ہوئی ریل غائب ہوئی ـــــ (پٹیا)
سُن کے طاری صدائے دلفریب ـــ (نرسا چار)
درد کی شعلہ فشانی ہے مرے سینے میں ـــ (گوکاک)
بھیانک تیرگی میں ـــــ (گوپال کرشنا اڈیگا)

پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نئے دور کا جدید بانکپن اور نیا رنگ روپ انہیں شعرا کی دین ہے۔ ان شاعروں نے اپنی دھرتی، اس کی بو باس، اس کا زرعی نظام، روشن روایتیں، جگمگاتی فضائیں، بولتے موسم اور سوندھی سوندھی کالی مٹی کی شگفتگی کو دامن فکر و فن میں سمیٹ لیا ہے۔ گو بعض شاعروں کے کلام کی زیادتی گراں معلوم ہو گی اس لحاظ سے بار خاطر نہ ہو گی کہ

ان نظموں کے انتخاب میں ذاتی پسند، شاعروں سے ذہنی قربت اور باہمی مراسم کا دخل ہے ورنہ کچھ شاعروں کی نظمیں زیادہ تعداد میں نہ ہوتیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ایوان شاعری میں ان نظموں کی گونج اکثر سنائی دیتی ہے۔ اور یہ نظمیں مختلف رجحانات کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ تین مختصر نظمیں دیکھئے ۔

(۱) تیرہ و تار گپھاؤں سے گزرتے جاؤ
وقت ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا کبھی
ہر طرف
خوف کے سائے ہیں مگر
تم کو چلنا ہے چلو
اور بڑھو
اور بڑھو ـــــ (ستیاپابھی)

(۲) مجھے ساری دنیا کے حالات کا علم ہے
مرے روبرو
جو کبھی ہوتا ہے
اس کی خبر ہے
مگر میرے اندر جو جوہر ہے
میں اس کے عرفان سے محروم ہوں ـــــ (ونائی جی بھٹ)

(۳) آسماں ہے ترا کرم گویا
یہ زمیں ہے کہ
بددعا تیری
اور دونوں کے بیچ
میرا گھر ـــــ (چندر کانت کسنور)

ان نظموں کے علاوہ اور بہت سی نظمیں شب گرد کی اہمیت بڑھا رہی ہیں۔ طوالت کے خوف سے نظر انداز کر رہا ہوں ورنہ اس مجموعہ میں کیا نہیں۔ منظومات خوب سے خوب تر ہیں۔ رہا ترجمہ کا معاملہ اس کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ اردو کے خوش فکر شاعر جناب حمید الماس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے کنڑا شاعری پر موصوف کی ایک اور کتاب "فردوات" کے عنوان سے چھپ کر مقبول ہو چکی ہے۔ امید ہے شب گرد بھی اردو کے تمام حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

کتاب کا ٹائٹل نہایت سادہ ہے لیکن علامتوں سے خالی نہیں۔ آخر میں کئی شاعروں کا مختصر تعارف بہت خوب ہے۔ کتابت اور طباعت بھی پسندیدہ اور قابلِ دید ہے۔ قارئین سے مطالعہ کی درخواست ہے۔

حفیظ مالیگانوی

نقطے اور لکیریں

شاعر —— امین تابش

صفحات —— ۱۱۴ مجلد

قیمت —— ۸ روپے

ملنے کا پتہ:- امین تابش، ۱۷۸، جی، بی روڈ، باندرہ - بمبئی نمبر ۵۰

یہ اقتضائے کتابِ حیات ہے تابش
مطالعہ سو تماشائے سرسری کیلئے

تماشائے سرسری سے بلند ہو کر واقعی جب کتابِ حیات کا مطالعہ کیا جائے گا تو ماننا پڑے گا کہ ادبی دنیا میں مالیگاؤں کے جن شعرائے کرام نے علوئے فکر اور تابشِ خیال کی مشعلیں فروزاں کی ہیں ان میں امین تابش بھی ہیں۔ اور ایک طویل زمانے سے گیسوئے ادب سنوارنے میں مصروف ہیں۔ نگارشات نہ صرف ادبی رسالوں میں باریاب ہیں بلکہ اخبارات و رسائل کے صفحات کی زینت بھی بنتی ہیں۔ ساتھ ہی شہرت و ناموری کا باعث بھی۔

ترقی پسند شاعروں کی طرح ان کی نگاہیں بھی محض کربِ ذات تک محدود نہیں، حالات و ماحول کے ساتھ وہ بدلتی ہوئی عالمگیر قدروں کا بھی ادراک رکھتے ہیں اور ادب کو ماورائے زندگی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ البتہ حقائق و معارف کے جلو میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جن کا تعلق علمِ کائنات سے کم اور غمِ دل سے زیادہ ہوتا ہے، عرفِ عام میں جسے محبت کہا جاتا ہے۔ امین تابش کا موضوعِ خاص ہے وہ اسی کے اردگرد اپنا شیش محل تعمیر کرتے ہیں ـــ اور اسی کی فضا میں گم رہتے ہیں۔ ؎

یہ کون آ رہا ہے برسنے لگے ہیں پھول
منظر تمام راہوں کے گل پوش ہو گئے

دل نے یہ کس مقام پہ پہنچا دیا مجھے
تاروں کی روشنی بھی ہے برقِ بلا مجھے

خوابوں کا اک ہجوم لئے اپنے ساتھ ساتھ
نیندوں کی وادیوں سے گذرنے لگی ہے رات

دیوار کے، اشجار کے سائے تو بہت ہیں
لیکن کوئی سایہ ترے آنچل کی طرح ہے؟

آواز جن کے کانوں میں رس گھولتی رہی
تابش کے شعروں میں انہی گیتوں کے بول ہیں

نقطے اور لکیریں اسی محبت کی آئینہ دار ہے اور اسی کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جدیدیت کے اس دور میں ہمارے ادب کو ایسے افکار و اشعار کی ضرورت نہیں جو لوریاں سنائیں اور خواب کی وادیوں میں پہنچا دیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ امین تابش نے جہاں وارداتِ دل اور جذباتِ محبت کے شگفتہ پھولوں سے ایوانِ شاعری کو مشکبار کیا ہے وہیں عصری تقاضوں اور جدید رجحانات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہما ہمی اور گہما گہمی کے اس دور میں وہ غزل کو صرف غزل کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں اور شکست و ریخت کے قائل نہیں۔ پھر بھی ماحول کے زیرِ اثر ایسے اشعار بھی کہہ جاتے ہیں جن میں عصری گونج صاف سنائی دیتی ہے ؎

فکر و خیال کی نئی راہیں نکال لیں
غزلوں کے رنگ و روپ کو لیکن سنبھال لیں

آب و ہوا عجیب ہے شہرِ وجود کی
ہم برف ہیں نہ موم پگھلتے ہیں آنچ بھی

قامت میں ہے بلند بہت ناریل کا پیڑ
آرام پا سکا ہے کوئی اس کی چھاؤں میں

ہم اندھیروں کے مسافر ہیں ہمارا کیا ہے
تم اُجالوں میں رہو دیپ جلانے والو

گویہ زمیں ہے جنتِ کشمیر کی طرح
ہم غمزدہ ہیں میر تقی میر کی طرح

نقطوں سے نقطے اور لکیریں ہیں دور دور
اندازہ کیجے بکھری ہوئی زندگی کا آج

میرے بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیئے
سامنے والی عمارت دیکھئے

یہ بھی کہتے ہیں کہ

آئے دن نت نئے الفاظ تراشوں تابش
ان گنت تجربے ترسیل کے اُردو میں رکھوں

نقطے اور لکیریں ترسیل وابلاغ کے انہیں تجربوں سے بھرپور ہے۔

امین تابش کے بلند پایہ خیالات اور عمیق جذبات بعض غزلوں میں اس طرح نمایاں ہوئے ہیں کہ پڑھئے اور سر دُھنئے ۔

جدید نقادوں کا خیال ہے کہ شاعری میں لطف اندوزی کا عمل روایتی اور رجعت پسندانہ ہے اس سے قوائے عمل مضمحل ہوتے ہیں ۔ اس لئے قابلِ ترک ہے ۔ شعری لفظیات میں ان لفظوں کو بھی جگہ دینی چاہیئے جو پہلے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ ایسے الفاظ اب عام ہیں اور بے تحاشہ انہیں استعمال کیا جا رہا ہے ۔ چاہے الفاظ میں کوئی خوبی پیدا ہو یا نہ ہو فنکار شاعری کئے جا رہے ہیں اور دیمکوں کے لئے ایک وافر ذخیرہ فراہم کر رہے ہیں ۔ ظاہر ہے اس قسم کے نقاد تنقید و تبصرہ کی نیت سے اس کے برعکس کسی کتاب کو دیکھیں گے تو انہیں مایوسی ہوگی اور ایک شعر بھی قابلِ اعتنا نہ ہوگا ۔ گویا جو کچھ کہا گیا ہے " موسم بُرد " کرنے کے لائق ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ نقطے اور لکیریں جہاں پچھلے دور کی یاد دلاتی ہے وہیں عصرِ حاضر کی جھلکیاں بھی پیش کرتی ہے ۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ۔ ۔

امین تابش نے عصری رجحانات کو فراموش نہیں کیا انہی ... کے مطابق اسے سمیٹنے اور پھیلانے کی کوشش کی ہے گو لہجہ میں براقی نہیں دھیا پن ہے جیسے بادِ صبا سبک روی سے چل رہی ہے اور کلیوں کو خوابِ خوشبو سے بیدار کر رہی ہے ثبوت میں کئی اشعار پیش کر چکا ہوں اس کے بعد بھی اگر کوئی قابلِ اعتنا نہ سمجھے اور صاحبِ کتاب کو مطعون کرے تو اس کی ذہانت پر ماتم کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے ۔ ہاں یہ توقع بے محل نہیں کہ امین تابش کتاب حیات کی دلکشی میں اضافے کے لئے جب اور کچھ پیش کریں گے تو اسرارِ محبت کے ساتھ ساتھ ان مسائل کو بھی گھن گرج کے ساتھ موضوعِ سخن بنائیں گے جن کے بغیر ادبی قدروں کا تعین دشوار ہے ۔

کتاب کا آغاز نعت پاک سے کیا گیا ہے اور صاحبِ کتاب نے اس سے پہلے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کی بجائے اگر کسی کا محاکمہ ہوتا تو بہتر تھا ۔ انتخاب کے باوجود کچھ اشعار نظرِ ثانی کے محتاج ہیں ۔ یقین ہے نقطے اور لکیریں مالیگاؤں کی ادبی رفتار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی ۔ کتابت و طباعت کے علاوہ اس کتاب کا گرد پوش نہایت خوبصورت ہے ۔ قیمت بھی واجبی اور مناسب ہے ۔ ۔ ۔

حفیظ مالیگانوی

ایک ضروری اعلان

ہم زبان کیلئے عصری ادبی مسائل پر مضامین بھیجئے ۔ تعارف ، انٹرویو ، سوانحی خاکے اور شخصی مطالعے شائع نہ ہو سکیں گے ۔ ۔ ۔ ادارہ

ارتکاز

• سہیل عظیم آبادی ـــــــــــــــــ پٹنہ

ہم زبان کا تازہ شمارہ ملا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ صحت مند ادبی رجحانات کو تقویت پہنچا رہے ہیں اور اصطلاحات میں باتیں نہیں کرتے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں، اس کی ضرورت ہے۔ اصطلاحوں میں باتیں کرنے والوں نے ادب کو پہیلی بنانے کی کوشش کی ہے۔

ستمبر کے مہینے میں پروسٹیٹ کا آپریشن ہوا تھا۔ اچھا ہوں۔ ۱۴ فروری کو موتیا بند کا آپریشن ہوا۔ شکر ہے آپریشن کامیاب ہوا ـــــ

• رشید امجد ـــــــــــــــــ پاکستان

ہم زبان کا چھٹا شمارہ مل گیا ہے آپ بڑی محنت سے پرچہ نکالتے ہیں۔ نئے اظہار کے ساتھ نظریاتی تسلسل کا خیال بڑی اہم بات ہے۔ آج کے دور میں سامراجی تشدد نت نئے طریقے اپنا چکا ہے اور مختلف ملکوں میں اس کا کھیل جاری ہے۔ ان دنوں ہم بھی اسی کے شکنجے میں ہیں۔ اپنا بویا کاٹنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

• غالب عرفان ـــــــــــــــــ حیدرآباد

"ہم زبان کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اور اس پرچے کی پرواز حسب دستور سنجیدہ ادب کی نئی افق کو چھوتی نظر آتی ہے۔ یہ آج کی بیش بہا خدمت ہے۔

ہمارے ادب میں ابہام کو علامت نگاری اور ادب کی ارتقائی منزل سمجھنے اور سمجھانے والوں پر جن دلائل کے ساتھ آپ نے "اختلاف" فرمایا ہے اس سے میں تو کیا کوئی بھی حساس اہلِ قلم انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ـــــ

"ادب صرف کتابوں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے عوام کے درمیان آنا ہی پڑے گا۔ جہاں باشعور قارئین صف بہ صف ملیں گے۔"

اس شمارے میں بہت ساری اچھی نظمیں دیکھنے کو ملیں جو آپ کے حسنِ انتخاب کا ثبوت تھیں۔ پروین شاکر کی مختصر سی نظم "ننگ" کے حسین لب و لہجے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم "بکریاں وسعتوں میں" ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ خدا کرے ان کا قلمی تعاون آپ کو ہمیشہ حاصل رہے۔ اسی طرح محسن بھوپالی اور جرأت الاکرام کی نظمیں جن کا طرزِ تخاطب ادبی تشنہ لبی کی پیاس بجھاتا ہے، سچی سنوری ہیں۔

عالم تاب تشنہ (پاکستان) کی "ٹرانسپیرنٹ" زبان و بیان اور فن کے

لحاظ سے چونکا دینے والی ضرور تھی لیکن نہ معلوم کیوں مجھے اس نظم کو پڑھتے ہی مرحوم شکیب جلالی کا ایک شعر یاد آ گیا جو انہوں نے آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے کہا تھا۔ ؎

آ کر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تحریر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ شکیب جلالی مرحوم پاکستان کے ایک اُبھرتے ہوئے شاعر تھے جن کی جوان مرگی (خودکشی) کا غم اُردو ادب آج تک فراموش نہیں کر سکا ہے۔ مرحوم کا آبائی وطن میرٹھ تھا اور وہ ہجرت کر کے لائل پور (پاکستان) میں بس گئے تھے۔

غور کیجیے "ٹرانسپیرنٹ" ان کے مذکورہ بالا شعر کی مکمل تفسیر نظر آتی ہے — :

کہانیوں میں شبیر ہاشمی کی "بازیافت" اُبھرتے سماج کے بکھرتے انسان کی کہانی ہے اور بڑے ہی لطیف انداز میں ہمیں مادیت سے روحانیت کی طرف لوٹ جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

مضامین میں "اقبال اور کلیم الدین احمد" مختصر لیکن موثر تھا، حسین الحق صاحب نے مضمون کے ابتدا میں جس طرح حاشیہ آرائی کی ہے اس سے بہرحال اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ الگ بحث ہے۔ کلیم الدین احمد کی تنقید پر تنقید یقیناً قابلِ ستائش ہے خصوصاً ان کا یہ کہنا —

"مجھے یہ کہنے دیجیے کہ یہ تحت تحریر مجھے بار بار اس کا احساس دلاتا ہے کہ شاید کلیم کا دل اقبال کی شعری عظمت کو تسلیم کرتا ہے :
...... زیرِ حوالہ تنقید کے کئی پوسٹ مارٹم کا آخری نشتر ہے۔

"انشراح" کے تحت جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے بہت ہی خوب ہے اسے جاری رکھیے — سال بہ سال نہیں بلکہ شمارہ بہ شمارہ اگر ہو سکے تو۔

"ارتکاز" میں جناب اسلم شیخ (ملتان، پاکستان) نے پاکستان کے ادبی رسائل کی لوٹ کھسوٹ کی جو درد فرسا حقیقت سنائی ہے وہ ہم ہندوستانیوں کے لیے چونکا دینے والی ہے۔ کاش! وہاں کے اربابِ اقتدار ہی وہاں کی قومی زبان پر پڑی اس افتاد کا علاج کریں۔

کتابوں اور جریدوں پر تبصرے بہت پسند آئے لیکن سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ اس شمارے میں کتابت کی غلطیاں نہیں کے برابر تھیں۔

سب سے آخر میں ایک جملہ سرورق کے بارے میں، جو مجھے ابتدا ہی میں کہنا چاہیے تھا، وہ یہ ہے کہ منتخب مخصوص رنگوں کے امتزاج پر مبنی آپ کی خوش کاری مجھے سرورق کی صورت میں آپ کی فکر اور آپ کا کہا ہوا ایک مکمل شعر نظر آ رہا ہے — ..

● زین رامش —————— سہسرام

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ (نومبر دسمبر ۷۸ء، جنوری ۷۹ء) پیشِ نظر ہے۔ دیدہ زیب گیٹ اپ بہترین کتابت و طباعت سے مزین یہ شمارہ اپنے روشن مستقبل کی غمازی کرتا ہے۔ اور آپ کی صحافتی پختگی کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ جسے دیکھ کر بیساختہ "نشانات" (مرحوم) کی یاد آجاتی ہے۔

آپ کا اداریہ "تبصرہ" اور سید محمد عقیل کا مضمون مخصوص نقطہ نظر کی مبالغہ آمیز اور پرجوش حمایت کا نمونہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ ۶۰ء کے بعد سامنے آنے والے اہم فنکاروں مثلاً صلاح الدین پرویز، حسین الحق، شوکت حیات، شفق، علی امام، عتیق اللہ، شمیم انور، انیس الرحمٰن، سلام بن رزاق، قمر احسن، رضوان احمد، الزرخان، سلطان سبحانی اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ کے یہاں جو موضوعاتی اور اسلوبی تبدیلیاں آئی ہیں وہ کس حد تک عصری مزاج سے میل کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ان فنکاروں کے یہاں ماضی کی بازیافت کا عمل مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔

حسین الحق کا مضمون اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال کی مریدی کا انداز نہیں ملتا۔ اور یہ آواز تو شاید اُردو میں پہلی مرتبہ حسین الحق نے اُٹھائی ہے کہ اقبال "اسلامی شاعر نہیں بلکہ مسلمانوں کا شاعر تھا۔ اِدھر حسین الحق کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ ان کی تخلیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔

حیرت ہے کہ ترقی پسندی کی اتنی پر شور تبلیغ کے باوجود عبدالصمد کا ایسا مبہم افسانہ کیسے شائع کر دیا گیا۔ شاید صرف اس لئے کہ سید محمد عقیل اور انصح ظفر جیسے غالی ترقی پسند موصوف کو بھی اپنے گروپ کا سمجھتے ہیں باقی افسانے گوارہ ہیں۔

شاکر

حزیں لدھیانوی، عتیق احمد عتیق، کی غزلوں اور پردیپ کی نظم "ننگ" نے متاثر کیا۔ ماہنامہ "اب" اور "کوہسار" پر جو تبصرہ آپ نے کیا ہے وہ آپ کی ایک نیا ترقی پسند گروپ بنانے کی خواہش کا آئینہ دار ہے۔ مگر آپ کی اطلاع کے لئے "اب" والوں کے خیال میں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں مردہ گھوڑے ہیں۔ تو پھر یہ تالیف آپ کے لئے ممکن ہوگی۔ یا تو آپ اپنے موقف سے ہٹ رہے ہیں یا "اب" کے مدیران گرامی۔ ع

ع رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

● ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں مُردہ گھوڑے کہہ کر خود اپنے دل آزاری مت کیجئے۔ ویسے ...... آپ کا دور بھی جلد ہی آئے گا ــــ (ایڈیٹر)

● ایم کے اختر ــــــــــ کلکتہ

"ہم زبان" کا تازہ شمارہ (نومبر، جنوری ۷۹ء) دیکھا۔ پرچہ ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ پسند آنے کی وجہ صرف انڈو پاک کے مشہور شعراء و ادباء کی گراں قدر تخلیقات ہی نہیں بلکہ پرچے کا سرورق بھی متاثر کرتا ہے۔ جو ہندوستان کے بہت کم رسالوں کے سرورق میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ پچھلے تمام شماروں کی طرح اس بار بھی آپ نے اداریہ میں جس حقیقت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس میں آپ سو فیصد کامیاب ہیں اگر میں یہ کہہ دوں کہ آپ کا اداریہ حقیقی معنوں میں سچائی کا نقیب ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نظموں میں وزیر آغا، حرمت الاکرام، ظہیر غازی پوری، ماہر منصور، شفیع جمال اور اکبر مرزا متاثر کرتے ہیں۔ حزیں لدھیانوی صاحب کی بھی غزل بہت خوب ہے۔ افسانوں میں رشید امجد، شبنم مرزا، کے علاوہ مناظر عاشق ہرگانوی کا ترجمہ منگل بہت پسند آیا ــــ ..

● رضا احمد ادیب ــــــــ جمشید پور

"ہم زبان" کا ساتواں شمارہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اس کے معیار میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تو "ہم زبان" کا ہر شمارہ اپنے اندر ایک جدت، تنوع، اور نیا پن لیکر آتا ہے۔ آپ کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ اس نازک ترین دور میں جبکہ اُردو کو دیس نکالا جا رہا ہے "ہم زبان" کا جاری رہنا ایک "معجزہ" ہے۔

زیر نظر شمارہ میں حزیں لدھیانوی، عتیق احمد عتیق، صاحبان کی غزلوں نے کافی متاثر کیا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کا "مارکسی ادب اور ادیب" ایک پر مغز اور معلوماتی مضمون ہے۔ جس کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔ شبنم مرزا صاحبہ کا "پلیٹ فارم" اچھا افسانہ ہے۔ نظموں کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے۔ انتخاب میں سختی کی ضرورت ہے ــــ ..

اِنشراح

نئی دہلی :۔ ۲۱ فروری سنہ ۷۹ء ۔ اردو کے مشہور نقاد محقق اور مورخ ڈاکٹر یوسف خان ۷۷ سال کی عمر میں جدا ہو گئے ۔

وہ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے اس سال ان کی اہم کتاب "حافظ اور اقبال" پر انہیں ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ملا تھا ۔ وہ غالبیات اور اقبالیات کے زبردست ماہر تھے ۔ ساتھ ہی انگریزی و فرانسیسی ادب پر بھی انہیں بڑی مہارت تھی ، روحِ اقبال ، فرانسیسی ادب ، اردو غزل ، یادوں کی دنیا ، کاروانِ فکر ، غالب اور آہنگِ غالب ، اور حافظ اور اقبال ان کی مشہور تصانیف ہیں ۔

جمشید پور :۔ ۱۶ اپریل سنہ ۷۹ء ۔ جلتے سلگتے اور خون میں نہلتے ہوئے جمشید پور میں عام انسانوں کے ساتھ ایک ایسا انسان بھی مارا گیا جو بڑے خلوص و محبت کے ساتھ سیکولر ہندوستان کا خواب دیکھ رہا تھا ، جس کی آنکھوں میں ہندو مسلم اتحاد کا وہ ستارہ جگمگا رہا تھا جو ہر امن پسند ہندوستانی کا ایمان ہے لیکن اس شخص کو فسادیوں نے نہایت اذیت دے کر قتل کر ڈالا ۔

فرقہ پرست جماعتوں کے مکروہ چہروں پر ایک بار پھر نکھار آ گیا ہے ۔ ہندو مسلم اتحاد کی علامت مٹا دی گئی لیکن مرنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا وہ ہندوستان کی سب سے محبت بھری زبان کا بہترین افسانہ نگار تھا جسے اردو دنیا "ذکی انور" کے نام سے جانتی ہے ۔

● ہم زبان ذکی انور کے قتل پر نہایت پرجوش احتجاج کرتا ہے کہ ہندوستان کے ادیبو ! مرحوم ذکی انور کے خواب کو آگے بڑھ کر سنبھال لو ۔ اس ستارے کی حفاظت کرو اور فرقہ پرستی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو تاکہ آئندہ کوئی ذکی انور شہید نہ ہو ۔

اشتہار

یہ وہ صفحہ ہے جسے لکھتے وقت مدیر تمام موضوعات سے غافل اور ہر طرح کے خسارے سے بالاتر ہو جاتا ہے اور یہی تو وہ صفحہ ہے جسے پڑھنے کے بعد بہت سارے ہمدرد اسے اپنے اشتہار بند کر دیتے ہیں۔

اس شمارے کے ساتھ "ہم زباں" نے اپنی زندگی کے دو تاخیر زدہ سال گذار دیئے یعنی اب حاتم طائی اپنے تیسرے سفر پر روانہ ہوگا۔ یہ دونوں سال کچھ اتنے "صاحبِ فراموش" ثابت ہوئے کہ ہم زباں کو اپنی جیب رفو کرنے کے لئے "جشنِ خساراں" بھی منانا پڑا۔ جیب تو خیر رفو نہیں ہو سکی آستین ضرور باوضو ہوگئی۔ مزہ آگیا۔

یہ شمارہ اتنی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے کہ لگتا ہے ہم زباں مدرسہ کی روداد کی طرح بغیر کسی ڈکلریشن کے شائع ہو رہا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے اس شاندار اور روایت شکن تاخیر کے اسباب جاننے کے لئے روزانہ جو خطوط آرہے ہیں انہیں پڑھ پڑھ کر منہ میں پانی آرہا ہے کہ ــــ "وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ" اکثر تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ تاخیر کا یہ عالم ہے کہ سینکڑوں خریدار ناراض ہو گئے ہیں۔ شاید وہ نئے سال کی تجدید نہ کریں۔ بہت سی ایجنسیوں نے کاپیاں بند کر دی ہیں۔ ظاہر ہے چند پیسوں والا صرف ایک دن پرانا اخبار جب کوئی خریدتا نہیں ہے تو کئی ماہ پرانا گراں قیمت کا رسالہ کون خریدے گا۔ مدیر نے اور ہم زباں کے دیگر ہمدردوں نے اس تاخیر پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" میاں ہم زباں ابتدا ہی سے تاخیر کا شکار رہا ہے۔ اور تاخیر کا باعث صرف اور صرف کتابت ہے۔ کتابت اُردو کا سب سے بدترین اور لاعلاج مرض ہے اس کی دوا نہ تو لقمان حکیم کے پاس تھی نہ سلطان حکیم کے پاس۔ کاش کبھی اُردو ٹائپ حلال میں آئے چاہے کیسے بھی حال میں آئے۔

ویسے ایک بار پھر وعدہ کیا جا رہا ہے کہ ہم زباں پابندی وقت تک پہونچنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اُردو کا سب سے باغی اور سرکش رسالہ ہے لہٰذا ہر مشکل سے لڑے گا۔

"ہم زباں کے لئے عصری ادبی مسائل پر مضامین بھیجیے" یہ چوکھٹا پڑھ کر بہت سے ادیب اپنا التعارف، انٹرویو یا اپنی شاعری کا مطالعہ لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس سے اب شک سا ہونے لگا ہے کہ شاید چوکھٹا ہی غلط چھپ رہا ہے۔ اس شمارے پر اپنی رائے ضرور بھیجیے۔

(مدیر)